حیدر قریشی
ڈاکٹر نذر خلیق

JADEED ADAB Literary Urdu Journal (July to December 2010)
Haider Qureshi Rossertstr.6, Okriftel, 65795-Hattersheim, Germany.

ایوب خاور
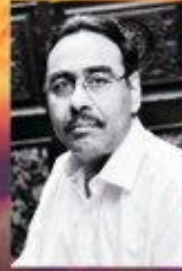
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Gali Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23216162,23214465 Fax : 0091-11-23211540
E-mail :info@ephbooks.com, ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

بقول ڈاکٹر وزیر آغا: حیدر قریشی کی زندہ رہنے والی کتاب

گیارہ کتابوں کی کتاب **عمر لاحاصل کا حاصل** شائع ہوگئی

حیدر قریشی کی کتاب **عمر لاحاصل کا حاصل** کا لائبریری ایڈیشن شائع ہوگیا ہے۔میگزین سائز کی یہ ضخیم کتاب ۶۱۹ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں تخلیقی کام پر مشتمل حیدر قریشی کی یہ گیارہ کتابیں یکجا کی گئی ہیں۔۱۔**سلگتے خواب** (غزلیں)۲۔**عمر گریزاں** (غزلیں،نظمیں اور ماہیے)۳۔**محبت کے پھول** (ماہیے)۴۔**دعائے دل** (غزلیں اور ماہیے) ۵۔**درد سمندر** (غزلیں،نظمیں اور ماہیے) اور ان مجموعوں کے بعد کی شاعری۔۶۔**روشنی کی بشارت** (افسانے)۷۔**قصے کہانیاں** (افسانے) ۸۔**میری محبتیں** (خاکے)۹۔**کھٹی میٹھی یادیں** (یادیں)۔۱۰۔**فاصلے قربتیں** (انشائیے) ۱۱۔**سوئے حجاز** (سفرنامہ)اوران مجموعوں کے بعد کی تخلیقات۔ان مختلف شعری ونثری کتابوں میں ایسا ربط باہم ہے کہ گیارہ کتابیں ایک کتاب لگتی ہیں۔کتاب کے آخر میں ۲ صفحات پر حیدر قریشی کی اب تک کی جملہ تصنیفات (صرف تصنیفات) کی طویل فہرست کتابوں کے سال اشاعت اور پبلشر کے ادارہ کے نام کے ساتھ درج کی گئی ہے۔اور ایک صفحہ پر پاکستان سے ڈاکٹر وزیر آغا،جرمنی سے ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ،انڈیا سے دیوندر اسر،روس سے ڈاکٹر لڈمیلا،انگلینڈ سے ڈاکٹر ڈیرک لعل ووڈ،مصر سے ہانی السعید اور امریکہ سے کساندرا راؤزن کے اردو یا انگریزی میں تاثرات کو شامل کیا گیا ہے۔ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے"حیدر قریشی نے اپنی اس زندہ رہنے والی کتاب کو"عمر لاحاصل کا حاصل" کہا ہے۔غور کیجئے کہ اس عنوان میں لاحاصل سے حاصل تک کا سفر ایک ایسی اوڈیسی ہے جو کم کم دیکھنے میں آئی ہے۔" ڈاکٹر کرسٹینا لکھتی ہیں کہ" حیدر قریشی کی شاعری میں بے ساختہ پن اور روانی ہے"۔دیوندر اسر کے بقول" حیدر قریشی کی کہانیاں ایک نئی تخلیقی روایت کی ابتدا ہیں۔"ڈاکٹر لڈمیلا حیدر قریشی کی مجموعی ادبی صلاحیت کو معجزہ قرار دیتے ہوئے اس پر حیرت کا اظہار کررہی ہیں تو ڈاکٹر ڈیرک لعل ووڈ حیدر قریشی کو فلاسفیکل کہانی کار قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

Haider Qureshi'splendid collection of short stories extends the range of contemporary Urdu writing available in English translation

ہانی السعید نے حیدر قریشی کو جدید اردو ادب کا ایک بڑا شہسوار قرار دیا ہے تو کساندرا راؤزن نے حیدر قریشی کے بارے میں لکھا ہے کہ

Haider Qureshi is a breath of fresh air for our time

کتاب کا سرورق مصطفی کمال پاشا (دہلی) نے بنایا ہے جبکہ منفرد نوعیت کا بیک ٹائٹل خورشید اقبال (۲۴ پرگنہ،مغربی بنگال) کا بنایا ہوا ہے۔ **عمر لاحاصل کا حاصل** کو دہلی کے معروف وممتاز اشاعتی ادارہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔اس کے حصول کے لیے براہ راست پبلشر سے یا پھر حیدر قریشی سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔دونوں کے ای میل ID یہ ہیں: **پبلشر**: ephdelhi@yahoo.com

مصنف: haider_qureshi2000@yahoo.com **اور** hqg786@arcor.de

ارشد خالد (اسلام آباد) کی جانب سے انٹرنیٹ پر یہ خبر urdu_writers@yahoogroups.com سے 11.05.2009 کو ریلیز کی گئی۔جہاں سے اردو کی کئی ویب سائٹس نے اسے شائع کیا۔

اردوستان:انٹرنیٹ کی دنیا کا ایک اہم نام۔اردو کی سب سے پرانی ویب سائٹ جو اردو سے محبت کرنے والوں کے لئے ایک مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔اردوستان نیٹ ورک کی بنیادی اور اہم ترین ویب سائٹ۔

کاشف الھدیٰ کی نفع و نقصان سے بے نیاز رہ کر اردو کی خدمت کی لگن

www.urdustan.com

حیدر قریشی کا کالم **منظر اور پس منظر** اور کالم **خبر نامہ** بھی ان لنکس پر موجود ہیں۔

http://www.urdustan.com/manzar/

http://urdustan.com/khabarnama/

کتاب گھر: مفت اردو کتب (E-Books) فراہم کرنے والی ایک اہم ویب سائٹ،جس میں مختلف موضوعات پر ۱۰۰ سے زائد کتب مطالعہ کے لئے آن لائن دیکھی جا سکتی ہیں یا ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہیں۔

www.kitaabghar.com

اردو دوست ڈاٹ کام: **خورشید اقبال** کی خوبصورت ویب سائٹ

www.urdudost.com

سہ ماہی ادبی رسالہ **کائنات** ادبی خبر نامہ **اردو ورلڈ**،ادیبوں کی تصاویر پر مشتمل **ادبی البم**، ای بکس کا سلسلہ **اردو دوست لائبریری** اور دلچسپی کے متعدد دوسرے سلسلوں سے مزین ویب سائٹ۔

اردو ماہیا

http://www.urdudost.com/archive/old-mahya.html

حیدر قریشی کی تخلیقات کی ویب سائٹ اور تراجم کے لنکس

www.haiderqureshi.com

---

http://haiderqureshi.spaces.live.com/

حیدر قریشی کی شاعری کے تراجم کے مطالعہ کے لئے اس لنک کو کلک کریں:

http://haiderqureshi.blogspot.com/

حیدر قریشی کے افسانوں کے انگریزی تراجم کے مطالعہ کے لئے اس لنک کو کلک کریں:

http://haiderqureshisstories.blogspot.com/

سروَر ادبی اکادمی جرمنی کے زیرِ اہتمام

بیک وقت کتابی صورت میں اور انٹرنیٹ پر دستیاب ہونے والا اردو کا ادبی جریدہ

کتابی سلسلہ

جدید ادب

www.jadeedadab.com

شمارہ: 15 (جولائی تادسمبر 2010ء)

مشیرِ خاص: ڈاکٹر شفیق احمد (بہاول پور)

مدیر: حیدر قریشی

مدیر (اعزازی): ڈاکٹر نذر خلیق

رابطہ کرنے کے لئے اور تخلیقات بھیجنے کے لئے

Haider Qureshi
Rossertstr.6 , Okriftel,
65795-Hattersheim, Germany.

جن احباب کے پاس ای میل کی سہولت ہے وہ ان پیج فائل میں اپنا میٹر ان ای میل ایڈریسز پر بھجوائیں۔شکریہ!

hqg786@arcor.de

haider_qureshi2000@yahoo.com

سرورق: مصطفیٰ کمال پاشا

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108,VAKIL STREET,KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6,(INDIA)
PH:23215162, 23214465, FAX: 0091-11-23211540
E-MAIL: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

Jadeed Adab ist kostenlos,man muss nur die Versndkosten Übernehmen.

فہرست

افسانے

نظمیں

خصوصی مطالعہ

ایک گوشہ ایوب خاور کے لیے

ماہیے

تفصیلی مطالعہ

گفتگو!

میری اپنی تخلیقی و دوسری ادبی مصروفیات،علالت کے باعث کچھ کچھ متاثر ہونے لگی ہیں۔میں نے اپنے بعض پراجیکٹس کو بہتر طور پر مکمل کر لیا ہے تو بعض پراجیکٹس تکمیل کے لیے ابھی تک توجہ چاہتے ہیں۔مجھے ہمیشہ ایسے دوستوں کی ضرورت رہی ہے جو ادبی کاموں میں نہ صرف خود متحرک رہیں بلکہ مجھے بھی متحرک رکھ سکیں۔لیکن ہوتا عموماً یہ ہے کہ دلی طور پر مخلص ہوتے ہوئے بھی سستی کے مارے دوست خود پر بے نیازی سی طاری کر کے اپنی طرح مجھے بھی سست کرنے لگتے ہیں۔میں اپنے ایسے تمام دوستوں کو آواز دیتا ہوں جو ادبی کاموں میں سستی کی زائیدہ بے نیازی کی بجائے پوری توجہ والی متحرک ادبی زندگی جی رہے ہیں اور جو میرے ساتھ چل کر مجھے مزید متحرک رکھ سکیں۔

اب پاکستان اور ہندوستان سے ڈاک خرچ ایک جیسا ہوش ربا ہو گیا ہے۔جتنی لاگت کسی بھی اشاعتی منصوبہ پر آتی ہے،اس سے زیادہ اس کی ترسیل پر خرچ ہو جاتا ہے۔اس معاملہ میں دوست احباب کا تعاون ہمیشہ جیسا ہی ہے۔دو چار دوست جو تعاون کر دیتے ہیں سو کر دیتے ہیں،باقی اتنا دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہے کہ انہیں جو کتاب یا رسالہ مل رہا ہے اس پر کتنی مالیت کے ڈاک ٹکٹ لگے ہوئے ہیں۔اس شمارہ کے بعد ان تمام احباب کی ٹھوس اور عملی تجاویز کا منتظر رہوں گا جو رسالہ کی اشاعت میں دلچسپی رکھتے ہیں۔جن کی طرف سے کوئی دلچسپی نہ لی گئی،معذرت کے ساتھ ان سب کو رسالہ کا یہ آخری تحفہ ہوگا۔(اتنے لکھے کو کافی سمجھا جائے)۔کسی نے بھی دلچسپی نہ لی تو اسی کو آخری شمارہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔اس کے لیے کسی پر الزام نہ ہوگا،بس یہ ڈاک خرچ کی زیادتی کا نتیجہ ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ شمارہ ۱۴ کی اشاعت کے بعد صورت حال ایسی ہو گئی تھی کہ میں نے جولائی تا دسمبر ۲۰۱۰ء (شمارہ ۱۵) کی اشاعت موخر کر کے اسے جنوری تا جون ۲۰۱۱ء کے ساتھ ملا کر شائع کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اللہ بھلا کرے کینیڈا اور انگلینڈ کے تین دوستوں کا جنہوں نے کچھ ہمت بندھائی اور مصطفیٰ کمال پاشا صاحب کا کہ جنہوں نے مزید ہمت بندھائی اور نہ چھاپتے چھاپتے بھی جدید ادب کا شمارہ ۱۵ اب چھپنے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔

میں نے شروع میں جن متحرک دوستوں کے ساتھ کی خواہش ظاہر کی ہے،اس حوالے سے یہ واضح کرنا چاہوں گا کہ اگر چہ وسائل کی دستیابی اپنی جگہ ایک اہم مسئلہ ہے،لیکن میرا عمر بھر کا تجربہ ہے کہ اگر تھوڑا سا ٹیم ورک ہو جائے اور جینوئن ادبی لوگ متحرک ہو کر حوصلہ افزائی کریں،مختلف امور میں ساتھ دیں تو نہ صرف ادبی منصوبے مکمل کرنے کی توفیق ملتی ہے بلکہ وسائل کی فراہمی کی بھی کوئی نہ کوئی صورت نکلتی چلی آتی ہے۔سو اب دیکھتے ہیں کہ **جدید ادب** کے معاملہ میں کتنے دوست کس حد تک سنجیدہ ہیں۔

حیدر قریشی

حمد

غلام مرتضیٰ راہی (فتح پور، یو پی)

ہر سمت کھلی ہے راہ تیری
لے جائے جدھر بھی چاہ تیری

دیکھا نہ گیا کسی جگہ تو
آنکھیں ہیں مگر گواہ تیری

چمکا کیا آفتاب بن کر
ذرے پہ رہی نگاہ تیری

ہر رُخ سے کھڑے ہیں رُوبرا ہم
آئینہ ہے بارگاہ تیری

تعبیر اگر ہے روز روشن
تو خواب شبِ سیاہ تیری

آیا ہوں گزر کے جسم و جاں سے
مل جائے مجھے پناہ تیری

اللہ بول

حفیظ انجم (کریم نگر)

خود کو تو اندر سے ٹٹول، اللہ بول
ظاہر باطن میں ہے جھول، اللہ بول
کانوں میں تو مصری گھول،اللہ بول
میں ڈولوں اور تو بھی ڈول،اللہ بول
من کی اپنی کھڑکی کھول ،اللہ بول
جب منہ کھولے شبھ شبھ بول ،اللہ بول
کب تک آخر ڈانوا ڈول،اللہ بول
کب تک تیرا ٹالم ٹول، ،اللہ بول
کیسی دنیا کیسا خول،اللہ بول
باتیں کرنا سیکھ اَن مول،اللہ بول
اور بھی بگڑے گا ماحول ،اللہ بول
پہلے بھیج اس پر لاحول ،اللہ بول
ہاتھ میں لے کر تو کشکول ،اللہ بول
پیٹ تو رب کے نام کا ڈھول ،اللہ بول
مفت ہوا بھی،پانی بھی وہ دیتا ہے
کیا دے گا تو ان کا مول ،اللہ بول
بستر باندھ کے رکھ لے انجم اچھا ہے
کس کو پتہ کب ہوگا گول ،اللہ بول

نعتیہ کلام

ارشد کمال (دہلی)

زیست کی اک منفرد تفسیر ہے ان کا پیام
شب کے در پر صبح کی تحریر ہے ان کا پیام

جاگتی آنکھوں میں بس کر جو جواں ہوتے گئے
ایسے ہی خوابوں کی اک تعبیر ہے ان کا پیام

ظلمتِ شب کی سیاست سے سراسر بے نیاز
روشنی کی سربسر تدبیر ہے ان کا پیام

ان کے ذہن و دل کے روزن ایک عالم کو محیط
اک جہانِ تازہ کی تعمیر ہے ان کا پیام

خیمۂ بادِ خزاں میں کیوں نہ ہو کہرام، جب
رنگ و بو کی اک حسیں تصویر ہے ان کا پیام

پڑھ سکو تو غور سے پڑھ لو ذرا بین السطور
وقت کے احساس کی تحریر ہے ان کا پیام

☆☆☆

سلام

تبسم وڑائچ (سرگودھا)

ہے پیاس میری سمندر سے بھی سوا لوگو
بسی ہوئی ہے مرے دل میں کربلا لوگو

کبھی جو دریا کنارے جلے تھے کچھ خیمے
اٹھائے پھرتی ہے ان کی تپش ہوا لوگو

بریدہ بازوؤں والے کی حسرتوں کا علَم
ہے ساحلوں پہ ابھی تک کھلا ہوا لوگو

ہجومِ شہر نا پرساں میں جو چھنی سر سے
تھی بنت سیدہؑ کونین کی ردا لوگو

بدن ہے ٹاپوں سے پامال، سر ہے نیزوں پر
سوال اجر رسالت پہ کیا کیا لوگو

حسن جعفر زیدی (لاہور)

نظریۂ پاکستان
ایک تاریخی مغالطہ اور موجودہ بحران

(یہ مضمون حلقہ ارباب ذوق لاہور میں 16 اگست 2009 کو ،اور ہالیڈے ان، رسل سکوئر، لندن میں پروگریسو فورم لندن کے اجلاس میں 25 اکتوبر 2009 کو پیش کیا گیا۔)

آج پاکستان میں مذہبی دہشت گردوں اور طالبان نے قتل و غارت گری کا جو بازار گرم کر رکھا ہے اس کی جڑ میں جن نعروں اور نظریوں کا بیج بویا گیا اور جن کی آبیاری گزشتہ ساٹھ سال کے دوران کی گئی وہ کچھ یوں ہیں
نظریہ پاکستان‘ نظریاتی سرحدیں‘ نظریاتی ریاست، اسلامی ریاست، اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات‘ اسلامی نظام، نفاذ شریعت یا نفاذ اسلام‘ حکومت الہیہ کا قیام، اسلامی نظام کی تجربہ گاہ‘ احیائے اسلام‘ اسلامی اُمہ وغیرہ۔
ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو ان اصطلاحوں کا استعمال قیام پاکستان سے پہلے کہیں نظر نہیں آتا بلکہ اس کے کچھ عرصہ بعد شروع کیا گیا۔ دراصل یہ وہ دور تھا جب بین الاقوامی سامراج (اینگلو امریکی سامراج) اور مقامی حکمران طبقوں کو ان نعروں اور نظریوں کی شدید ضرورت پڑ گئی تھی۔ بین الاقوامی سامراج کو اس لئے کہ:
سوویت روس اور ابھرتی ہوئی چین کی کمیونسٹ قوت کے گرد حصار قائم کرنے کے لئے سامراج فیصلہ کر چکا تھا کہ مذہب کو بطور نظریاتی ہتھیار کے ستعمال کرے گا۔
مقامی حکمران طبقوں کو اس لئے کہ:
۔عوام اپنے معاشی، جمہوری حقوق کا مطالبہ کریں تو اسے نظریہ کے نام پر رد کیا جا سکے
۔بنگال کے عوام اپنے حقوق مانگیں، پٹ سن کی آمدنی کو بنگال پر خرچ کرنے کی بات کریں، ملازمتوں میں اپنا حصہ مانگیں، فوج میں بھرتی ہونے کی بات کریں، بنگالی کو قومی زبان بنانے کا نعرہ لگائیں، اور آئین میں آبادی کی بنیاد پر ایک فرد ایک ووٹ کا مطالبہ کریں، تو کہا جائے کہ نظریہ پاکستان کی مخالفت کی جا رہی ہے اور نظریہ کے نام پر

گھڑے گئے ان نعروں کے نیچے کچل دیا جائے
۔سندھ، سرحد اور بلوچستان کے عوام اپنی صوبائی خودمختاری کا مطالبہ کریں تو ان نظریاتی ہتھیاروں کو استعمال کیا جائے
۔پاکستان کے عوام بالعموم اپنے معاشی خوشحالی اور بنیادی حقوق کے مطالبات اُٹھائیں تو بھی یہ نظریاتی ہتھیار استعمال میں لائے جائیں۔

اور پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کے ان نظریوں کا سہارا لے کر

۔اینگلو امریکی سامراج نے اسلامی بلاک بنانے کے لئے پاکستان کو آلہ ء کار کے طور پر استعمال کیا۔ اسلامستان بنانے کے مشن پر چوہدری خلیق الزمان کو مسلمان ملکوں کے دوروں پر بھیجا گیا۔ پھر Middle East Defence Organization (MEDO) کے قیام کے لئے چوہدری ظفر اللہ وزیر خارجہ پاکستان کو مسلمان ملکوں میں بھیجا گیا۔ اور بالآخر بغداد پیکٹ وجود میں آیا جسے بعد میں CENTO کا نام دے دیا گیا
۔ملک میں آئین سازی کے عمل کو طول دے کر پس پشت ڈال دیا گیا۔ قائداعظم کی ۱۱۔اگست 1947 کی دستور اسمبلی کی افتتاحی تقریر کو نظر انداز کر کے قرارداد مقاصد منظور کی گئی جو چند تجریدی Abstract مذہبی نعروں پر مبنی تھی۔ اسمبلی کے اقلیتی ارکان نے اس کی مخالفت میں تقریریں کیں اور اس کے خلاف ووٹ دیا۔ وزیر قانون جوگندر ناتھ منڈل ملک چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا۔
۔1953 میں مذہبی جماعتوں کے قادیانی ایجی ٹیشن کے نتیجے میں لاہور میں مارشل لاء لگا جو پاکستان کا پہلا مارشل لاء تھا۔
۔1954 میں دستور ساز اسمبلی کے بنائے ہوئے آئین کو مسترد کرتے ہوئے اسمبلی کو توڑ دیا گیا
۔1955 میں سندھ، سرحد، بلوچستان، پنجاب کا ون یونٹ بنا کر تخت لاہور کے تحت صوبہ مغربی پاکستان بنا دیا گیا
۔1956 اسٹبلشمنٹ کے نمائندے چوہدری محمد علی نے پہلا دستور بنایا جس میں پیریٹی کے نام پر مشرقی پاکستان کے 54 فیصد کو مغربی پاکستان کے 46 فیصد کے برابر کر دیا گیا۔ یہ چوہدری محمد علی وہی شخص ہے جس نے 60 کی دہائی میں نظام اسلام پارٹی بنائی اور 64 اور 70 کے انتخابات میں دائیں بازو کے اتحاد میں شامل ہو کر حصہ لیا۔ اور یہی شخص ہے جس نے سیکرٹری جنرل حکومت پاکستان کی حیثیت سے پہلی پریس ایڈوائس جاری کی تھی کہ قائداعظم کی ۱۱۔اگست کی تقریر کے مکمل متن کو شائع نہ کیا جائے (مگر ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین نے پورا متن شائع کیا)۔
۔56-58 کے عرصہ میں لیاقت علی خان، چوہدری محمد علی، سر ظفر اللہ، غلام محمد، سکندر مرزا وغیرہ نے اسلام اور نظریہ کے نام پر ملک کو سیاسی طور پر غیر مستحکم کیا اور ایوب خان کے مارشل لاء کی راہ ہموار کی۔
۔ایوب خان کے دس سالہ دور میں اسلام اور نظریہ کا کئی بار استعمال کیا گیا۔ غلاف کعبہ۔ کشمیر کا جہاد اور 65 کی

جن اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے لوگوں کے مذہبی جذبات سے کھیلا گیا

۔یحیٰ خان کے تین سالہ دور میں نظریہ سازی کی سرکاری فیکٹریوں نے بڑھ چڑھ کر کام کیا اور تمام سرکاری وسائل دائیں بازو کی نظریہ باز جماعتوں کے حوالے کر دئے گئے۔70 کے انتخاب کا نتیجہ آیا تو اس کے نتائج یہ کہ کر مسترد کر دئے گئے کہ نظریہ پاکستان کی مخالف جماعتیں کامیاب ہوگئی ہیں اس لئے ان انتخابات کو کالعدم کر کے نئے انتخاب کرائے جائیں۔اور مشرقی پاکستان میں اس انتخاب کو کالعدم کر کے فوجی ایکشن کر دیا گیا اور اسلام اور نظریہ پاکستان کے نام پر جعلی انتخاب کرائے گئے۔مذہبی انتہا پسند تنظیمیں الشمس اور البدر نظریہ پاکستان کے نام پر فوجی ایکشن میں شامل ہوگئیں۔71 میں نظریہ پاکستان کے نام پر پاکستان کو توڑ دیا گیا

۔77-72 بھٹو دور میں مذہبی اور دائیں بازو کی جماعتوں نے اسلامی نظام اور نظریہ پاکستان کے نعروں کے بے دریغ استعمال کیا اور بھٹو حکومت کو مسلسل غیر مستحکم کرنے کی کوشش کی گئی۔74 میں قادیانی ایجی ٹیشن کر کے احمدیوں کو اقلیت قرار دلوایا گیا۔ 77 کی PNA کی تحریک۔نظام مصطفےٰ تحریک۔فوجی کمانڈوز نے دینی مدرسوں کے طالب علموں کو مسلح ہو کر مظاہروں میں حصہ لینے کی ٹریننگ دی۔بھٹو حکومت کا نظریہ پاکستان کے نام پر تختہ الٹ دیا گیا۔

۔88-77 ضیا دور۔نظریہ سازی کی جو فصل گزشتہ 30 سال میں بوئی گئی تھی اب اس کے کاٹنے کا وقت آ گیا تھا۔ضیا الحق اور امریکی سامراج نے نفاذ اسلام، نفاذ شریعت، حدود آرڈیننس، چادر اور چار دیواری، پھانسیاں، کوڑے، جلاوطنیاں، کلاشنکوف کلچر، ہیروئین اور سب سے بڑھ کر جہاد افغانستان کے ذریعے پاکستان کے سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور اخلاقی نظام کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا۔درسی نصاب کی کتابوں، ملازمتوں کے لئے انٹرویوز اور ترقیوں کے لئے معیار نظریہ کے نام پر گھڑے گئے ان نعروں کی بھینٹ چڑھا دئے۔

۔99-88 بے نظیر اور نواز شریف کے میوزیکل چیئرز اقتدار کے ادوار میں ISI نے ضیا دور کی تمام داخلی اور خارجی پالیسیوں کو من وعن جاری رکھا۔افغانستان میں جہادی تنظیموں کی خانہ جنگی کے دوران ان کی سرپرستی جاری رہی یہاں تک کہ طالبان تنظیم کو اقتدار میں لایا گیا۔پاکستان کے اندر بھی سپاہ صحابہ، سپاہ محمد، لشکر جھنگوی، لشکر طیبہ اور جیش محمد پروان چڑھائی گئیں۔

۔2009-99 مشرف دور اور بعد۔ 9/11 کے بعد کا پاکستان۔مذہبی انتہا پسندی جنونیت میں تبدیل ہوگئی۔لال مسجد اور اسی قبیل کے مدرسوں میں خودکش حملہ آوروں کی فیکٹریاں قائم ہوگئیں جنہیں ISI اور اسٹبلشمنٹ نے پروان چڑھنے دیا۔اعجاز الحق، چوہدری شجاعت حسین اور دیگر حکومتی عہدیداران کی سرپرستی کرتے رہے۔اور میڈیا کے بہت سے lead anchors بھی ان کی حمایت میں پیش پیش رہے۔ملک مذہبی جنونیوں اور دہشت گردوں کے ہتھے چڑھ گیا اور بے گناہ معصوم لوگوں؛ سکول کے بچوں اور عورتوں کا بہیمانہ قتل عام کیا گیا' سارا ملک اس مذہبی جنونیت

کے آتش فشاں کے دہانے پر رکھ دیا گیا۔اور اب اس میں بھی کوئی شبہ نہیں رہ گیا کہ اس پورے ڈرامہ کے پس پشت امریکی برطانوی اور بھارتی ایجنسیاں ہیں جو ان کو جدید اسلحہ' ٹریننگ اور ڈالرز فراہم کر رہے ہیں۔

ہم نے اس نام نہاد نظریہ پاکستان اور دوسرے نظریاتی نعروں کے سراب کے پیچھے بھاگتے ہوئے جو شدید نقصانات اُٹھائے ہیں، سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی سطح پر جو Revers Gear لگا ہے اس سے ہم قریب قریب پتھر کے زمانے میں پہنچ گئے ہیں۔اصل کنفیوژن نام نہاد پڑھے لکھے درمیانے طبقہ کی سوچ کا ہے جس میں اکثریت پروفیشنلز کے ہے جن کے ذہنوں میں ایک طالبان بٹھا دیا گیا ہے۔گزشتہ ساٹھ سال میں اسٹبلشمنٹ اور عالمی سامراج نے اس پر بہت کام کیا، تمام سرکاری و غیر سرکاری وسائل اور بین الاقوامی وسائل بروئے کار لائے گئے۔درسی کتابوں، اخبارات و رسائل، تقریروں تحریروں، تعلیمی اداروں، ابلاغ کے اداروں اور فوجی افسروں کے تربیتی اداروں میں تاریخ کو مسخ کر کے جو نظریاتی تربیت کی گئی اس نے نام نہاد پڑھے لکھے درمیانے طبقہ کو ذہنی طالبان بنا دیا ہے۔

آیئے دیکھیں کہ نظریہ پاکستان اور دیگر نظریاتی نعروں کی اصلیت کیا ہے؟

قیام پاکستان کے بارے میں ایک نظریہ تو یہ پیش کیا جاتا ہے کہ:

''برصغیر کے مسلمانوں کو اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے ایک ملک چاہیے تھا، چنانچہ پاکستان دراصل اسلامی نظام کی تجربہ گاہ کے طور پر حاصل کیا گیا ہے۔یہ ایک نظریاتی ملک ہے اور اس کی نظریاتی سرحدیں ہیں جنہیں جغرافیائی سرحدوں سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔علامہ اقبال نے اس کا خواب دیکھا تھا، قائد اعظم نے اس کی تعبیر کی۔''

اس تصور کو نظریہ پاکستان کا نام دیا جاتا ہے۔پاکستانی اسٹبلشمنٹ کا سرکاری نظریہ بھی یہی ہے۔اس تصور کو ان مراعات یافتہ طبقات نے اختیار کیا جو محکوم طبقوں اور قومیتوں پر اپنی سیاسی و معاشی بالادستی کو قائم کرنے کے لیے اسلام کی آڑ استعمال کرنا چاہتے تھے۔علاوہ ازیں اس تصور کی نقیب سیاسی جماعتیں جو ''نفاذ اسلام'' کے نعرے کو متذکرہ طبقات کی بالادستی اور جہادی کلچر کو مسلط کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں تحریک پاکستان کے دوران قیام پاکستان کی شدید مخالفت کرتی رہی ہیں۔

ایک دوسرا تصور بھی پایا جاتا ہے:

''برصغیر کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین کوئی تضاد نہیں تھا۔انگریزوں نے لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی اختیار کر کے ان کے مابین صدیوں سے قائم بھائی چارہ کو ختم کیا اور پھر سازش کے ذریعے ملک کو تقسیم کر کے چلے گئے تاکہ برطانوی سامراج کے مفادات پورے ہوتے رہیں۔''

یہ انڈیا کی اسٹبلشمنٹ کا سرکاری مؤقف ہے اور اسے پاکستان کے بعض، تمام نہیں، ترقی پسند، بائیں بازو اور

لبرل کہلوانے والے لوگ بھی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ وہ پاکستان کو توڑنے اور تاریخ کی اس غلطی کو درست کر کے بھارت اور پاکستان کے درمیان لکیر کو مٹانے کی بات بھی کرتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کی وفاداریاں اور مفادات سرحد پار ہیں۔ اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اسلام آباد کے مسلسل جبر اور ناانصافیوں سے تنگ آ کر چھوٹے صوبوں کے بعض قوم پرست رہنما بھی اس تصور کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

یہ دونوں تصوراتی یا نظریاتی ماڈل یا موقف جو مختلف مخصوص مفادات کے تحت وجود میں آئے یا لائے گئے ہیں، جب تاریخی جدلیات کے دھارے کے سپرد کیے جائیں تو خس وخاشاک کی طرح بہتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مطالعہ تاریخ دراصل ایک سائنس ہے۔ اس میں ذاتی پسند یا ناپسند کا کوئی دخل نہیں ہے۔ تاریخ کوئی عقیدہ نہیں ہے۔ اس کا مطالعہ عقاید کی بنیاد پر نہیں بلکہ معروضیت کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ عقاید خواہ دائیں بازو کے ہوں یا بائیں بازو کے، عقیدہ پرستی کے شکنجے میں پھنس کر نہ تو ماضی کی اصل حقیقت سے آگاہی حاصل ہوسکتی ہے، نہ حال کو سمجھا جاسکتا ہے اور نہ مستقبل کے بارے میں کوئی درست پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔

تاریخ عالم ملکوں اور سلطنتوں کے عروج وزوال سے عبارت ہے۔ مختلف قبیلوں، گروہوں، قوموں، نسلوں، طبقوں اور فرقوں کے باہمی ٹکراؤ یا جدل کے نتیجے میں نئے ملک اور سلطنتیں وجود میں آئیں اور پھر ٹکراؤ اور جدل کے اسی عمل نے ان کا شیرازہ بکھیر دیا اور نئے ملک یا سلطنتیں وجود میں آ گئیں۔ ملکوں یا سلطنتوں کی سرحدوں کو کبھی دوام حاصل نہیں ہوا۔ کسی ملک یا سلطنت کی عمر کا انحصار اس کی داخلی و خارجی قوتوں کے مابین تضادات کی حل پذیری پر رہا ہے۔ اگر تضادات حل ہوتے رہیں تو عمر لمبی ہو جاتی ہے ورنہ مختصر۔ اس وقت دنیا کا جو نقشہ ہے اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ گذشتہ بیسویں صدی میں یہ تین مرتبہ بڑی تبدیلیوں سے گزرا' ایک پہلی عالمی جنگ کے بعد' دوسرا دوسری عالمی جنگ کے بعد اور تیسرا سرد جنگ کے خاتمے پر۔ اس دوران کبھی غالب مغلوب ہو جاتے رہے اور کبھی مغلوب غالب!

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں غالب ومغلوب کی جدلیات ہندوؤں اور مسلمانوں کے حوالے سے کم وبیش بارہ تیرہ سو سال پہلے شروع ہوئی۔ جب برصغیر کے مغرب میں سندھ اور پھر پنجاب پر مسلمان حملہ آوروں نے حکمرانی اور غلبہ حاصل کیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین معاشرتی اور ثقافتی تفریق بھی بہت زیادہ تھی۔ غزنوی دور کے مسلمان مفکر ابوریحان البیرونی نے اپنی تصنیف کتاب الہند میں اس تفریق کی شدت کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ انکشاف کیا تھا کہ ''ہندو تمام غیر ملکیوں یعنی مسلمانوں کو ملیچھ یعنی ناپاک سمجھتے ہیں اور اگر کوئی مسلمان یا غیر ملکی چاہے بھی تو وہ ان میں داخل نہیں ہوسکتا گویا دونوں فرقوں میں سے کوئی ایک فرقہ بھی دوسرے میں جذب نہیں ہوسکے گا۔'' (1) برصغیر کے وسیع علاقے پر مسلمان سیاسی، معاشی و ثقافتی معاشرتی طور پر غالب اور ہندو مغلوب رہے۔ مسلمان حکمران تھے اور ہندو رعیت یا باجگزار۔ مسلمان حکمران قرون وسطیٰ کے مروجہ استبدادی دستور

کے مطابق رعیت اور محکوم پر وہ تمام ظلم و زیادتی روا رکھتے تھے جو اس استبدادی نظام میں رائج تھا۔ اس استبداد کا اگرچہ مذہب سے تعلق نہیں تھا، مروجہ دستور یہی تھا' تاہم غالب کا مذہب غالب اور مغلوب کا مذہب مغلوب تھا۔ اس وقت کے مسلمان مورخین منہاج الدین سراج، ضیاء الدین برنی، محمد قاسم فرشتہ، نظام الدین احمد بخشی اور مُلا عبدالقادر بدایونی وغیرہ کی ضخیم تصانیف تاخت وتاراج کی ان تفاصیل سے بھری پڑی ہیں جو مسلمان حکمران اور حملہ آور مفتوحہ اور مقبوضہ علاقوں پر کرتے تھے۔ مندر تباہ ومسمار کیے جاتے تھے، بت توڑے جاتے تھے۔ تاہم خراج ادا کرنے کی صورت میں مندر اور بت محفوظ رہتے تھے۔ اور یہ بھی درست ہے کہ اس طویل دور میں ہمیشہ ایسا نہیں ہوا، ہندو مسلم تضاد کو ختم کرنے یا کم کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں جو بعض ادوار میں کامیاب بھی ہوئیں۔ اس ضمن میں مغل شہنشاہ اکبر کا دور اور کشمیر کے حکمران زین العابدین اور بعض اور علاقائی حکمران قابل ذکر ہیں۔ مسلمان صوفیا کا کردار بھی اس تضاد کو کم کرنے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے میں بڑا اہم رہا۔ خصوصاً چشتیہ سلسلہ کے بزرگان بابا فریدالدین، نظام الدین اولیا اور امیر خسرو وغیرہ۔ تاہم طریقت اور شریعت کا نفاذ بھی ساتھ ساتھ کارفرما تھا۔ اہل شریعت اس دور کے ''نظریاتی'' ماڈل کے علمبردار تھے۔ جب حکمران ان کا زیادہ اثر قبول کر لیتا تو ہندو مسلم تضاد میں شدت آ جاتی اور جب حکمران صوفیا کے مسلک کے زیادہ زیر اثر ہوتا تو یہ تضاد نرم پڑ جاتا تھا۔ صوفیا کی اس تحریک میں بھگتی تحریک نے اہم کردار ادا کیا۔ اس طرح یہ تاریخی جدل غالب ومغلوب کی کشمکش سے ہوتا ہوا اٹھارویں صدی کے آغاز میں پہنچا تو مغل زوال پذیر ہو چکے تھے اور مرہٹہ ایک بڑی قوت بن چکے تھے۔ 1757ء میں احمد شاہ ابدالی نے انہیں پانی پت کے میدان میں شکست فاش دی لیکن اس کا فائدہ مسلمانوں کو نہ ہوا۔ تھوڑے عرصے بعد احمد شاہ ابدالی کے ایک سکھ سپاہی رنجیت سنگھ نے پنجاب، کشمیر اور پشاور پر اپنی حکومت قائم کر لی اور ادھر بنگال و بہار میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم ہوگئی۔ اس حکومت کے قیام میں ہندو مارواڑی سیٹھوں نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔

اٹھارویں صدی کے انجام اور انیسویں صدی کے آغاز میں برصغیر کے طاقت کے توازن میں ایک کیفیتی تبدیلی (qualtative (change) آ چکی تھی۔ وہ جو ہزار سال سے مغلوب تھے یعنی ہندو نئی غالب قوت یعنی انگریزی استعمار کے وفادار بن گئے یا کمپراڈور بن گئے۔ راجہ رام موہن رائے کی ترغیب پر انہوں نے انگریزی تعلیم حاصل کی اور نئے انتظامی و سیاسی ڈھانچہ میں ایک جونیئر پارٹنر کی حیثیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مسلمان اشرافیہ جو لارڈ ہیسٹنگز (Hastings) کے عارضی بندوبست اور لارڈ کارانوالس (Cornwalis) کے بندوبست دوامی کا شکار ہو کر اپنی دولت و جاگیر سے محروم ہو گئے۔ ان کی جاگیردانہ اخلاقیات اور کرم خوردہ سماجی اقدار ان کو انگریزی تعلیم کی جانب مائل نہ کرسکی۔ مسلمان درمیانہ اور غریب طبقہ کو بھی جاگیرداروں کی قیادت اور علماء کی قیادت جن میں وہابی اور فرائضی تحریک کے جہادی بھی شامل تھے ایک طویل عرصہ تک جدید تعلیم اور نئے نظام سے دور

رکھے رہے۔علاوہ ازیں صدیوں سے مغلوب ہندو جو نئے تناظر (Pardigm Shift) کے بعد نئی غالب قوت انگریز کے جونیئر پارٹنر تھے اپنی پوری کوشش کرتے تھے کے مسلمان کی ترقی کا راستہ روکیں۔

1857ء کی جنگ آزادی یا غدر کے بعد جو پاور سٹرکچر ابھر کر سامنے آیا اس میں سب سے اوپر غالب قوت انگریز تھے، دوسرے نمبر پر نئی ابھرتی ہوئی ہندو بورژوازی تھی اور تیسرے اور نچلے درجے پر مسلمان تھے جن میں چند مسلمان ریاستوں کے نوابین کو مستثنیٰ کر سکتے ہیں۔اب جدلیات ان تین قوتوں کے درمیان تھی۔انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کی انتظامیہ کو ہٹا کر براہ راست تاج برطانیہ کی عملداری قائم کر چکے تھے اور اسے مستحکم کر رہے تھے۔نئی ہندو بورژوازی کو پہلی بار یہ اندازہ ہوا تھا کہ یورپ کے صنعتی انقلاب نے جو جمہوری نظام جنم دیا ہے اس نے عددی اکثریت کی بنیاد پر ان کے لیے حصول اقتدار کا راستہ کھول دیا ہے۔چنانچہ انہوں نے اپنے غلبہ کے حصول کے لیے یورپ کے بورژوا نیشنلزم کے تصور کا من وعن ہندوستان پر اطلاق کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں در پردہ بورژوا لبرل سوچ کے بجائے ہندو احیاء اور ہندو غلبہ کی کوشش تھی جس میں مسلمانوں کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھی گئی تھی۔وہ اپنی جدلیات میں ایک طرف انگریز کے ساتھ اقتدار و اختیار میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی جدوجہد کر رہے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں کو مکمل طور پر مغلوب و محکوم بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اٹھارویں صدی کے وسط سے انیسویں صدی کے وسط تک کے 100 سال میں برصغیر کے سیاسی، معاشی و معاشرتی منظر میں جس قدر بڑی تبدیلی یا Paradigm Shift آیا تھا، اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو جس جدلیات کا سامنا تھا اس کے لیے اس 100 سال میں انہیں شاہ ولی اللہ، سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید، جمال الدین افغانی اور علمائے دیوبند کے نظریاتی مذہبی ماڈل نے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔اان مذہبی رہنماؤں کو اس بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ سیاست، معیشت اور معاشرت کی جدل میں مسلمان ہندوؤں کے مدمقابل کیسے کھڑے ہوں گے۔

جس زمانے میں رام موہن رائے ہندوؤں کو انگریزی تعلیم اور جدید سائنس پڑھا رہا تھا، اسی زمانے میں سید احمد، شاہ اسماعیل اور ان کے بعد کے وہابی تحریک کے قائدین مسلمانوں کے جہادی جتھے بھرتی کر کے پشاور میں طالبان ٹائپ اسلامی حکومت قائم کرنے میں مصروف تھے۔بالآخر مسلمان اپنے تاریخی جدل کے تقاضوں سے نمٹنے کے لیے سر سید احمد خاں، نواب لطیف اور سید امیر علی جیسے لوگوں کے ساتھ شامل ہوئے۔انہوں نے راجہ رام موہن رائے والا کام کم وبیش 50 یا 60 سال کے بعد شروع کیا اور یہ ایک ایسا فرق تھا جسے مسلمان کبھی پورا نہیں کر سکے۔

انیسویں صدی کے اواخر تک ہندوؤں نے انگریزوں کو آنکھیں دکھانی شروع کر دی تھیں۔وہ انڈین نیشنلزم اور جمہوری حقوق کے نام پر اقتدار اور انتظامی ڈھانچے میں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کے مطالبات کر رہے تھے۔1885ء میں انڈین نیشنل کانگریس خود ایک انگریز لارڈ ہیوم نے قائم کر دی تھی۔تا کہ زیادہ نہ مراعات کے حصول کی تحریک ایک بورژوا جمہوری پلیٹ فارم سے ہو اور کہیں یہ تشدد کا راستہ نہ اختیار کر لے۔یاد رہے کہ

انڈین نیشنلزم کا کوئی وجود ہندوستان کی تاریخ میں نہیں رہا۔برصغیر کبھی ایک سلطنت یا ملک کے طور پر موجود نہیں رہا۔خصوصاً جنوبی ہند ہمیشہ ایک الگ دنیا تھا اور شمالی ومغربی ہند ایک دوسری دنیا۔یہاں تک کہ ہندومت بھی مختلف علاقوں میں مختلف تھا۔مختلف علاقوں کے دیوی دیوتا بھی اور رسوم ورواج بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے۔مگر اس وقت ہندو اپنے مادی مفادات کے حصول اور اپنے غلبہ کے احیاء کے لیے انڈین نیشنلزم کے نعرے کو فروغ دے رہے تھے۔بنگال کا سریندر رناتھ بینرجی اور پونا کا بال گنگا دھر تلک اس سودیشی تحریک میں پیش پیش تھے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں مسلمان بھی اپنی بقا کی جدلیات کے تقاضے پورے کرنے میدان میں اتر آئے تھے۔سر سید احمد خاں کا موقف یہ تھا کہ ہندوستان ایک کثیر الاقوام برصغیر ہے۔یہ ایک ملک نہیں ہے اور نہ یہاں رہنے والے ایک مذہب یا قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔سر سید نے برصغیر کا یورپ سے موازنہ کیا کہ جیسے یورپ میں کئی اقوام ہیں ویسے ہی برصغیر ہندوستان میں کئی اقوام ہیں اور یہاں انڈیشن نیشنل کانگریس کسی ایک قوم کی نہیں بلکہ ہندو اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کر رہی ہے۔1905ء کی تقسیم بنگال پر کانگریس کی جانب سے شدید ایجی ٹیشن نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کے فائدے میں ہونے والی کسی انتظامی تبدیلی یا اقدام پر کانگریس کا رویہ کیا ہوگا۔جس کے بعد 1906ء میں سر آغا خاں اور دوسرے مسلم زعماء نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں مسلم لیگ کے قیام کا فیصلہ کیا اور سر سید کی تعلیمی تحریک ایک سیاسی تحریک میں تبدیل ہوگئی۔

بیسویں صدی کا آغاز ہوا تو برصغیر میں تینوں قوتوں کے مابین جدلیات کی کشمکش کچھ یوں تھی۔ اسٹرکچر میں دوسری پوزیشن کے حامل ہندو جلد از جلد انگریز کو حاصل پہلی پوزیشن پر پہنچنا چاہتے تھے اور غلبے کے حصول کی اس کوشش میں مسلمانوں کی حیثیت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔وہ انڈین نیشنلزم اور سیکولرازم کی تعریف یوں کرتے تھے کہ کوئی ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی نہیں ہے، سب ہندوستانی ہیں۔وہ ان کی قومی شناخت کا انکار کر کے ان کو اپنی عددی اکثریت کے نیچے کچل ڈالنا چاہتے تھے۔یوں وہ مسلمانوں سے گزشتہ ایک ہزار سال کا بدلا بھی لینا چاہتے تھے۔ادھر مسلمان اس صورتحال میں اپنی بقا کی جدوجہد کر رہے تھے۔

مسلمان انڈین نیشنلزم کی تعریف یوں کرتے تھے کہ ہندوستان میں آباد دونوں بڑی قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور وہ آپس میں معاملات طے کر کے انڈین نیشنلزم کے لیے کام کریں۔ان کے سیاسی، معاشی و معاشرتی حقوق تسلیم کیے جائیں اور ہر سطح پر انہیں ان کا حصہ دیا جائے۔برصغیر کے مغرب اور مشرق کے وسیع علاقوں میں وہ اکثریت میں تھے۔وہ متحدہ ہندوستان کے دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی حیثیت کو منوانا چاہتے تھے۔

ادھر انگریز اپنی بین الاقوامی سامراجی سیاست میں اتار چڑھاؤ کا شکار تھے۔پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم اور دونوں جنگوں کے درمیانی عرصہ میں ان کی کوشش رہی تھی کہ ہندوستان میں داخلی امن رہے اور وہ جنگی تیاریوں میں ہندوستان کے وسائل کا بھرپور استعمال کر سکیں۔اس کے لیے وہ ہر دس سال بعد آئینی اصلاحات کا

ایک پیکیج لاتے تھے۔لیکن ہر پیکیج سے پہلے اور بعد ہندو۔مسلم تضاد شدید ہو جاتا تھا۔وجہ یہ ہوتی تھی کہ کانگریس اس پیکیج میں بلاشرکت غیرے زیادہ سے زیادہ حصہ لینے کی کوشش کرتی،خود کو پورے ہندوستان کے عوام کا واحد نمائندہ ثابت کرتی جبکہ حقیقت میں مسلمانوں کے فائدے کا کوئی کام ہوتا تو اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو جاتی۔مسلمانوں کا اعتماد کانگریس سے اٹھتا چلا گیا اور ہندو۔مسلم جدلیات کے نتیجے میں آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا مسلم کانفرنس ان کی نمائندہ جماعتوں کے طور پر ابھر آئیں۔چونکہ کانگریس آبادی کے لحاظ سے بڑے حصے کی نمائندہ تھی اور اس کی ایجی ٹیشن کی قوت بھی زیادہ تھی اس لیے وہ انگریزوں سے اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔

1905ء میں تقسیم بنگال سے لے کر 1947ء کی تقسیم ہندوستان تک جدلیات کی یہ مثلث اسی کشمکش کا شکار رہی۔کانگریس کی سودیشی تحریک کے دباؤ سے 1912ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کر دی گئی اور مسلمانوں کو اس کے عارضی سیاسی و معاشی ثمرات سے محروم کر دیا گیا۔1909ء کی منٹو۔مورلے اصلاحات اور 1919ء کی مانٹیگو۔چیمسفورڈ اصلاحات کے نتیجے میں بننے والی لیجسلیٹو کونسلوں میں جداگانہ نمائندگی کا اصول تسلیم کرتے ہوئے مسلمانوں کو نمائندگی دے دی گئی تھی لیکن وہ مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی اپنی آبادی کے تناسب سے بہت ہی کم تھی۔تاہم مسلمان نمائندوں کی اکثریت کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔محمد علی جناح بمبئی کونسل کے رکن تھے اور مسلم لیگ اور کانگرس دونوں میں شامل تھے۔وہ 1916ء میں کانگرس اور مسلم لیگ کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور میثاق لکھنؤ طے کرانے کی وجہ سے ہندو۔مسلم اتحاد کے سفیر کہلاتے تھے۔20ء کے عشرے میں لیگ اور کانگرس نے سیلف رول یعنی سوراج کے لیے مشترکہ کوشش شروع کی اور لگا کہ جدلیات کی مثلث کے دو نقطے ایک دوسرے کے قریب ہو کر زیادہ قوت سے سوراج حاصل کر لیں گے۔

پہلی عالمی جنگ کا خاتمہ،ترکی کی شکست اور خلافت کا خاتمہ،20ء کے عشرے میں برصغیر کے مسلمانوں کی تمام تر توانائیاں تحریک خلافت میں بہا لے گیا۔اس تحریک کا مقصد تو پورا نہ ہوا کیونکہ اتاترک نے خلافت کی بساط ہمیشہ کے لیے لپیٹ دی تھی۔مگر برصغیر میں سیاسی مولویوں کی ایک بہت بڑی کھیپ تیار ہو گئی۔ان کا کردار ہندو۔مسلم۔انگریز جدلیات میں زیادہ تر مثبت کردار کے بجائے منفی کردار ادا کرنے کا تھا۔وہ مسلمانوں کو قرون وسطیٰ کے احیائے اسلام کی طرف دھکیلنے کی کوشش کرتے اور برصغیر سے انگریزوں کو نکالنے کے لیے کانگرس کا ساتھ دینے کی بھرپور حمایت کرتے تھے۔مسلمانوں کے سیاسی،معاشی و معاشرتی حقوق کے تحفظ کی مسلم لیگ کی جدوجہد کی کھل کر مخالفت کرتے تھے۔

20ء کے عشرے کے اواخر میں دوسری عالمی جنگ کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔حکومت برطانیہ نے اگلا آئینی پیکیج لانے کے لیے ہندوستانی لیڈروں سے مشورے کے لیے سائمن کمیشن بھیجا جو 1927ء اور 1928ء میں

دو مرتبہ ہندوستان آیا۔ایک مرتبہ پھر ہندو۔مسلم۔انگریز کی جدلیات کی مثلث میں کشمکش تیز ہو گئی۔مسلمان متحدہ ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے سیاسی، معاشی، معاشرتی حقوق کا تحفظ چاہتے تھے۔مسلم اکثریت کے علاقوں میں مکمل صوبہ کا درجہ صرف پنجاب اور بنگال کو حاصل تھا۔سندھ صوبہ بمبئی کے حصہ تھا۔شمال مغربی سرحدی صوبہ مکمل صوبہ نہ تھا بلکہ ایک لیفٹیننٹ گورنر کے ماتحت مرکز سے کنٹرول کیا جاتا تھا۔بلوچستان میں جو علاقہ برٹش بلوچستان کہلاتا تھا وہ ایک چیف کمشنری کا درجہ رکھتا تھا۔باقی قلات اور دوسری ریاستوں پر مشتمل تھا۔چنانچہ اس وقت مسلمانوں کی جدوجہد دراصل صوبائی خودمختاری کی تحریک کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ان کے اولین مطالبات میں سندھ کو بمبئی سے الگ کرنا،صوبہ سرحد اور بلوچستان کو مکمل صوبہ کا درجہ دینا شامل تھا۔مزید برآں وہ ایک فیڈریشن کا ڈھانچہ چاہتے تھے جس میں صوبوں کے پاس زیادہ اختیارات ہوں اور مرکز کے پاس چند ضروری مرکزی محکمے ہوں۔جبکہ کانگرس مضبوط مرکز کی حامی تھی اور صوبوں کو کم سے کم اختیارات دینا چاہتی تھی۔اس طرح مسلم۔ہندو جدلیات کی کشمکش اپنے اپنے مفادات کے حوالے سے مضبوط مرکز اور ڈھیلے ڈھالے وفاق کے مطالبوں کی شکل اختیار کر گئی تھی۔

ان حالات میں 1928ء۔1927ء کے دو سال میں سیاسی کشمکش میں تیزی آئی۔جناح کی تجاویز دہلی سامنے آئیں پھر کانگرس اور لیگ سمیت آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی اور موتی لال نہرو کو سب کے مشترکہ مطالبات پر مبنی رپورٹ بنانے کا کام سونپا گیا تاکہ سائمن کمیشن کے ذریعے حکومت برطانیہ کو آئینی فارمولے کا ایک مشترکہ چارٹر پیش کر دیا جائے مگر نہرو رپورٹ نے مسلمانوں کے فائدے کے تمام مطالبات کو یکسر نظرانداز کر کے ایک مضبوط مرکز پر مبنی وحدانی طرز حکومت کا منصوبہ پیش کر دیا۔مسلمان سخت مایوس ہوئے اور انہوں نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد کر کے اپنا مطالبات کا علیحدہ چارٹر پیش کر دیا جسے قائداعظم کے چودہ نکات کہا جاتا ہے۔

محمد علی جناح حالات سے مایوس ہو کر انگلستان چلے گئے۔

یہاں تک یہ واضح ہو جاتا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کا سیاسی مسئلہ کیا تھا اور وہ کسی قسم کی کشمکش سے دوچار تھے۔مسئلہ نظریاتی ریاست کے حصول کا نہیں تھا بلکہ سیاسی و معاشی تحفظات کی کشمکش کا تھا۔پاور سٹرکچر کے تینوں فریق یعنی انگریز، ہندو اور مسلمان ایک جدل میں ایک دوسرے کے ساتھ نبرد آزما تھے۔لیکن ہمارے نظریاتی ریاست کے علمبردار اسے صرف ایک نظریاتی ریاست کے حصول کا مسئلہ سمجھتے ہیں اور اس مقصد کے لیے 1930ء کے مسلم لیگ کے الٰہ آباد کے سالانہ اجلاس میں علامہ محمد اقبال کے خطبہ صدارت کو بنیاد بناتے ہیں۔آئیے اس خطبے کا مطالعہ کرتے ہیں۔

اس خطبے کا پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ اس کا مکمل متن نہ تو پڑھا جاتا ہے اور نہ درسی کتابوں میں پڑھایا جاتا ہے۔اس میں سے صرف ایک جملہ اپنے سیاق وسباق سے الگ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔جو یوں ہے کہ:

''میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست میں ضم کر دیا جائے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ سیلف گورنمنٹ، خواہ یہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا سلطنت برطانیہ کے باہر ہو، ایک مربوط شمال مغربی ہندی مسلم ریاست کی تشکیل مسلمانوں کی کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی تقدیر ٹھہرے گی۔''

اردو درسی کتابوں میں لفظ ریاست کے ساتھ ''خودمختار'' اور انگریزی درسی کتابوں میں "autanomaus" کے لفظ کا اضافہ بھی کیا جاتا ہے جو کہ اصل خطبہ میں نہیں ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ علامہ کا مذکورہ خطبہ 28-1927ء کے پس منظر میں ہے جس میں آل پارٹیز کانفرنس، نہرو رپورٹ اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور قائداعظم کے چودہ نکات پیش ہوئے تھے۔ یہ پورا خطبہ ایک متحدہ ہندوستان کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایک فیڈریشن پر مبنی ہے جو مسلمانوں کا عمومی مطالبہ تھا اس فیڈریشن کے اندر آپ نے سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے پنجاب، سرحد اور بلوچستان کے ساتھ ضم کر کے ریاست بطور ایک فیڈرل یونٹ یعنی صوبہ کے طور پر مطالبہ کیا ہے اور یہ بھی آپ کا نیا مطالبہ نہیں ہے بلکہ آپ خود اس خطبے میں فرماتے ہیں کہ ''یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے بھی پیش کی گئی تھی۔ اس نے اس بنا پر اس تجویز کو رد کر دیا تھا کہ اگر اس قسم کی ریاست قائم ہوئی تو یہ بے ہنگم طور پر وسیع و عریض ریاست ہوگی جس کا انتظام کرنا دشوار ہوگا۔'' اس کا حل آپ نے یہ تجویز کیا کہ اگر انبالہ ڈویژن جو ہندو اکثریت کا تھا، نکال دیا جائے تو یہ مجوزہ ون یونٹ کا صوبہ قابل عمل ہو جائے گا۔

علامہ نے اپنے خطبے کے شروع کا حصہ مسلم قومیت کے تصور پر صرف کیا اور زور دیا کہ انڈین نیشنلزم برصغیر میں آباد قوموں کے وجود سے انکار میں نہیں بلکہ ان کے وجود کو تسلیم کرنے میں مضمر ہے۔ انڈین نیشنلزم کی یہ تعریف سرسید سے لے کر جناح تک تمام مسلم رہنما کرتے تھے اور اس بنیاد پر متحدہ ہندوستان میں ڈھیلے ڈھالے وفاق کے قیام کے خواہاں تھے۔ رینان کے ''قوم'' کے تصور کا حوالہ دیتے ہوئے آپ نے کہا ''اگر اکبر کا دین الٰہی یا کبیر کی تعلیمات عوام الناس میں مقبول ہو جاتیں تو ممکن تھا کہ ہندوستان میں بھی اس قسم کی ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور متعدد جاتیوں میں اس قسم کا کوئی رجحان نہیں کہ وہ اپنی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کر لیں۔ قومیت ہند کا اتحاد ان تمام جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ ان کے تعاون اور اشتراک اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ میری رائے میں ہندوستان اور ایشیا کی تقدیر صرف اس بات پر مبنی ہے کہ ہم قومیت ہند کا اتحاد اسی اصول پر قائم کریں۔''

آگے چل کر کہا:

''میرا دل اب بھی امید سے لبریز ہے۔ واقعات کا رجحان بہرکیف ہمارے داخلی اتحاد اور اندرونی ہم آہنگی ہی کی جانب نظر آتا ہے۔ اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ اعلان کرنے میں تامل نہیں اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائیدار حل کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانان ہند کو اپنی روایات و تمدن

کے ماتحت اپنے ہندوستانی مادر وطن کے اندر رہتے ہوئے آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔''

آپ نے ون یونٹ کا صوبہ تجویز کرنے کے بعد آگے چل کر کہا کہ ''اس سے مسلمانوں میں احساس ذمہ داری مضبوط ہوگا اور جذبہ حب الوطنی فروغ پائے گا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بھرپور موقع دیا جائے کہ وہ ہندوستان کے نظام سیاست میں رہ کر نشوونما پاسکیں تو وہ ہندوستان کے خلاف تمام حملوں کی صورت میں چاہے یہ حملہ بزورقوت ہو یا بزور خیالات، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔''

اس کے بعد آپ نے وفاق ہندوستان کے دفاع پر بڑی تفصیل کے ساتھ بحث کی اور کہا ''مجھے یقین ہے کہ وفاقی حکومت کے قیام کی صورت میں مسلم وفاقی ریاستیں ہندوستان کے دفاع کی خاطر غیر جانبدار بری اور بحری فوجوں کو قائم کرنے کے لیے بخوشی رضامند ہو جائیں گی۔ ہندوستان کے دفاع کے لیے اس قسم کی غیر جانبدار فوجی طاقت مغلیہ دور حکومت میں موجود تھیں۔ اکبر کے زمانہ میں ان تمام سرحدی فوجوں کے افسر ہندو تھے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ ہندوستان کے وفاق پر مبنی ایک غیر جانبدار ہندوستانی فوج کے قیام سے مسلمانوں کی حب الوطنی میں اضافہ ہوگا۔''

علامہ نے اصل میں مسلم لیگ کے سرکاری موقف کے بارے میں کہ برصغیر میں ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق قائم کیا جائے یہ خطبہ بہت تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ آپ نے اس میں صوبوں کی ازسرنو حد بندی کا جو مطالبہ کیا وہ بھی مسلم لیگ پہلے سے کر رہی تھی۔ اس خطبے میں آپ نے ایک جگہ سندھ اور بلوچستان کو باہم ضم کر کے ایک صوبہ بنانے کی بھی تجویز دی۔ آپ نے نہرو رپورٹ کی مجوزہ وحدانی طرز کی مضبوط مرکز کی حکومت کی مخالفت کی اور کہا کہ ''مسلمانوں کو اس وقت تک فائدہ نہیں ہوسکتا جب تک انہیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں تمام اختیارات مع البقیکے ساتھ اکثریت کے حقوق حاصل نہ ہوں اور وفاقی مجلس قانون ساز میں 33 فیصد نشستیں نہ ملیں۔'' آپ نے مسلم اکثریت پر مبنی خودمختار ریاستوں یعنی صوبوں کے بارے میں یہ بھی کہا کہ ''ہندوؤں کے دلوں میں یہ خدشہ نہیں ہونا چاہیے کہ خودمختار مسلم ریاستوں کے قیام سے ان علاقوں میں ایک طرح کی مذہبی حکومتیں قائم ہو جائیں گی۔'' آپ نے اس کے لیے ٹائمز آف انڈیا کے اداریے کے حوالے سے بتایا کہ ''باوجودیکہ اسلام میں سود لینا حرام ہے، مسلم دور حکومت میں ہندوستانی مسلم ریاستوں نے شرح سود پر پابندی نہیں لگائی تھی۔''(2)

ان اقتباسات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال نے اس خطبہ میں مسلمانوں کے علیحدہ وطن یعنی Soveeign State کے قیام کا کوئی تصور پیش نہیں کیا تھا۔ خود علامہ نے 1934ء میں اس کی تردید فرمائی جس کی تفصیل کچھ یوں ہے:

32-1930ء کے دوران گول میز کانفرنسوں کے انعقاد کے دوران کیمبرج کے طلبہ کے گروپ نے چودھری

رحمت علی کی قیادت میں پمفلٹ شائع کیا جس میں پاکستان کے نام سے شمالی مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کے ملک کا نقشہ شائع کیا گیا تھا۔1934ء میں علامہ اقبال کی کتاب رموز خودی کے انگریزی ترجمے پران کے پروفیسر ای۔ جے۔ تھامپسن نے تبصرہ کرتے ہوئے علامہ کے تعارف میں آپ کے خطبہ الہ آباد کو چودھری رحمت علی کی پاکستان کی تجویز سے منسلک کر دیا۔آپ نے یہ تبصرہ پڑھا تو جواب میں جو خط لکھا وہ پروفیسر تھامپسن کے خطوط کے مجموعہ میں شامل ہے جسے علی گڑھ یونیورسٹی نے شائع کیا ہے۔آپ نے اس میں لکھا ''۔۔۔آپ نے ایک غلطی کی ہے جس کی میں فوری نشاندہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔کیونکہ یہ ایک فاش غلطی ہے۔آپ نے میرے بارے میں کہا ہے کہ میں اس سکیم کا حامی ہوں جسے پاکستان کہا جاتا ہے۔جبکہ پاکستان میری سکیم نہیں ہے۔میں نے اپنے خطبے میں جو تجویز پیش کی تھی وہ ایک مسلم صوبہ کے بارے میں تھی۔جو شمالی مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریتی آبادی پر مشتمل تھا۔میری سکیم کے مطابق یہ نیا صوبہ مجوزہ انڈین فیڈریشن کا حصہ ہوگا۔پاکستان سکیم میں مسلم صوبوں پر مشتمل ایک علیحدہ فیڈریشن کا قیام تجویز کیا گیا ہے۔۔۔۔اس سکیم نے کیمبرج میں جنم لیا ہے۔''(3)

یہ امر بھی خالی از دلچسپی نہیں ہے کہ خود قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے کسی بیان میں اور مسلم لیگ نے اپنی کسی سرکاری قرارداد میں کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا تصور پیش کیا تھا۔1938ء میں علامہ اقبال کا انتقال ہوا۔دسمبر 1938ء کو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ پٹنہ میں اس سال کے دوران وفات پانے والی تین معتبر شخصیات مولانا شوکت علی، کمال اتاترک اور علامہ اقبال کے بارے میں قائداعظم نے اپنے صدارتی خطبہ کے اختتام پر تعزیتی الفاظ کہے۔آپ نے علامہ کے بارے میں فرمایا:

"His death too is an irreparable loss to Muslim India. He was personal friend of mine and a singer of the finest poetry in the world. He will live as long as Islam will live. His able poetry interprets the true aspiration of the Muslims of India. It will remain an inspiration for us and for generations after us".(4)

ترجمہ: ''اِن کی وفات مسلم ہند کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے۔وہ میرے ذاتی دوست تھے۔اور دنیا کی عمدہ ترین شاعری کے مغنی تھے۔وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ ہے۔آپ کی پرمغز شاعری مسلمانانِ ہند کی امنگوں کی سچی ترجمانی کرتی ہے۔یہ شاعری ہمارے لئے اور ہمارے بعد کی نسلوں کے لئے ولولہ مہیا کرتی رہے گی۔''

آپ نے ان کی شاعری، اسلام سے وابستگی اور ذاتی دوستی کے حوالے سے خراج تحسین پیش کیا۔علامہ کے بارے میں بطور سیاست داں یا فلسفی کے کچھ نہیں کہا۔اور مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے تصور کے خالق کا تو دور دور کوئی ذکر نہیں ہے۔اسی اجلاس میں مسلم لیگ نے تعزیتی قرارداد بھی منظور کی۔اس میں بھی آپ کو اسلام کے سنجیدہ فلسفی "a sage philosopher of Islam" اور عظیم قومی شاعر "great national poet" کی حیثیت سے خراج تحسین پیش کیا گیا۔(5) گویا گزشتہ 8 سال سے لیگ کو یہ علم نہیں تھا کہ علامہ نے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا

تصور پیش کر رکھا ہے اور اس حوالے سے آپ کا اعتراف کیا جانا چاہئے۔حقیقت یہ تھی کہ ایسا تھا ہی نہیں۔

مارچ 1940ء میں لاہور کا مسلم لیگ کا اجلاس جس میں پہلی بار مسلم لیگ نے مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں پر مبنی مکمل آزاد مملکتوں Sovereign States کے قیام کا مطالبہ کیا، اس جلسے میں قائداعظم سمیت کسی مقرر نے علامہ اقبال کا ذکر تک نہیں کیا۔چہ جائیکہ ان کے تصور پاکستان کے خالق کی حیثیت سے کوئی ذکر کیا جاتا۔حالانکہ جس جگہ پر جلسہ ہو رہا تھا وہاں سے نصف کلومیٹر سے بھی کم فاصلے پر علامہ اقبال کا مزار ان دنوں زیر تعمیر تھا۔یہاں یہ بتانا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ قائداعظم نے اپنی طویل افتتاحی تقریر میں مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے مطالبے کی حمایت میں ماضی کا جو حوالہ دیا وہ پنجاب کے مہاسبھائی لیڈر لالہ لاجپت رائے کا تھا جس نے 1924ء میں اخبار ٹریبیون میں اپنے ایک مضمون میں برصغیر کی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کی سکیم پیش کی تھی۔غالباً یہ برصغیر میں پہلی بار تھا کہ ایسی کوئی سکیم پیش کی گئی تھی۔اس کی سکیم یہ تھی کہ ''مسلمانوں کی چار ریاستیں ہوں گی۔(1) پٹھانوں کا صوبہ یا شمال مغربی سرحد۔(2) مغربی پنجاب (3) سندھ اور (4) مشرقی بنگال۔یہ متحدہ ہندوستان نہیں ہوگا۔ہندوستان واضح طور پر مسلم انڈیا اور غیر مسلم انڈیا میں تقسیم ہوگا۔'' (6)

قائداعظم نے مارچ 40ء کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے انہی دنوں چھپی اندر پرکاش کی کتاب نکالی جس میں لالہ لاجپت رائے کا ایک خط شامل تھا جو اس نے 16 جون 1925ء کو کانگرس کے صدر سی۔آر۔داس کو لکھا تھا۔قائداعظم نے یہ پورا خط پڑھ کر سنایا جس میں لاجپت رائے نے جو لکھا اس کا لب لباب یہ تھا کہ ''میں مسلمانوں کی تاریخ اور فقہ پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہندو اور مسلمان اکٹھے نہیں رہ سکتے۔آپ کو ہمارے لیے کوئی راہ نجات نکالنی چاہیے۔'' (7)

مولوی اے کے فضل الحق نے قرارداد پیش کی تو اس کی تائید میں چودھری خلیق الزمان کے علاوہ مولانا ظفر علی خان نے بھی تقریر کی۔ان کے علاوہ جن اصحاب نے تقریر کی ان میں سردار اورنگ زیب (سرحد)، سر عبداللہ ہارون (سندھ)، نواب محمد اسماعیل (بہار)، محمد عیسیٰ خان (بلوچستان)، عبدالحمید خاں (مدراس)، اسماعیل چندریگر (بمبئی)، عبدالرؤف شاہ (سی پی) اور ڈاکٹر محمد عالم شامل تھے۔ڈاکٹر عالم نے کہا کہ ایسی ہی سکیم غدر پارٹی کے بھائی پرمانند نے 1914-15ء میں بھی پیش کی تھی۔(8) لاہور کے رہنے والے مولانا ظفر علی خان سمیت کسی نے بھی حوالہ نہ دیا کہ مسلمانوں کے علیحدہ وطن کا تصور علامہ اقبال نے 10 سال پہلے پیش کیا تھا۔میں نہیں سمجھتا کہ ان لوگوں کی یادداشت کمزور تھی۔حقیقت یہ تھی کہ ایسا ہوا ہی نہیں تھا۔

میں نے 1940ء سے 1947ء میں قیام پاکستان تک مسلم لیگ کے تمام اجلاسوں کی کارروائیاں بغور مطالعہ کیا۔1942ء میں مسلم لیگ نے لفظ پاکستان کو قرارداد لاہور کے ساتھ منسلک کرلیا۔پھر 1945-46ء کے انتخابات میں مطالبہ پاکستان مسلم لیگ کا انتخابی منشور کا حصہ بن گیا۔لیکن ان سات برس کی تمام کارروائیوں میں

کسی ایک جگہ بھی اس مطالبے کے ساتھ علامہ اقبال کو منسوب نہیں کیا گیا۔ حالانکہ 1943ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی میں انور قریشی نے جلسہ کے شروع میں ترانہ ''چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا'' پڑھ کر سنایا اور اسی اجلاس میں جی ایم سید نے اپنی تقریر میں علامہ اقبال کے اشعار کا استعمال کیا۔ اور پھر قائداعظم نے صدارتی تقریر کی۔ مگر علامہ کا تصور پاکستان کے خلاق کے طور پر کسی نے ذکر نہ کیا۔(9) 1947ء میں قیام پاکستان کے وقت اور اس کے بعد اپنے انتقال ستمبر 1948ء تک اپنے کسی بیان میں قائداعظم کی جانب سے اس کا اظہار نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اس دوران 21 اپریل 1948ء کو یوم اقبال بھی آیا جسے اس وقت تک سرکاری طور پر نہیں منایا جاتا تھا۔ لوگ اپنے طور پر منایا کرتے تھے۔

یہ بات تحقیق طلب ہے کہ اقبال کو تصور پاکستان کے خالق کے طور پر کب اور کہاں شروع کیا گیا۔ غیر سرکاری طور پر پنجاب کے مسلم لیگی حلقوں میں 46-1945ء کے انتخابات میں اس کا ذکر شروع کر دیا گیا تھا۔ اس میں اخبار نوائے وقت پیش پیش تھا۔ لیکن سرکاری طور پر پاکستان کی اسٹبلشمنٹ نے یہ سلسلہ بہت بعد میں شروع کیا۔ اس سلسلے میں اہم کردار پنجابی بیوروکریسی نے ادا کیا جس کے سرغنہ چوہدری محمد علی، سیکرٹری جنرل حکومت پاکستان اور وزیر خزانہ ملک غلام محمد تھے اور میڈیا میں حمید نظامی کا ادارہ نوائے وقت جو دراصل پنجابی شاونزم کا ترجمان تھا اور پنجابی فوج اور افسر شاہی کی سیاسی نظریہ سازی کیا کرتا تھا۔ ان پنجابی شاونسٹوں کی سیاسی ترجمانی نواب مشتاق گورمانی اور نواب افتخار حسین ممدوٹ کرتے تھے، اس کے علاوہ اردو بولنے والوں میں خود وزیراعظم لیاقت علی خان اور وزراء ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بھی نظریہ سازی کے لئے اقبال کو استعمال کرنے کا کام شروع کر چکے تھے۔ قیام پاکستان پر دو اہم کتابیں شائع ہوئیں۔ ایک چوہدری محمد علی کی Emergence of Pakstan اور دوسری ڈاکٹر اشتیاق حسین اقریشی کی The Struggle for Pakistan۔ ان دونوں حضرات نے نظریہ پاکستان کی مذہبی بنیادوں پر اسلامی نظام کی تجربہ گاہ کے تھیسیس کو پروموٹ کیا۔ پنجابی اور مہاجر شاونسٹوں دونوں کی یہ سیاسی ضرورت تھی۔ مہاجروں کا زمین سے کوئی رشتہ نہیں تھا اس لئے وہ جغرافیائی سرحدوں کے بجائے نظریاتی سرحدوں کے نام پر یہاں اپنی سلطنت قائم کرنا چاہتے تھے۔ پنجابی بنگالیوں کے مقابلے میں اپنی عددی کمی کو کسی بھی سیکولر ریاست کے ڈھانچے میں جو قائداعظم کے دستور سازی کے تصور پر مبنی ہوتی ایک غالب قوت میں نہیں بدل سکتے تھے۔ چنانچہ نظریہ پاکستان کی ان کو بھی بڑی شدید ضرورت تھی جس کے لئے پنجابی علامہ اقبال سب سے موزوں شخصیت ہو سکتے تھے۔

1938 میں سندھ مسلم لیگ پراونشل پارٹی نے جی۔ ایم۔ سید اور مولانا عبدالمجید سندھی کی قیادت میں یہ قرارداد پہلی بار منظور کی تھی کا مسلمانوں کا الگ وطن ہونا چاہئے۔ لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا کیونکہ جی ایم سید کے قایداعظم کے ساتھ 46 کے انتخابات کیلئے انتخابی ٹکٹوں کی تقسیم پر اختلاف ہوا اور سید ہمیشہ کے لئے لیگ کا مخالف

ہو گیا یہاں تک کہ بعد میں قیام پاکستان کا بھی مخالف ہو گیا۔ تاہم تاریخی حقیقت کے طور پر سندھ پراونشل مسلم لیگ کی قراداد جو 40 سے پہلے اور لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنی نوعیت کی پہلی قرارداد تھی، ان نظریہ سازوں کو کبھی نظر نہ آئی کیونکہ یہ سندھ سے آئی تھی اور نظریہ سازی اپنے اپنے مفاد کے لئے پنجابی اور مہاجر کر رہے تھے۔

یہ تاریخی مغالطہ دور کرنا ضروری تھا اس لیے بحث بہت دور تک چلی گئی۔ بتانا صرف یہ تھا کہ قیام پاکستان نظریوں یا تصورات یا خوابوں کے نتیجے میں وجود میں نہیں آیا تھا۔ یہ خواب اور نظریئے بعد کی پیداوار ہیں۔ پاکستان دراصل برصغیر میں ہندو۔ مسلم۔ انگریز کی جدلیات کی مثلث میں جو کشمکش چل رہی تھی، اس کے نتیجے میں ایک انجام تک پہنچا تھا۔ قائداعظم کے دوقومی نظریئے یا تھیوری کو بھی ان نظریہ سازوں نے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی مسئلے کو ایک ڈھیلے ڈھالے آل انڈیا وفاق میں رہتے ہوئے حل کرنے کو تقسیم کے مقابلے میں ترجیح دی تھی اور آخر وقت تک اس کے لئے کوشش کرتے رہے۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

دوسری عالمی جنگ کے اختتام تک انگریزوں کا دیوالیہ ہو چکا تھا۔ اور انگریز نے برصغیر سے بستر گول کرنے کا بگل بجا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہندو۔ مسلم۔ انگریز کی جدلیات کی مثلث کی کشمکش تیز ہو گئی تھی۔ ان تینوں کی ترجیحات یہ تھیں:

1- انگریز: ہر قیمت پر برصغیر کو متحد اکائی کے طور پر چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے ڈیڑھ سو برس کی کوشش سے جو سول اور فوجی ڈھانچہ کھڑا کیا تھا وہ اسے متحد اس لیے چھوڑنا چاہتے تھے کہ عالمی جنگ کے اختتام پر سوویت یونین اور ابھرتا ہوا چین کا کمیونسٹ انقلاب برصغیر میں داخل نہ ہو سکے کہ اس کے بعد خلیج، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید اور افریقہ تک اس کا راستہ روکنا بہت مشکل ہو جاتا۔

2- ہندو: کانگرس کے سیکولرازم کے بینر کے تحت پورے برصغیر پر مضبوط مرکزی حکومت کے ذریعہ مکمل اور بلاشرکت غیرے کنٹرول حاصل کرنا چاہتے تھے۔

3- مسلمان: ہر حال میں مسلم اکثریتی صوبوں کو ہندوؤں یعنی کانگرس کے مضبوط مرکزی کنٹرول سے آزاد رکھنا چاہتے تھے اور کم از کم مکمل علاقائی خودمختاری چاہتے تھے۔

یہ کشمکش 1944ء میں لارڈ ویول کی جانب سے گاندھی۔ جناح ملاقاتوں کے اہتمام اور پھر تمام رہنماؤں کی شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد اس وقت نئے موڑ میں داخل ہو گئی جب نئی لیبر حکومت کے وزیراعظم ایٹلی نے 46-1945ء میں انتخابات کا اعلان کر دیا اور 48ء میں انتقال اقتدار کی تاریخ دے دی۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ تمام صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بن کر ابھری۔ مارچ 46ء میں حکومت برطانیہ نے انتقال اقتدار کا فارمولا طے کرنے کے لیے تین وزیروں لارڈ پیتھک لارنس، سٹیفرڈ کرپس اور

اے۔وی۔الیگزینڈر کو ہندوستان بھیجا۔انہوں نے تین ماہ تک تمام سیاسی رہنماؤں کے ساتھ طویل مذاکرات کیے اور بالآخر مئی 46ء میں ایک آئینی منصوبہ پیش کیا۔ جسے وزارتی مشن منصوبہ کہا جاتا ہے۔اس میں دستور ساز اسمبلی بنانے کا خاکہ دیا گیا تھا اور جن سیاسی جماعتوں کو یہ قبول تھا انہیں عبوری حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔دستور سازی کا خاکہ تین گروپوں یا زونوں پر مشتمل تھا۔جن میں ان صوبوں کو شامل کیا گیا تھا۔

گروپ A۔مدراس، بمبئی، یوپی، بہار، سی پی، اڑیسہ۔

گروپ B۔پنجاب، سرحد، سندھ

گروپ C۔بنگال، آسام۔

یہ ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کی سکیم تھی جس میں مرکز کے پاس دفاع، خارجہ، مواصلات اور ان محکموں کے لیے درکار آمدنی کے حصول کے اختیارات تھے۔ باقی سب اختیارات گروپ (زون) اور صوبائی سطح پر منتقل (Devolve) کردیئے گئے تھے۔اسے گروپنگ سکیم یا زونل سکیم کہا جاتا تھا۔اس آئینی منصوبے کے دیباچہ میں پاکستان کی سکیم کو ناقابل عمل قرار دے کر رد کر دیا گیا تھا۔تاہم جناح نے باوجود اس کے کہ لیگ نے مطالبہ پاکستان پر انتخاب جیتا تھا۔مسلم لیگ کی طرف سے اس منصوبے کو منظور کرلیا۔اور انہوں نے کہا کہ یہ ہی پاکستان ہے۔یاد رہے کہ ایک اور نعرے کو نظریہ سازوں نے استعمال کیا ہے کہ' پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'۔اور یہ کہا جاتا ہے کہ یہ نعرہ گلی گلی اور مسلم لیگ کے ہر جلسے میں لگایا جاتا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ یہ نعرہ فقط ایک مرتبہ لگا اور وہ مسلم لیگ کا جلسہ نہیں تھا بلکہ جمعیت المشائخ کے جلسہ منعقدہ موچی دروازہ لاہور میں پیر جماعت علی شاہ نے مسلم لیگ کی 46 کے انتخابات میں حمایت کیلئے لگایا تھا۔یہ نعرہ یا اس سے ملتا جلتا کوئی نعرہ مسلم لیگ کے کسی جلسہ میں یا کسی رسمی اجلاس میں یا قرارداد میں شامل نہیں ہوا۔مشائخ یا صوفیا جو عوام الناس کے زیادہ قریب تھے پاکستان کے حامی تھے جبکہ ملاؤں کی مذہبی سیاسی جماعتیں اس کی بڑھ چڑھ کر مخالفت کر رہی تھیں۔مجلس احرار، جمیعت علمائے ہند، جماعت اسلامی، آل انڈیا شیعہ کانفرنس، آل انڈیا مومن کانفرنس، خاکسار تحریک شامل تھے۔ایک احراری ملا مظہر علی اظہر جلسوں میں یہ شعر پڑھا کرتا تھا۔

اک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا　　یہ قائداعظم ہے کہ ہے کافراعظم

تاہم 46 کا انتخاب پاکستان کے نام پر جیتنے کے باوجود قایداعظم وزرتی مشن منصوبہ کی مجوزہ زونل یا گروپنگ پر مبنی کل ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے آئین کو قبول کر چکے تھے۔لیکن کانگرس نے دستور ساز اسمبلی کے قیام اور انتقال اقتدار کی باقی سب شقوں کو تو منظور کرلیا مگر گروپنگ سکیم یا زونل سکیم کو رد کر دیا۔مسلم لیگ جو کسی مخصوص نظریے کے تجربے کے لیے مملکت کے حصول پر کام نہیں کر رہی تھی بلکہ وہ اب بھی ہندوستان کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کو قبول کر رہی تھی، کو شدید مایوسی ہوئی۔اس پر کانگرس کے صدر ابوالکلام

آزاد کو بھی بہت مایوسی ہوئی تھی کیونکہ آزاد کے مطابق یہ ایک بہترین حل تھا مگر اس منصوبے کو نہرو نے سبوتاژ کر دیا تھا۔حقیقت یہ تھی کہ گاندھی اور پٹیل بھی اسے سبوتاژ کرنے میں برابر کے شریک تھے۔اصل بات یہ تھی کہ کانگرس ڈھیلے ڈھالے وفاق کے بجائے مضبوط مرکز کے ذریعے ہندوستان پر گرفت مضبوط کرنا چاہتی تھی۔اگرچہ اس نے مشن منصوبہ مکمل منظور نہ کیا تھا مگر اسے عبوری حکومت میں شامل کرلیا گیا۔

کانگرس کی طرف سے گروپنگ سکیم کے رد کیے جانے کے بعد مسلم لیگ نے بھی اپنے فیصلے کو واپس لے لیا اور ڈائریکٹ ایکشن کا اعلان کر دیا۔16 اگست کو ڈائریکٹ ایکشن ڈے منایا گیا۔اور پورے برصغیر میں ہندو۔مسلم فسادات پھوٹ پڑے۔صرف کلکتہ میں تین دن میں پچاس ہزار سے زائد افراد ہلاک و زخمی ہوئے۔اور پھر یہ سلسلہ نہ رک سکا۔تین چار ماہ تک نوا کھلی سے لے کر بہار اور گڑھ مکتیشر تک خون کے دریا بہا دیئے گئے۔ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے ہزاروں افراد لقمہ اجل بن گئے۔

مسلم لیگ جسے عبوری حکومت سے اس لیے باہر رکھا گیا تھا کہ اس نے مشن منصوبہ کی منظوری واپس لے لی تھی۔مگر فسادات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال کی وجہ سے اکتوبر 46ء میں لیگ کو بھی عبوری حکومت میں شامل کرلیا گیا۔اس حکومت میں آئے دن کانگرس اور لیگ کے وزراء کے مابین چپقلش جاری رہتی تھی۔

دسمبر 46ء تک برطانوی حکومت اور کانگرس میں یہ طے پا گیا کہ انتقال اقتدار کانگرس کی Terms پر کر دیا جائے گا۔لارڈ ویول جو ابھی تک وزارتی مشن منصوبے پر عملدرآمد کی کوشش کر رہا تھا اور کانگرس کو انتہائی ناپسند تھا، برطرف کر دیا گیا۔اس کی جگہ کانگرس کی منشاء سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے تقرر کا اعلان کر دیا گیا۔جناح نے مشن منصوبے کی مجوزہ گروپنگ سکیم کو بچانے کے لیے ایک آخری کوشش کے طور پر دسمبر 46ء میں لندن کا دورہ کیا۔وہ اسے خونریز مسلم کش فسادات کے باوجود اب بھی متحدہ ہندوستان کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کو پاکستان کی سکیم سے بہتر سمجھتے تھے۔لیکن اس ضعیف العمری اور سخت سردی میں دسمبر کے لندن دورے کے دوران برطانوی حکام نے انہیں بتا دیا کہ گروپنگ سکیم اب قصہ پارینہ ہو چکی ہے۔اس دوران نہرو بھی مختصر دورے پر لندن بلایا گیا تھا۔

مارچ 47ء میں نیا وائسرائے ماؤنٹ بیٹن انتقال اقتدار کے آخری راؤنڈ کے لیے دہلی پہنچا۔اس کا رویہ جناح اور لیگی رہنماؤں کے ساتھ انتہائی رعونت آمیز اور معاندانہ تھا جبکہ کانگرسی رہنماؤں خصوصاً نہرو کے ساتھ بہت گہرے تعلقات تھے۔اس نے اپریل اور مئی دو ماہ میں حالات کا جائزہ لیا اور تمام سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں۔وہ ان ملاقاتوں میں پاکستان کے لیے پاگل پاکستان کا لفظ استعمال کیا کرتا تھا۔اس لیے کہ جو پاکستان وہ دینا چاہتا تھا وہ ایک کٹا پھٹا پاکستان تھا۔

یکم مئی 47ء کو کانگرسی مجلس عاملہ نے برصغیر کی تقسیم کی منظوری دے دی۔جس میں پنجاب اور بنگال کو بھی تقسیم

کیا گیا تھا۔ منقسم پنجاب اور منقسم بنگال پر مبنی پاکستان کو قائداعظم ہمیشہ نامنظور کیا کرتے تھے۔ وہ اسے کٹا پھٹا، کرم خوردہ اور ناقابل عمل قرار دیتے تھے۔ کانگرس بھی ایسا ہی سمجھتی تھی اور ایک کمزور پاکستان دے کر وہ باقی پورے ہندوستان پر ایک مضبوط مرکز کے تحت کنٹرول حاصل کرنے جا رہی تھی۔ اس سلسلہ میں 10-7 مئی کے دوران ماؤنٹ بیٹن اور نہرو شملہ چلے گئے۔

تقسیم کے منصوبے کا ڈرافٹ ڈومینین کی بنیاد پر شملہ کے سیسل ہوٹل میں وی۔ پی مینن نے ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کی ہدایات کے مطابق تیار کیا۔ یہ بھی فیصلہ کر لیا گیا کہ انتقال اقتدار 48ء کے بجائے اگست 47ء میں ہی کر دیا جائے گا۔ تقسیم کی ساری تفصیل، باؤنڈری لائن تک نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کے مابین طے ہوئی۔ جس کی منظوری ماؤنٹ بیٹن لندن سے لے کر آیا اور 3 جون 47ء کو پارٹیشن ایوارڈ کا اعلان کر دیا گیا۔(10)

قائداعظم کے پاس اسی پاکستان کو قبول کر لینے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا جسے وہ ہمیشہ کٹا پھٹا، کرم خوردہ اور ناقابل عمل قرار دیا کرتے تھے۔ تاہم انہوں نے ایک کوشش اور کی کہ پنجاب اور بنگال تقسیم نہ ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ کلکتہ کے بغیر مشرقی بنگال معاشی طور پر چل نہیں سکے گا۔ انہوں نے سکھ رہنماؤں کو بہت یقین دہانی کرائی اور گیانی کرتار سنگھ مان بھی گیا مگر ماسٹر تارا سنگھ نہ مانا اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ البتہ بنگال کی تقسیم روکنے کی جو کوشش ہوئی اس میں قدرے کامیابی کی امید پیدا ہوئی۔ حسین شہید سہروردی جو متحدہ بنگال کے مسلم لیگی وزیر اعلیٰ تھے، قائداعظم کی اشیر باد سے بنگال کے فارورڈ بلاک کے رہنما سرت چندر بوس اور بنگال پراونشل کانگرس کے صدر کرن شنکر رائے کو بنگال کو متحد رکھنے پر قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تجویز یہ تھی کہ متحدہ بنگال ایک الگ تیسرا آزاد ملک بن جائے۔ سہروردی نے بنگال کے رہنماؤں کو قائل کرنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن کو اس تجویز سے آگاہ کیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے پوچھا کہ جناح کی اس بارے میں کیا رائے ہے تو سہروردی نے بتایا کہ یہ ان کی اشیر باد سے ہی طے ہوا ہے۔ اس کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے جناح کے ساتھ ملاقات میں ان سے اس بابت دریافت کیا تو جناح بولے کہ ''ہمیں آزاد متحدہ بنگال کے بننے پر خوشی ہوگی۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ان کے ساتھ بہت اچھے تعلقات ہوں گے۔'' یاد رہے متحدہ بنگال کی اس ریاست کا نام سوشلسٹ ری پبلک آف بنگال تجویز کیا گیا تھا۔ لیکن گاندھی، نہرو اور پٹیل نے بنگال کانگرس کی قیادت کو سہروردی کے ساتھ اس قسم کی تجویز پر اتفاق کرنے پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔(11)

یہ ظاہر ہوا کہ قائداعظم کسی مخصوص نظریے کی تجربہ گاہ کے لیے ملک بنانے نہیں جا رہے تھے۔ وہ اس وقت ہی آزاد اور متحدہ بنگال (یعنی بنگلہ دیش) بنانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ وہ ایک حقیقت پسند praggmatic سیاست دان تھے۔ وہ کسی تھیوکریٹک ریاست کے قیام کے سخت خلاف تھے۔ جب 14 اگست کو ملک کا قیام عمل میں آیا، تو ان کے ہر بیان اور ہر عمل سے یہ بات ظاہر ہوئی۔ مگر بنگال اور پنجاب کی تقسیم نہ رک سکی۔ باؤنڈری کمیشن محض

برائے نام بنایا گیا تھا۔ لکیر کہاں ڈالی جائے گی یہ فیصلہ نہرو اور ماؤنٹ بیٹن پہلے ہی کر چکے تھے۔ لیکن باؤنڈری کمیشن کے ایوارڈ کا اعلان دونوں ملکوں کے وجود میں آنے کے بعد 17 اگست کو ہوا۔ مشرقی پنجاب بالخصوص وہاں کے دیہاتوں میں رہنے والے مسلمانوں کو یہ پتہ ہی نہ تھا کہ ان کا علاقہ پاکستان میں ہوگا۔ ان پر اچانک سکھوں کے حملوں سے جو قیامت ٹوٹی اس سے معلوم پڑا کہ وہ دشمن کے علاقے میں ہیں۔ پنجاب کے دونوں حصوں میں جو قتل عام، خونریزی اور تباہی ہوئی اس کی تفصیل سے آپ سب واقف ہیں۔ لیکن صرف یہ کہوں گا کہ پنجاب کے دونوں طرف کے لوگوں کا یہ چوائس نہیں تھا کہ یہ خونریزی ہو۔ ان پر تاریخ کی جدلیات کا جبر ٹوٹا تھا جس سے بچنا شاید ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ کانگرس کی تنگ نظر قیادت اور برطانوی سامراج تھوڑی دانش مندی کا مظاہرہ کرتے اور ڈھیلے ڈھالے وفاق پر مبنی گروپنگ سکیم کے تحت انتقال اقتدار کر دیتے تو یہ عذاب نہ ٹوٹتا اور ضلع گورداسپور اور فیروز پور میں غیر منصفانہ طریقے سے باؤنڈری ڈال کر مسئلہ کشمیر کی شکل میں ایک ناسور پیدا کیا گیا، اس سے بھی نجات مل جاتی۔ دونوں ملک Security Stataes کی حیثیت سے اپنا اربوں ڈالر کا بجٹ دفاع پر خرچ کر رہے ہیں شاید اس سے بھی بچت ہو جاتی۔

تقسیم کے بعد بھی برصغیر میں قوتوں کے مابین کشمکش کی جدلیات بدستور جاری رہی۔ ہندو مسلم تضاد' پاک بھارت تنازعہ کی شکل اختیار کر گیا۔ دونوں ملکوں کے مابین تین جنگیں ہوئیں۔ ایٹمی دوڑ شروع ہوئی۔ اُدھر سے اگنی اور پرتھوی داغے جاتے، ادھر سے غزنوی اور غوری۔ پاکستان کے اندر، جو بنیادی طور پر صوبائی خودمختاری کی تحریک کی بدولت وجود میں آیا تھا، جب یہاں ''نظریہ پاکستان'' اور ''نظریاتی تجربہ گاہ'' کا نام لے کر ان صوبائی حقوق کو سلب کر لیا گیا تو پھر یہ جدلیات اگلے مرحلے میں داخل ہو کر 71ء میں ایک اور تقسیم کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ جس طرح ''انڈین نیشنلزم'' کا نظریہ 1947ء کی تقسیم کو نہیں روک سکا تھا، ویسے ہی ''نظریہ پاکستان'' 71ء کی تقسیم کو نہ روک سکا۔ 47ء سے پہلے انڈین نیشنلزم کے علمبردار کہتے تھے، کوئی ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی نہیں سب ہندوستانی ہیں اور یہ کہہ کر وہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق کی نفی کرتے تھے ویسے ہی قیام پاکستان کے بعد کہا گیا کہ کوئی بنگال، سندھی، بلوچی، پٹھان اور پنجابی نہیں، سب پاکستانی اور مسلمان ہیں اور یہ کہہ کر بنگالیوں، سندھیوں، بلوچوں اور پٹھانوں کے حقوق کی نفی کی گئی۔ مگر تاریخ کی جدلیات نے ثابت کیا کہ نظریے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، جدلیاتی قوتیں اپنا راستہ بنا لیتی ہیں اور تاریخ آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس مرتبہ پاکستان کے یوم آزادی پر بلوچستان میں کالے جھنڈے لہرائے گئے ہیں۔ ادھر کشمیر میں ہمیشہ کی طرح پاکستانی جھنڈے لہرائے گئے ہیں۔ آج پاکستان بلکہ پاکستان اور ہندوستان کے حکمرانوں کو نظریئے کے شکنجے سے نکل کر حالات کی جدلیات کی حقیقت کا ادراک کرنا چاہیے۔ ورنہ سرحدیں اور ملک نظریوں کے مرہون منت نہیں ہوا کرتے۔

حواشی

1- Al-Beruni, Abu Rehan, Indica, Translated by Edward Sachau, Munshiram Manoharlal Publishers, New Delhi, 3rd Edition 1992, pp.17-24.

2- (i) For complete orignal in English of Allama Iqbal's presidentiall address in the Annual Session All India Muslin League at Allahabad, December 1930, See.

(i) Foundations of Pakistan, All India Muslim League Documents: 1906-1947, Edited by Syed Sharifuddin Pirzada, Vol II (1924-47), National Publishing House, Karachi, 1970, pp. 154-171.

(ii) Syed Abdul Vahid, Thoughts and Reflecttions of Iqbal, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1973, pp.161-194

(iii) اردو میں علامہ اقبال کے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد، 1930ء کے خطبہ صدارت کا مکمل متن دیکھئے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ جلد 5۔ مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء (1849-1947ء)۔ زاہد چودھری/حسن جعفر زیدی۔ ادارہ مطالعہ تاریخ۔ 1991ء۔ ص ص 395-417

3- S.Hassan Ahmad, Iqbal: His Political Ideas at Cross Roads, Print Well Publications, Aligarh 1979, p.80 (p.94)

اردو متن کے لیے دیکھئے۔ زاہد چودھری/حسن جعفر زیدی۔ محولہ بالا ص 418

4- Foundations of Pakistan, op, cit, see 26th session. Patna, 1938, p.303

5- Ilid . p 303

6- M.H. Saiyid, Mohammed Ali Jinnah, A Political Study, Elite Publisher, Karachi, 2nd Ed. Reprinted 1962, p.109

7- Foundation of Pakistan, op.cit, 27th session, Lahore 1940, pp. 335-336

8- Ibid. pp. 343-345

9- Ibid. pp. 442-448

10- 44ء سے 47ء تک انگریز، کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین جدلیات کی تفصیل جس میں مشن منصوبہ کی مجوزہ گروپنگ سکیم کے لئے قائداعظم محمد علی جناح کی کوششوں اور کانگرس کی جانب سے اسے ناکام بنا کر ایک مضبوط مرکز کے تحت ہندوستان کے وسیع علاقے پر اپنا اقتدار قائم کرنے کی خاطر تقسیم ہند کو اپنی منشا کے مطابق منوانے کی کانگرس کی کوششوں اور انگریزوں سے تعاون کی تفصیل کے لیے دیکھئے۔ زاہد چودھری/حسن جعفر زیدی۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ پاکستان کیسے بنا؟ دو جلدیں۔ ادارہ مطالعہ تاریخ لاہور۔ 1989ء۔

11- تفصیل کے لیے دیکھئے۔ زاہد چودھری/حسن جعفر زیدی۔ محولہ بالا۔ جلد 2 ص ص 281-278، 323-330

پروفیسر خادم علی ہاشمی (ملتان)

الکندی اور رمز شناسی ☆

الکندی اولین مسلمان سائنس دان و فلسفی تھا اسے شماریات (statics) اور رمز شناسی (Cryptography) کا بانی کہا جاسکتا ہے۔ ذیل میں اُس کے کام کے انہی پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔

الکندی 801ء (185ھ) میں کوفہ میں پیدا ہوا، اور 873ء میں اُس کی وفات بغداد میں خلیفہ المعتمد کے عہد میں ہوئی۔ اُس کا پورا نام ابو یوسف یعقوب بن اسحٰق بن الصباح بن عمران بن اسمٰعیل بن اشعث بن قیس الکندی ہے۔ اُس کا والد اسحٰق بن الصباح عباسی خلفاء المہدی اور الرشید کے عہد میں کوفہ کا گورنر تھا۔ الکندی ابھی کم عمر ہی تھا جب اُس کے والد کا 809ء میں انتقال ہوا، تاہم اُس نے ورثے میں دولت اور معتبر نام پایا۔ اُس زمانے میں بصرہ اور کوفہ تعلیم اور اسلامی کلچر کے اہم مراکز تھے چنانچہ اُس نے انہی شہروں میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اُس نے مروجہ نصاب کے مطابق قرآن کریم حفظ کیا، عربی صرف و نحو، نیز ابتدائی ریاضی کی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں اُس نے بغداد میں فقہ اور علم الکلام میں دسترس حاصل کی۔ تاہم اُس کا رجحان سائنس اور فلسفے کی جانب تھا اور اُس نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت انہی علوم کی ترویج و ترقی میں صرف کیا۔

الکندی کو عباسی خلیفہ مامون الرشید کے قائم کردہ بیت الحکمۃ میں ایک اہم عہدہ مل گیا جہاں اُس نے اپنی علمیت کی دھاک بٹھادی۔ اُس کے ہمعصروں میں بنوموسیٰ برادران، ابو معشر، الخوارزمی، الفرغانی، ابن ماسویہ ایسے علماء و فضلاء شامل تھے۔ بیت الحکمۃ میں اہل علم و دانش دنیا کے گوشے گوشے سے اکٹھے ہو گئے تھے، یہ دنیا میں اپنی نوعیت کی پہلی محفل تھی جہاں بلاتفریق نسل و رنگ اور مذہب و ملت علماء، سائنس دان، ریاضی دان، ہیئت دان، فلسفی، اور منجم اپنی اپنی پسند کے موضوعات پر تحقیق و تدوین میں مصروف تھے۔ یہاں یونانی، سُریانی، چینی، ہندی، مصری اور دیگر ممالک کے علوم کو عربی میں ڈھالا جا رہو تھا، قدما کے خیالات کو پرکھا جاتا، ان پر تنقید و تبصرہ کیا جاتا، نئی دریافتیں کی جاتیں اور پرانے علوم کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جاتا۔

الکندی ایک پُرنویس محقق تھا، اُس سے تقریباً 350 تصانیف منسوب کی جاتی ہیں جن میں سے صرف ساٹھ ستر دستیاب ہیں۔ اُس کی تصانیف فلسفہ، منطق، مابعد الطبیعیات، حساب، ہندسہ، موسیقی، فلکیات، طب، علم

النجوم، سیاست، اور دیگر متفرق موضوعات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ذیل میں ہم اُس کے رمزنویسی سے متعلق کام پر روشنی ڈالیں گے اور اس فن کی موجودہ کیفیت کا جائزہ لیں گے۔

رمزنگاری، رمزنویسی اور رمزشناسی (Cryptography and Cryptoanalysis):

اقوامِ عالم کی تاریخ میں رازداری کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی ہے، حکومتیں اور عوام بعض پیغامات اور اہم معلومات کو ایسے انداز سے متعلقہ افراد یا اداروں تک پہنچانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ اُن تک صرف وصول کنندہ ہی کی رسائی ہو اور وہ انہیں سمجھ بھی سکے۔ معلومات کو راز میں رکھنے کی یہ ضرورت اقوام، قبیلوں، سرکاری احکامات، زمانۂ جنگ وامن میں پیغام رسانی سے لے کر محبوب کو پیغام بھیجنے تک الغرض زندگی کے اکثر معاملات میں رہی ہے۔ اور دورِ جدید میں تو اس کی ضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے۔ یہی ضرورت خفیہ تحریروں کے فن کی موجد بنی، یعنی کوڈ کے ذریعہ پیغامات کو مخفی کرنے اور کوڈ تیار کرنے کا فن ایجاد ہوا۔ اس کے مقابلہ میں جاسوسی اور معلومات کے حصول کی ضروریات کوڈ کا توڑ نکالنے یعنی رمزشناسی کی تکنیکیں بھی وجود میں آئیں۔ مؤخرالذکر تکنیکیں کسی کوڈ یا مخفی رکھنے کے طریقے کی کسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتی ہیں، اور مخفی معلومات کو آشکار کرنے اور سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ ملٹری اور سفارتی امور میں رمزنگاری کی ایک طویل تاریخ ہے جو بابل کی تہذیب بلکہ اس سے بھی پہلے کی قبائلی زندگی کے دور سے چلی آ رہی ہے۔

پیغامات کو خفیہ رکھنے کی مثالیں انسانی تاریخ کے ہر دور میں ملتی ہیں۔ ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے تاریخ پر نمایاں اثرات بھی مرتب ہوتے رہے ہیں، مثال کے طور پر پیغامات اور معلومات کو راز میں رکھنے سے جنگوں کے نتائج متأثر ہوتے رہے ہیں یا حکمرانوں اور سلطنتوں کے عروج وزوال کا باعث بنتے رہے ہیں۔ دوسری عالمگیر جنگ (1939-45) میں جرمنی کے کوڈ Enigma کو توڑنے کا اتحادیوں کا کارنامہ بالآخر مؤخرالذکر کی جنگ میں فتح پر منتج ہوا۔ آج کے دور میں الیکٹرانک تجارت (electronic business)، مالیات مثلاً بنک اکونٹ کی رازداری وغیرہ میں رمزنویسی کا کمرشل اطلاق روز افزوں ہے۔ حساس معطیات مثلاً کریڈٹ کارڈ نمبر (credit card numbers) اور پرسنل شناختی نمبر (personal identity numbers - PINs) کی عموماً رمزیہ طور پر ترسیل ہوتی ہے۔ مماثل طور پر کمپیوٹر پروگرام کھولنے یا بعض فائیلوں کو کھولنے، یا ٹیلی فون پر بیرونِ شہر یا بیرونِ ملک رابطہ قائم کرنے کے لیئے رمزیہ کوڈ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ رمزنویسوں اور رمزشناسوں کے مابین ازلی مقابلے میں کوانٹم مکینکس (Quantum Mechanics) کا مضمون ایک نئے ہتھیار کے طور پر سامنے آیا ہے۔ مگر پہلے ہم الکندی کے بطور اولین رمزشناس کام پر نظر دوڑاتے ہیں۔

کسی پیغام کو مخفی کرنا یا رمزنگاری (steganography) کے ذریعہ سے مؤثر طور پر دشمنوں کی نظر سے بچا کر کسی اہم پیغام کو منزلِ مقصود تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ تاہم رمزنگاری کے مؤثر ہونے کا انحصار اُس کوشش پر ہے جس

کے ذریعہ پیغام یا معلومات کی رمزنگاری کی گئی ہے، نیز اس کا انحصار دشمن کے جاسوسی نظام کی مہارت، فہم اور اُس کی پیغام رسانوں کی تلاش اور اور ترسیل کے ذریعوں کی کھوج میں ثابت قدمی پر بھی ہے۔

رمزنویسی کے قدیم طریقے: اکثر وبیشتر رمزنویسی کے ذریعہ پیغامات کو مخفی رکھنا کافی ہوتا ہے، تاہم اس کی کامیابی کا انحصار بہت حد تک پیغام کے غنیم کو منکشف نہ ہونے پر بھی ہے، رمزنویسی کی اس واضح خامی کے باعث رمزنگاری (cryptography) کی ایجاد لازمی ہوگئی۔ رمزنگاری ایک ایسا طریقہ یا تکنیک ہے جس کے ذریعہ سے کسی پیغام یا معلومات کو اس انداز سے تبدیل کیا جاتا ہے کہ وہ مخاطب کے علاوہ ہر کسی کے لیئے بے معنیٰ ہو کر رہ جائے۔ یہ بنیادی طور پر دو طریقوں سے کیا جاتا ہے:

اولاً حروف یا الفاظ کی جملے میں ترتیب یا مقام تبدیل کر دینے سے یعنی transposition کے ذریعہ سے؛

ثانیاً حروف یا الفاظ کو دوسرے حروف یا الفاظ سے تبدیل کر کے، اسے substitution کا طریقہ کہتے ہیں۔

جملے میں الفاظ یا حروف کی ترتیب یا مقام بدلنے کے عمل کو مؤثر اور محفوظ بنانے کے لیئے الفاظ کے مقابلہ میں حروف کی ترتیب یا مقام کو بدلنا بہتر مانا گیا ہے۔ اس سے پیغام بے ربط ہو جاتا ہے، اور ایک angram مرتب ہو جاتا ہے، اس ترکیب سے رمزنگاری کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیئے حروف کی ترتیب کو کسی ایک لفظ کی بجائے جملوں اور مکمل تحریر میں بدلا جائے۔ ایسی صورت میں 35 حروف کے پیغام کو مختلف انداز میں پیش کرنے کے لیئے 50,000,000,000,000,000,000,000,000,000,000 مختلف ترتیبیں دی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ صحیح ترتیب کا پہچاننا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔ لہٰذا transposition کے ذریعہ سے رمزنگاری کے لیئے یہ ضروری ہے کہ ایسا طریقہ وضع کیا جائے جس پر پیغام بھیجنے والا اور وصول کرنے والا دونوں پہلے سے متفق ہوں۔

رمزنگاری کا دوسرا طریقہ ''تبادلے'' (substitution) کا ہے، اس کے دو مختلف طریقے ہیں، اولاً پیغام کے الفاظ کو دوسرے ''کوڈ الفاظ'' سے تبدیل کر لیا جاتا ہے، دوسری صورت میں پیغام کے حروف اور الفاظ کو دوسرے حروف یا علامات سے تبدیل کر لیا جاتا ہے۔ substitution کے طریقہ کو قابلِ عمل بنانے کے لیئے کسی مخصوص ''کلید'' ("key") پر انحصار کیا جاتا ہے۔ جو تبادلے کا مخصوص طریقہ طے کرتی ہے، جسے کسی الگورزم (algorithm) کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ مؤخرالذکر کے ذریعہ سے مخصوص حروف یا علامات متعین کی جاتی ہیں جن کی روشنی میں تبادلے کے لیئے طے شدہ ترتیب دی جاتی ہے۔ کلید اور الگورزم کے ذریعہ سے عام پیغام یا تحریر کے لیئے رمزنویسی کی کلید ("cipher") مرتب ہوتی ہے۔ عام انگریزی پیغام کو اس طریقے سے 4000,000,000,000,000,000,000,000,000 مختلف انداز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اور اتنی ہی تعداد میں مختلف کلید بھی مرتب کیئے جا سکتے ہیں، جن کے ذریعہ سے اعلیٰ درجہ کا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ مگر اس کے لیئے صرف ایک شرط ہے کہ پیغام کا وصول کنندہ صرف کلید کی حفاظت کر سکے۔

رمزنگاری کے سادہ تبادلہ کے طریقہ سے اہم اور حساس پیغامات اور معلومات دشمن کی نگاہوں سے صدیوں تک پوشیدہ رکھی جاتی رہیں ایسے رمزیہ پیغامات کو سمجھنے کی کوششیں لاحاصل ثابت ہوتیں بعض لوگ تو ان پیغامات کو منجاب الٰہی سمجھنے لگے تھے کہ نویں صدی عیسوی میں بغداد میں الکندی نے اس طریقے کا راز فاش کر کے رکھ دیا۔ عباسی دور میں عام خوشحالی تھی، علم وحکمت کے چرچے تھے، دینی اور دنیاوی علوم میں مہارت حاصل کرنے کا عام رجحان تھا، اکتسابِ علم کے مواقع وافر تھے۔ حکماء کی تصانیف کتابت کر کے لائبریریوں اور عام کتابوں کی دکانوں پر فروخت ہوتی تھیں، یونانی، ایرانی اور دیگر ذرائع سے حاصل کردہ کتابوں کے ترجمے سرکاری اور نجی کاوشوں سے ہو رہے تھے، جو عام قاری کی دسترس میں تھے۔ ان حالات میں رمزشناسی cryptanalysis یا رمزیہ تحریروں کو پڑھنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اس میدان میں اولین کام فیلسوفِ عرب، الکندی نے کیا۔

رمزشناسی میں الکندی کا کام: الکندی 800ء میں کوفہ میں پیدا ہوا، جہاں اُس کا باپ اور اُس سے پہلے اُسکا داد اگورنر تھے، الکندی نے ابتدائی تعلیم کوفہ میں حاصل کرنے کے بعد دارالخلافہ بغداد کا رُخ کیا جہاں خلیفہ مامون الرشید نے اُسے اپنے نو قائم کردہ **''بيت الحكمة''** میں ایک اہم ذمہ داری سونپی۔ یہاں اُس نے الخوارزمی، نوموسٰی برادران اور دوسرے ماہرین کے ساتھ مل کر عربی میں یونانی اور دوسری زبانوں سے تراجم کرنا، اُن کی تدوین و اصلاح کا کام کیا۔ یونانی فلسفیوں، خصوصاً سقراط اور ارسطو سے الکندی بہت متاثر تھا، اُس نے اُن کی تصانیف کے تراجم استعمال کیے، جس کا اظہار اُس کی فلسفیانہ تصانیف سے بھی ہوتا ہے، فلسفے کے علاوہ اُس نے ریاضی، طب، بصریات، فلکیات، اور دوسرے علوم میں بھی قابلِ قدر کام کیا۔

رمزشناسی یعنی Cryptanalysis کی بنا کے لیے ایسے معاشرے کی ضرورت تھی جو تین علمی میدانوں لسانیات، شماریات اور ریاضی میں ترقی کی اعلٰی منازل طے کر چکا ہو، الکندی کے لیے ایسے سازگار حالات موجود تھے، وہ خود ان تینوں میدانوں میں اعلٰی مہارت کے علاوہ دوسرے متعدد میدانوں علوم پر بھی عبور رکھتا تھا۔ یونانی اور رومی ciphers اور encrypted پیغامات، اور اُس دور کے مستعمل cryptographic طریقوں پر کام کرتے ہوئے الکندی نے رمزشناسی (cryptanalysis) کا فن ایجاد کیا جسے اُس نے اپنی شاہکار تصنیف **''رسالة في الحيل العددية و علم اضمارها''** میں اس طرح بیان کیا ہے:

''کسی رمزیہ (encrypted) پیغام کو حل کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اگر ہم اُس کی زبان سے واقف ہیں تو اُس میں صفحہ دو صفحہ طویل ایک عام تحریر لیں اور اُس میں ہر حرف کی تعداد کا شمار کریں، سب سے زیادہ مستعمل حرف کو ''پہلا'' نمبر دیں، اُس سے کم تعداد میں استعمال ہونے والے حرف کو ''دوسرا''، بعد والا ''تیسرا''، اسی طرح گنتی کرتے چلے جائیں حتٰی کہ سبھی حروف کا شمار اور اُن کی ترتیب تیار ہو جائے۔ اس کے بعد ہم زیرِ مطالعہ رمزیہ عبارت (cipher text) کو لیتے ہیں اِس میں مستعمل حروف کی بھی اُسی طرح درجہ بندی کرتے ہیں، اور سب

سے زیادہ استعمال ہونے والے حرف کو ''پہلے حرف'' سے تبدیل کرتے ہیں، اسی طرح ''دوسرا''، ''تیسرا''، ۔۔۔حرف تبدیل کرتے چلے جاتے ہیں حتٰی کہ سبھی حروف تبدیل ہو جائیں''۔

الکندی کا طریقہ تعدد کے تجزیہ (frequency analysis) کا طریقہ کہلاتا ہے، جس میں کسی مخصوص زبان کے حروف کا ایک عام تحریر میں مستعمل فیصد تعداد کا شمار کر کے، خفیہ کوڈ (cipher) میں استعمال ہونے والی علامات یا حروف کی تعداد سے بالترتیب تبدیل کرنے پر مبنی ہے۔ تاہم بہتر نتائج کے لیے اس طریقے کے لیے نمونے کی ایک طویل عبارت درکار ہوتی ہے، اس کے علاوہ بعض حالات میں عام تحریر و تقریر میں مستعمل حروف کا خفیہ پیغام میں صد فی صد استعمال ممکنہ طور پر یا عمداً مختلف بھی ہو سکتا ہے تا کہ خفیہ تحریر کے تجزیہ نگار کو گمراہ کیا جا سکے۔ تجربہ، محنت، اور اندازوں کی مدد سے، نیز تجزیہ نگار کی لگن پیچیدہ ترین خفیہ تحریر کو پڑھنے میں کامیابی سے ہمکنار کرتی ہے۔ اس طرح صدیوں کا آزمودہ رمزنویسی (cryptography) کا نظام کمزور پڑ گیا، اور رمزنویسوں کو مجبوراً پیغامات کو محفوظ اور مخفی کرنے کے لیے نت نئے طریقے ایجاد کرنا پڑے جنہیں رمزشناس تعدد کے تجزیہ (frequency analysis)، کوڈ الفاظ (code words)، اور رمزیہ تحریر وغیرہ کے استعمال سے آشکار کرنے میں کامیاب ہو جاتے رہے۔ موجودہ دور میں رمزنگاری (cryptography) ایک اہم سائنس کا درجہ اختیار کر چکی ہے، اور یہ جاسوسی، افراد یا اقوام کے رازہائے پنہاں (privacy)، تجارتی، صنعتی رازوں کو محفوظ کرنے اور خصوصاً الیکٹرانک بنکنگ اور تجارت وغیرہ کی معلومات کو صیغۂ راز میں رکھنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ رمزنگاری کے تجزیہ (cryptanalysis) کی ترویج نے رمزنگاری (cryptography) کو بھی آگے بڑھنے میں مدد دی ہے، اور آج تک کی عظیم ایجاد کمپیوٹر، انٹرنیٹ، اور ڈیجیٹل کی دنیا میں ترقی کے لیے راہ ہموار کی ہے۔

جدید رمزیات میں کوانٹم مکینکس کا کردار: جب کبھی کوئی رمزیہ پیغام ارسال کرنا ہو تو سب سے پہلے کلید کا تعین کرنا ہوتا ہے تا کہ پیغام کا وصول کنندہ ہی اُسے سمجھ سکے، اور وہ دوسروں سے مخفی رہے۔ پھر اُس کلید کے حوالے سے پیغام کی رمزنویسی کی جاتی ہے۔ کوئی دشمن رمزیہ پیغام کو اچک کر اُسے پڑھنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ کلید کے بغیر پیغام مہمل ثابت ہوتا ہے۔ جنگی نقطۂ نظر سے کسی ایک کلید کا دوبارہ استعمال خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ سویٹ روس کا کلیدوں کو دوبارہ استعمال کرنے کے باعث، جو بنانے والے کی غلطی سے ہوا، 1949ء میں امریکی رمزشناسوں نے ایٹمی جاسوس کلاز فخس (Claus Fuchs) کا راز فاش کر دیا۔ جب کوئی کلید ایک سے زیادہ مرتبہ استعمال کی جائے تو رمزشناس مختلف پیغامات میں رمزیہ تحریروں کے انداز سے رمزیہ پیغام کو سمجھنے کا موقع مل جاتا ہے۔ تاہم عمدہ رمزنگاری کے ایسے نظام مرتب کیئے جا چکے ہیں جو کامیابی کے ساتھ کلید کو بار بار استعمال میں لا سکتے ہیں۔ کلید جس قدر طویل ہوگی اسی قدر رمزیہ نظام زیادہ محفوظ ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک وسیع استعمال ہونے والا نظام ''ڈیٹا اینکرپشن سٹینڈرڈ'' (Data Encription Standard - DES) ہے۔ اس میں کلید 56 bits طویل ہے۔ چنانچہ

کوئی اور ایسا طریقہ نہیں جس کے ذریعہ کوڈ کو توڑا جا سکے ماسوائے اس کے کہ کلید کی 2^{56} قیمتوں پر کوشش کر کے کلید کو توڑا جائے۔ تاہم یہ ممکنات میں ہے کہ کوئی زیرک رمز شناس DES اور اس کی قبیل کے دوسرے رمزنگاری کلیدوں کا توڑ نکال لے۔ چنانچہ انتہائی خفیہ پیغامات کے لیئے یہ ضروری ہے کہ کلید صرف ایک مرتبہ ہی استعمال کی جائے، دوسری مرتبہ دوسری کلید استعمال ہو۔ تاہم اس مقصد کے لیئے متعدد کلیدیں تیار کر کے پیغام بھیجنے اور وصول کرنے والے دونوں کو معلوم ہو کہ کب کون سی کلید استعمال ہوگی۔ جملہ تیار شدہ کلیدوں کے استعمال ہو جانے کے بعد اگر وصولندہ کو نئی کوڈ کسی بھی ذریعہ سے بھیجی جائے تو یہ بات یقینی نہیں کہ کلید راستے میں کہیں نقل نہ کر لی گئی ہو۔ یہ مسئلہ ''کلید کی فراہمی کا مسئلہ'' (key distribution problem) کہلاتا ہے۔ اس کا ایک حل عوامی رمزنگاری کلید ہے۔ ارسال کنندہ اور وصولندہ کے مابین ایک طویل کلید کی بجائے عوامی رمزنگاری کلید میں دو قسموں کی کلیدیں استعمال ہوتی ہیں: ایک پبلک کلید، جو ہر کسی کو معلوم ہوتی ہے، اور ایک پرائیویٹ کلید جو صرف پیغام دہندہ اور وصول کنندہ ہی کو معلوم ہوتی ہے۔ پبلک کلید جاننے والا ہر شخص رمزیہ پیغام ارسال کر سکتا ہے، لیکن صرف پرائیویٹ کلید جاننے والا ہی اُس پیغام کو سمجھ سکتا ہے۔ پبلک کلید رمزنگاری کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ رمزنویسی کلید جاننے کے باوجود ایسا کوئی computationally efficient طریقہ نہیں جس سے رمزشناسی کلید (decryption key) معلوم کی جا سکے۔

پبلک کلید رمزنگاری ایک اور مقصد، ڈیجیٹل سیگنیچرس (digital signatures) تیار کرنے کے لیئے بھی استعمال ہوتی ہے۔ ڈیجیٹل سگنیچر کے ذریعہ پبلک کلید رمزنگاری میں استعمال ہونے والی کلیدوں کے کردار کو تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ پرائیویٹ کلید سگنیچر تیار کرتی ہے جس کی پبلک کلید توثیق کرتی ہے۔ صرف پرائیویٹ کلید کا حامل شخص ہی یہ سگنیچر تیار کر سکتا ہے۔ اور رمزیہ عبارت کو ''پڑھ'' سکتا ہے۔

کوانٹمی کوڈ کشائی: مروجہ رمزیہ پیغامات کا طریقۂ کار اس مفروضے پر کام کرتا ہے کہ کوئی بھی ایسا تیز الغورزم موجود نہیں جو اس قدر طویل رقموں کی تحسیب کر کے خفیہ کلید کا تعین کر سکے۔ تاہم کوانٹم مکینکس نے اس تأثر کو تبدیل کر دیا ہے، 1994ء میں پیٹر شور (Peter Shor) نے بڑے اعداد کے فیکٹر بنانے (factoring) کے لیئے ایک کوانٹمی الغورزم ایجاد کیا، اس نظام میں ایک کوانٹمی کمپیوٹر ایک مناسب دورانیئے میں ایسی طویل تحسیب کا اہل ہے جسے کلاسیکل کمپیوٹر بہت زیادہ وقت لیتا ہے۔ اگر مستقبل میں کبھی کوانٹمی کمپیوٹر تیار ہو گیا تو کلاسیکل رمزنگاری اُس کے سامنے نہیں ٹھہر سکے گی، اُسی درجے کا تحفظ دینے کے لیئے کلید کی طوالت کو کم از کم دوگنا کرنا ہوگا۔ خواہ موزوں قسم کا کوانٹمی کمپیوٹر بنانے میں کئی دہائیاں کیوں نہ لگ جائیں، پھر بھی یہ موجودہ دور کے لیئے ایک لمحۂ فکریہ ہے، کیونکہ بعض معلومات مثلاً نیوکلیائی اسلحہ کے ڈیزائین کو مخفی رکھنے کی ضرورت بہر حال رہے گی، اور اس امر کی ضرورت اور کوشش رہے گی کہ آج کے مخفی پیغامات کل منکشف نہ ہو سکیں۔

کوانٹمی رمزنگاری: خواہ Data Encryption Standard - DES اور RSA Public Key

Cryptosystem ناکام ہی کیوں نہ ہو جائیں، کوانٹمی کمپیوٹر کی موجودگی میں بھی یکمرتبہ مستعمل کلید کلید ناقابلِ شکست ثابت ہوگی۔ تاہم اس میں ''کلید کی فراہمی'' کی خامی رہے گی۔ قابلِ اعتماد قاصد خریدے جا سکتے ہیں، یا اُن کے علم میں لائے بغیر کلید چوری کی جا سکتی ہے۔ کلاسیکی طریقۂ پیغام رسانی کو مخالف پڑھ سکتے ہیں اور راز فاش کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ کلاسیکی فزکس میں فراہمیٔ کلید کی راہ میں نقب لگانے کو روکنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ خوش قسمتی سے کوانٹمی میکانیات کوڈ بنانے اور کوڈ توڑنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ ہائیزنبرگ کے اصول Uncertainty Principle کی رو سے دو تکمیلی متغیرات (complementary variables) مثلاً کسی ذرے کی مومنٹم اور پوزیشن کی صحیح قیمتیں معلوم کرنا ناممکن ہے۔ کوانٹم مکینکس کی یہ بظاہر تحدید رمز شناسوں کے خلاف ایک عمدہ ہتھیار ہے۔ کوانٹمی رمزنگاری کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ معلومات کی رمزنگاری کے لیے non-orthogonal quantum states استعمال کی جائیں۔ کوانٹمی رمزنگاری میں اگر ایک فوٹون چار ممکنہ تقطیب (پولارائزیشن) کی حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں ہو تو کیا اُس کی تقطیبی حالت کا تیقن کے ساتھ تعین کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ اس طریقۂ کار میں ''کوانٹمی کلید تقسیم'' (quantum key distribution - QKD) کے ذریعہ کلید کی فراہمی کا مسئلہ بھی جزوی طور پر حل کیا جا سکتا ہے۔ اس طریقہ کے ذریعہ اولیں اور تا حال بہترین پروٹوکول "BB84" کہلاتا ہے کیونکہ اسے 1984 میں Charles Bennet and Gilles Brassard نے شائع کیا تھا۔ تا حال 50 کلومیٹر تک کے فاصلے تک اس طریقِ کار کے ذریعہ پیغامات بھیجنے کے کامیاب تجربے کیے جا چکے ہیں۔

اس سب کے باوجود اگر کوانٹمی کلیدِ تقسیم پر تجربات کامیاب ہو جاتے ہیں اور کوانٹمی رمزنگاری رائج ہو بھی جاتی ہے تو اس امر کی کیا ضمانت ہے کہ کوانٹمی رمزنگاری کا توڑ نہ نکل آئے گا۔ اکثر تجربات ظاہر کرتے ہیں کہ کوانٹمی کوڈ محفوظ ہے، تاہم اس امر کے شواہد ملے ہیں کہ کلاسیکی احتمالیت (classical probability) نظریہ کے مطابق کوڈ کو توڑا جا سکے گا۔ ممکنہ طور پر کوانٹمی کمپوٹیشن کے باوجود public key cryptosystem زیرِ استعمال رہے گا، یا ممکن ہے کہ نئے پبلیک کی سسٹم ایجاد ہو جائیں جو صرف کوانٹمی کمپیوٹر پر کام کریں۔ اس امر کا بھی امکان ہے کہ کوانٹمی کمپیوٹر بنانا ہی دشوار ثابت ہو، اور پبلک کی cryptography ہی مستعمل رہے۔ یہ وقت ہی بتائے گا کہ کوانٹمی cryptology سے کس کو زیادہ فائدہ ہوگا کوڈ بنانے والوں کو یا کوڈ توڑنے والوں کو! بہر نوع، الکندی سے شروع ہو کر رمزشناسی کا سفر کوانٹم کی دنیا تک آ پہنچا ہے، دیکھیں مستقبل میں اس کی کیا شکل بنتی ہے!

حوالہ جات:

Gottesman, D. and Lo, Hoi-Kwong (2000) From Quantum Cheating to Quantum Security, **Physics Today,** November 2000, pp. 22-27.

Al-Tayeb, Tariq (2003) **Al-Kindi Cryptography, Code Breaking and Ciphers,** FSTC Limited, www.http. Muslim Heritage.com

ڈاکٹر ارشد جمال (کامٹی)

غالب کا احساسِ کمتری

سب کہاں، کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

انسانی زندگی ایک ایسا سربستہ راز ہے، جوآج تک وا نہ ہوسکا۔صدیاں گزر گئیں،مگر ''زندگی'' کے بارے میں،اب تک،کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہوسکا۔پھر بھی ''زندگی'' کی نئی نئی تاویلیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔غالب نے بھی ''زندگی'' کے باب میں اک بات کہی تو کیا؟ سوال یہ بھی نہیں ہے کہ اس اطلاق خود ان پر بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ہاں، اتنا ضرور ہے کہ ایک شاندار ماضی ، ایک عظیم والشان خاندان سے سلسلۂ نسب ملنے کے باوجود ''زندگی'' جب ''زندگی'' کے روپ میں غالب تک پہنچی تو اس حد تک گھس پٹ چکی تھی کہ شاہانہ شان وشوکت سے اتر کر میدانِ کارزار کی ''سیف'' سے ہوتی ہوئی بصورتِ ''قلم'' ان کے حصے میں آئی اور ''نظم ونثر کو مشقت'' در عالمِ اسیری ''آب وگل'' مقرر کیا گیا،مگر اپنی گذشتہ عظمت پر تفاخراب بھی باقی تھا،گذشتہ شان وشوکت پر نہ سہی، حسب نسب پر نہ سہی اپنی شاعری، اپنے فن پر تو غالب کو ضرور ناز تھا۔مگر غالب جتنے بڑے شاعر تھے، زمانے نے ان کی اتنی ہی ناقدری کی۔ایک طرف خاندانی عظمت، جاہ وجلال اور شاعری پر یہ تفاخر، دوسری طرف یہ ناقدری کہ ''اپنا کہا خود سمجھیں یا خدا سمجھے''۔غالب کی ''زندگی ایک'' حادثہ بن گئی۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

وہ ''زندگی'' کے اس تضاد میں بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ایک طرف خودداری وخود پسندی، دلاوری وشجاعت، وبزرگی وضع داری کی شان دار روایات غالب نے ورثہ میں پائیں اور ایسا خوددار ہوا کہ۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ وخود بیں ہیں کہ ہم الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

تو، دوسری طرف، ''زندگی'' ایک عذاب، ایک قہر بن کر نازل ہوئی، جس میں ان کی ساری خودداری اور خود پسندی ،شان وشوکت اور وضع داری پس کر رہ گئی۔وہ ساحلِ زندگی پر ہاتھ ملتے ہی رہ گئے اور سوچتے رہے کہ جن حالات میں وہ سانس لے رہے ہیں، وہ ان روایات کے پنپنے اور مستحکم ہونے میں ہرگز سازگار نہیں۔چالیس پچاس ہزار کا قرض دار،ا آسیائے روزگار کی گردش میں ایسا پسا کہ کہتے ہی بنی۔

غالبؔ وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

غالب کے سینے میں کیسا پرنور دل تھا،لیکن حالات نے انہیں کیسا لاچار، دردمند، کتنا مایوس اور تلخ بنادیا تھا۔جو شخص نوکری کو یہ کہہ کر لات مار دے کہ:

''ملازمت اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ اس میں میرے عزووقار میں اضافہ ہو۔نہ کہ جو پہلے سے ہے،اس میں بھی کمی آجائے۔اگر ملازمت کے معنے موجودہ رتبے میں کمی کے ہیں تو ایسی ملازمت کو میرا دور ہی سے سلام۔''[۲]

وہ یہاں تک کے کیسا پہنچا ہوگا؛ کیا گزری ہوگی اس کے دل پر جب اس نے کہا:

''وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے ، وہ میں ہوں۔''[۳]

''گورنمنٹ کا بھاٹ تھا،بھٹئی کرتا تھا،خلعت ،موقوف،بھٹئی متروک۔''[۴]

''نثر کی داد اور نظم کا صلہ نہ مانگے بلکہ بھیک مانگے۔(وہ) روٹی اپنی گرہ سے نہ کھاتا تھا (روٹی) اسے سرکار سے ملتی تھی۔''[۵]

اور نوبت بہ ایں جا رسید۔ ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

جو ''زندگی'' خوبصورت تصورات سے شروع ہوئی تھی،اس کا انجام کتنا بھیانک ہوا۔

غالب کا ذہن ایک آرٹسٹ (فن کار) کا ذہن تھا، جو اپنے اندر ایک خوبصورت دنیا کو تخلیق کیے ہوئے تھا۔انسان بچپن ہی سے پریوں ،شہزادوں، شہزادیوں کی کہانیاں سن سن کر، اپنے ارد گرد خوابوں کی ایک طلسماتی دنیا تعمیر کر لیتا ہے۔اپنے دل ودماغ کو وہ اس خیالی دنیا میں مگن اور مسحور رکھتا ہے۔غالب نے تو اسی دور میں آنکھیں کھولی تھیں، جو قصے کہانیوں اور خوابوں کا دور تھا۔اس ماحول نے ان کے دل میں ، ہزاروں خواہشیں ایسی'' پیدا کیں کہ، ہر خواہش پہ دم نکلے''؛ ان کا دل ''یک شہرِ آرزو'' تھا۔

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

گو بلبل ''گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج'' رہی مگر ''گلشن'' بھی ''ناآفریدہ'' ہی رہا۔حالات کی زبردست موجوں سے جب غالب کی مدہوش مگر خود پسند، خود سر اور وضع دار شخصیت کا تصادم ہوا تو ایک ایک کر کے سہانے خواب ٹوٹ گئے، سب سپنے بکھر گئے۔ٹوٹی پھوٹی اور بچی کچی شخصیت ''اپنی شکست کی آواز'' بن گئی اور ''ماتم یک شہرِ آرزو'' نے اندیشہ ہائے دور دراز'' کی چوکھٹ پر لا کھڑا کیا۔پھر، اگر وہ شکایت نہ کرتے تو کیا کرتے؟ بڑی آرزوؤں سے جن تمناؤں کو پالا تھا، وہ پامال ہوئیں اور غالب کو ''مہرِ نیم روز'' میں لکھنا پڑا :

''کہتے ہیں صاحب قرآں ثانی شاہجہاں نے کلیم کو سیم وزر اور لعل وگوہر سے تلوایا تھا میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ زیادہ نہیں آپ سخن سنج حضرات کو ب یہ حکم دیں کہ وہ ایک بار میرے کلام ہی کو کلیم کے کلام کے ساتھ جانچنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔'' **(ذکرِ غالب۔۔مالک رام ص۴۳۲)**

غالب کا دل ایک کے بعد ایک چوٹیں سہتا گیا، چوٹ سہتا گیا اور سونا تپ کر کندن ہوتا گیا؛ ان کا آرٹ

نکھرتا گیا۔ غالب کو اپنے بڑپن پر بڑا ناز تھا، لیکن زمانے نے اتنی ہی ان کی ناقدری کی۔ یہ ناقدرشناسی، ان کے احساسات کو مجروح کرتی رہی، زمانے نے ان کو اپنی ٹھوکروں پر رکھ لیا وہ پامال ہوتے رہے، پستے رہے، ان کا بڑپن احساس، کمتری میں مبتلا ہوتا گیا جو آہستہ آہستہ انھیں خودسر اور مغرور بناتا گیا۔ شدید ترین احساس کمتری، شدید ترین احساس برتری کے پیکر میں نمودار ہوا۔ جتنی زیادہ ان کی ناقدری کی گئی، اتنا ہی انھوں نے اپنا تحفظ کیا، اتنا ہی بڑا وہ اپنے آپ کو سمجھتے رہے اور آخرکار بڑے بن گئے۔ ''اسد'' سے ''غالب'' ہو گئے۔ اس لیے اگر انھوں نے اپنی عظمت کی راگ الاپے ہیں؛ اپنے ''اندازِ بیان'' کو ''اور'' کہا، ہر لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم سمجھا؛ داد کی خواہش کی نہ صلے کی پرواہ یا اپنے کلام کی کچھ داد روح القدس'' سے پائی تو یہ شاعرانہ تعلّی نہیں تھی، حقیقت کا اظہار تھا۔

تاریخ کے صفحات سے تیمور لنگ اور نپولین کے نام کبھی نہ مٹائے جا سکیں گے کہا جاتا ہے کہ تیمور اپنے لنگڑے پن کی وجہ سے اور نپولین اپنے پستہ قد پر سخت شرمندہ تھا۔ یہ شرمندگی انھیں احساس کمتری میں مبتلا کیے ہوئے تھی اور یہی احساس کمتری ان کی عظمت کا باعث بنا۔ احساس کمتری کا ردِعمل دو طرح سے ہوتا ہے۔ کبھی کبھی یہ احساس آدمی کی شخصیت کو ایک دم غارت کر دیتا ہے اور وہ گندی نالی میں رینگنے والے کیڑے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے اور کبھی یہی احساس اس کے ذوق کی صحیح تربیت کر کے اسے بے مثال بنا دیتا ہے فاتح عالم بنا کر تیمور یا نپولین کے بھیس میں پیش کر دیتا ہے۔ یہی مثال غالب پر بھی صادق آتی ہے۔ احساس کمتری نے غالب کی شخصیت کو سنوارا نکھارا۔ غالب نے تلوار نہیں پکڑی، پھر بھی وہ فاتح عالم بنے۔ آج جب ایک عالم میں ان کی صد سالہ برسی منائی جا رہی ہے، ان کی عظمت و بزرگی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے عالم کو ''قلم'' کے زور سے فتح کیا، غالب کی ساری شخصیت، سارا غرور، سارا وجود آسیائے روزگار کی گردش میں پستا رہا اور زمانے کی چھلنی میں چھنتا رہا اور اس چھنائی میں جو مادہ صاف ستھرا، دلکش اور نفیس اور دل پذیر تھا، ان کی شاعری بن کر منظرِ عام پر آیا، اور بچا کچا غلیظ مادہ اور سڑا اگلا فضلا غالب کے جسم میں ڈھل کر آہستہ آہستہ موت کے اندھیرے غاروں کی طرف قدم بڑھاتا رہا حتیٰ کہ مادرِ زمین کے آغوش میں جا سویا لیکن وہ صاف ستھرا، نتھرا نکھرا غالب آج بھی زندہ ہے اور تا قیامت زندہ رہے گا۔

غالب کا احساسِ کمتری، ان کی عظمت کا باعث ہوا اور ان کی عظمت کا راز ان کی بت شکنی میں ہے۔ ان کی شکستہ اور خستہ شخصیت بت شکنی پر اتر آئی۔ ان کی بت شکنی سماج، معاشرے اور ماحول کے خلاف ایک بغاوت ہے۔ فرسودہ روایات سے انحراف ان کا شیوہ اور ''اگلوں'' کی بات من وعن تسلیم کر لینا ان کی فطرت کے موافق نہ تھا اور اس کی انتہائی صورت یہ ہے کہ

با من میآویز اے پدر، فرزند آذر را نگر ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

اور ان کی یہ بغاوت خود انھیں کچلتی رہی، ان کے خلاف محاذ قائم کراتی رہی۔

حادثاتِ زمانہ کی ہر ٹھوکر انھیں مجروح کرتی رہی اور زمانہ کے خلاف بغاوت پر اکساتی رہی۔ وہ ''جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں'' لکھتے رہے، ''ہرچند اس میں ہاتھ'' ان کے ''قلم'' ہوتے رہے۔ مگر ہمتِ عالی ان

کے ساتھ رہی۔ ''آزاد مرد'' ''لاشِ بے کفن'' بن گیا مگر بغاوت سے باز نہ آیا۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:

''انسانوں نے ہمیشہ خواب دیکھے ہیں اور دیکھتے رہیں گے۔ اپنے سپنوں کو تمناؤں سے معمور کیا ہے اور ہمیشہ معمور کرتے رہیں گے۔ اور اگر ان امنگوں، خواہشوں، خوابوں اور تمناؤں کا تجزیہ کیا جائے تو یہ بات بہت جلد ذہن پر نقش ہوتی کہ ہر شخص اپنے حوصلے کے لحاظ سے اور اپنے سہارے کی ضرورت کے مطابق ایک یا کئی بت بنا لیتا ہے اور انھیں پوجتا ہے۔ کبھی کبھی اسے تنہا پوجتا ہے، کبھی کبھی اسے تنہا پوجنے سے سیری نہیں ہوتی اور دوسروں کو بہ جبر یا بے ترغیب اپنے ساتھ شریک کرنا چاہتا ہے تا کہ اس کی بت پرستی ایک ذاتی تو ہم نہ معلوم ہو بلکہ عقل کا فیصلہ نظر آنے لگے۔ یہ چیز انفرادی سے بڑھ کر اجتماعی بھی ہو سکتی ہے۔ دوسرے لوگ اور دوسرے گروہ اپنے لیے دوسرے بت بناتے ہیں اور انھیں پوجتے ہیں۔ پھر یہی نہیں بلکہ دوسرے کے بتوں کو توڑنا بھی چاہتے ہیں۔ اس طرح بت بنتے بھی رہتے ہیں اور ٹوٹتے بھی، اور کبھی تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ پجاری اپنے ہی بنائے ہوئے بت کو توڑنا بھی چاہتا ہے تا کہ اس سے بہتر بت بنائے یہ جذبہ کبھی گھبراہٹ کا نتیجہ ہوتا ہے اور کبھی غور و فکر کا۔ دل اور دماغ میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور پجاری ہمت سے کام لیتا ہے تو بت شکن بن جاتا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی کہانی کی اشارتی تصویر ہے۔ اسے ہر شخص چھوٹے اور بڑے پیمانے پر اپنی زندگی میں دہراتا ہے اور ہر قوم اپنی تاریخ میں دہراتی ہے۔ اس طرح بنتی بگڑتی زندگی کا یہ حوصلہ پوری طرح نکلا یا نہیں، یہ تو نہیں معلوم، لیکن اتنا معلوم ہے کہ انھیں ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داد پانے کی تمنا بھی اور گناہوں پر فخر کرنے کا حوصلہ بھی ان کی انفرادیت تمام بتوں کو توڑ پھینکنا چاہتی تھی اور انھوں نے توڑا بھی لیکن ان کی راہ میں خود ان کی ذات حائل تھی جو حسرت و یاس کا مجسمہ ہونے کے باوجود انھیں بے حد بے حد عزیز تھی۔''

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

یہی ''جانِ عزیز'' تھی جس نے انھیں احساسِ کمتری میں مبتلا رکھا تھا، زمانے کی ٹھوکروں پر رکھا تھا، اس چکی میں وہ پستے اور گھستے رہے اور ''موت کی آرزو'' میں ''مرتے رہے''۔ زندگی نے انکی قدر کی نہ زمانے نے۔ موت نے اپنی آغوش میں سلایا تو زمانہ بھی طرفدار ہو گیا اور زندگی بھی۔ اب وہ مر کر بھی زندہ ہیں اور پامال ہو کر بھی سلامت۔

حواشی

(۱) آبِ حیات: آزاد : ص ۸۔۷۔۵

(۲) اردوئے معلیٰ : ص۲۴۳ : بنام نواب علاؤالدین خان

(۳) اردوئے معلیٰ : ص۵۵۲ : بنام نواب علاؤالدین خان

(۴) اردوئے معلیٰ :ص۷۰ بنام تفتہ

(۵) یادگارِ غالب : حالی : ص ۲

(۶) اعتبارِ نظر : مقالہ، غالب کی بت شکنی : احتشام حسین : ص ۹۲۔۱۹۱

عبدالرب استاد (گلبرگہ)

مولانا آزاد: شش جہت شخصیت

مولانا ابوالکلام آزاد جن کا نام نامی محی الدین احمد تھا۔ اگر صرف نام اور آپ کی کنیت پر ہی نظر ڈالیں تو کئی جہتیں سامنے آتی ہیں کہ وہ مولونا بھی تھے، ابوالکلام بھی تھے، آزاد بھی تھے، محی الدین بھی تھے اور احمد بھی تھے اس طرح ان کی پانچ جہتیں تو یہیں بن گئیں۔ مگر پروفیسر محمد حسن نے اپنے ایک مقالہ میں آپ کی شخصیت سے متعلق یوں رقم فرمایا ہے۔

’’مولانا آزاد کی شخصیت ایک تھی اور حیثیتیں چار۔ وہ عالم دین تھے اور دینی فکر میں ان کا مرتبہ بلند تھا۔ وہ صحافی تھے اور اردو صحافت پر آج بھی انک ے لہجے اور اسلوب کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہ سیاسی رہنما تھے اور ہندوستان کی تشکیل جدید میں ان کو نمایاں مقام مقام حاصل ہے۔ اور وہ اردو کے صاحب طرز ادیب تھے جس کے اسلوبنے ادب پر دوررس اثرات چھوڑے‘‘۔

پروفیسر صاحب نے چار حیثیتیں بتائیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان کے علاوہ بھی آپ کی دو اور حیثیتیں تھیں۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر اور خطیب بھی تھے جو اپنے دور اور عہد پر چھائے ہوئے تھے۔ اور وہ ایک دانشور اور ماہر تعلیم بھی تھے کہ اس میدان میں آپ نے فکری اور شعوری تبدیلی پیدا کرنے کی سعی کی اور کامیاب سعی کی۔ ان تمام سے قطع نظر مولانا آزاد بنیادی طور پر ایک ہمدرد، سچے اور اچھے انسان تھے جنھوں نے پوری انسانیت کی بقا اور بھلائی کے بارے میں سونچا اور کام کرتے رہے۔

۱۹ رویں صدی کے وسط سے لے کر ۲۰ رویں صدی کے نصف تک کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایک صدی بڑی انقلاب آفرین صدی رہی۔ مولانا آزاد کی پیدائش ۱۹ رویں صدی میں اور کام ۲۰ رویں صدی کی چھٹی دہائی تک ملتا ہے۔ دو اچھے ستاروں کا ایکبرج میں جمع ہونے کو قیران السعدین کہتے ہیں۔ گویا آپ کی شخصیت میں دو صدیاں مجتمع ہوگئیں تھیں۔ اس پوری صدی میں ہر میدان میں انقلاب ہی انقلاب نظر آتا ہے۔ انقلاب سیاست میں، انقلاب صحافت میں، انقلاب ادب میں، انقلاب مذہب میں، انقلاب تعلیمی میدان میں، انقلاب شخصیتوں کے میدان میں، انقلاب سماجی میدان میں، انقلاب جغرافیائی میدان میں۔ ہر جگہ

اور ہر میدان میں انقلاب ہی انقلاب۔

انہی سو سالوں میں جہاں دو عالمی جنگیں ہوئی وہیں روس میں زار کا تختہ الٹ دیا گیا۔ ادب کے میدان میں جہاں اہم تحریکیں ملتی ہیں خواہ وہ سرسید تحریک ہو کہ رومانوی تحریک اسی عہد میں ملتی ہیں۔ سیاسی اعتبار سے ہندوستان کی آزادی ک ی تحریک۔ بالآخر ہندوستان نے انگریزی سامراجیت سے آزادی تو حاصل کر لی تو دنیا کے نقشہ پر ایک نیا ملک نمودارہ وگیا۔ انہی سو سالوں میں انقلاب آفرین شخصیتوں میں یا شخصیتوں کے اس کا ہکشاں میں ایک روشن اور چمکدار ستارہ کی مانند مولانا آزاد تھے۔ جنکی اپنیانفرادیت ہر میدان میں چہکتی، بولتی، مہکتی اور چمکتی نظر آتی ہے۔ سماج یا معاشرے کی اتھل پتھل سے شخصیتیں متاثر ہوتی ہیں۔ مگر مولانا آزاد کی شخصیت سماج یا معاشرے پر اثر انداز ہونے والی تھی۔ اس نابغہ روزگار شخصیت پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ مگر زندہ ذہن شخصیتوں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ زندہ نہ بھی رہیں مگر ان کا نام ان کے کام کی وجہ سے زندہ رہتا ہے اور ان پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ بلکہ ان کا احاطہ مکمل طور پر کیا جانا ممکن بھی نہیں ہوتا۔ یہ ہر دور میں اپنے ہونے کا ثبوت فراہم کر رہے ہوتے ہیں۔

مولانا آزاد کے متعلق اساتذہ، دانشور، محققین اور ناقدین نے کہا ہے کہ نابغہ روزگار شخصیت تھی۔ اس میں کوئی امر مانع نہیں۔ کیونکہ انھوں نے علم، اس عالم الغیب سے حاصل کیا اور قوت وہمت اس قادر مطلق سے پائی۔ وہ نہ صرف مردم شناس بلکہ زمانہ شناس تھیا ور وقت کی نبض کو پرکھنا ان کے بس میں تھا۔

اس زمانہ میں ایسا نہیں کہ صحافی نہیں تھے یا اخبارات نہیں تھے، یا اس دور میں خطیب یا مقررین نہیں تھے، یا اس عہد میں سیاستدان نہیں تھے یا دانشور و ماہرین تعلیم نہیں تھے، یا اس پریڈ میں ادیب نہیں تھے۔ بلکہ یہ دور ادیبوں، خطیبوں، شاعروں، سیاستدانوں، صحافیوں اور دانشوروں سے پر نظر آتا ہے۔ ان تمام کے باوجود مولانا آزاد نے اپنی روش، اپنی داد، اپنی طریق کار سب سے جداگانہ بنایا اور ایسا بنایا کہ ہر کس و نا کس آپ کا گرویدہ ہو گیا۔

جہاں تک آپ کی صحافت کا تعلق ہے اس میدان میں مولانا آزاد ایک بے باک اور بے لاگ صحافی نہیں بلکہ ایک مقدس اور حق وصداقت کے پیکر صحافی نظر آتے ہیں۔ مقدس اس لئے کہ، صحافت کی معراج ہی تقدس اور حق وصداقت اس کا معیار ووقار ہوتی ہے۔ اس میں جانبداری کیلئے کوئی جگہ نہیں۔ ابتداء ہی سے مولانا نیا اس میدان میں وہ چھاپ چھوڑی کہ اس دور کے اکابر علماء بھی آپ کی تحریروں کے قائل ہو گئے۔ خواہ وہ لسان الصدق ہو کہ الوکیل، البلاغ ہو کہ الہلال۔ آپ نے میدان صحافت میں ایک مرد مجاہد کا رول ادا کیا۔ جہاں معاشرتی مسائل پر آپ نے خیال پیش کئے وہیں سیاسی نشیب وفراز پر بھی قلم اٹھایا۔ ادب، تعلیم و نیز تہذیب وثقافت پر آپ کی گہری نظر تھی۔ عالمی تناظر میں بھی آپ نے اپنے قارئین کو معلومات فراہم کیں۔ قومی اور انسانی جذبہ کے تحت آپ نے اپنی ساری توانائی صحافت کی معرفت صرف کی۔ اور انفرادیت کو بھی برقرار رکھا۔ آپ نے صحافت کو کبھی بھی معاش کا

ذریعہ بننے نہیں دیا۔ آپ کی حمیت نے کبھی اسے برداشت ہی نہیں کیا۔ اخبار کی پالیسی سے متعلق آزاد کے کیا خیالات تھے، خود ان کی تحریر کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں:

''ہم اس بازار میں سوائے نفع کیلئے نہیں، بلکہ تلاش زیاں ونقصان میں آئے ہیں۔ صلہ وتحسین کے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں.......... ہمارے عقیدے میں تو جو اخبار اپنی قسمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لینا جائز رکھتا ہے وہ اخبار نہیں بلکہ اس فن کیلئے دھبہ اور سرتاسر عار ہے۔ ہم اخبار نویسی کی سطح کو بہت بلندی پر رکھتے ہیں اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فرض الہٰی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں۔ پس اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح ک ے دباؤ سے آزاد ہونا چاہئے۔ اور چاندی اور سونے کا سایۂ تو اس کیلئے سم قتل ہے''۔

مولانا کے صحافتی کالم ہوں کہ مضامین ان سے آپ کی بصیرت اور دور اندیشی مترشح ہوتی کہ آپ اپنے عہد کیسر کردہ لیڈروں اور دانشوروں سے کس قدر آگے تھے۔ جب گاندھی جی جنوبی افریقہ سیہندوستان واپس آئے اور اپنے سیاسی مشن کیلئے انھوں نے رام راج کے تصور اور بھگوت گیتا کی نئ توجیہ سے کام لیا تو مولانا نے فخر سے لکھا تھا کہ:

''ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی زندگی کی جو روح پھونک رہے ہیں۔ الہلال اس کام سے ۱۹۱۴ء میں فارغ ہو چکا ہے''۔

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت کا یہ عالم تھا کہ وہ مستقبل میں ہمیشہ آنے والے حالات سے باخبر کرتے اور صرف مسلمان قوم کو نہیں بلکہ ساری ہندوستانی قوم کیلئے آپ نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ کسی سے چھپی نہیں ہیں۔ مولانا کی سیاسی بصیرت کا اعتراف، آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے جن الفاظ میں کیا ہے، پیش ہیں ۔

''میں صرف عملی سیاست ہی نہیں جانتا، سیاست کا طالب علم بھی ہوں۔ علم سیاست کی کتابیں مجھ سے زیادہ ہندوستان میں کسی اور نے نہیں پڑھیں۔ میں تیسرے چوتھے سال یوروپ کا بھی دورہ کرتا ہوں۔ جہاں سیاست کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے سیاست کے تازہ ترین علم سے واقفیت حاصل کر لی ہے۔ لیکن جب ہندوستان پہنچ کر مولانا آزاد سے باتیں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب بھی بہت آگے ہیں''۔

ادبی نقطہ نظر سے آپ کا انداز بیان اور آپ کا اسلوب ہی آپ کی پہچان بن گیا۔ وہ اسلوب جو نہ کسی سے بن پایا اور نہ ہی کوئی اس کی تقلید کر سکا۔ یہ ایک روشن دماغ، سوچنے اور غور وفکر کرنے والا ذہن تھا۔ یہ وہ خلاقیت تھی جو عالم الغیب خدا سے آپ کو عطا ہوئی تھی ع

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

تذکرہ، غبار خاطر اور ترجمان القرآن، دراصل یہ ایام اسیری کی یادگار ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ جہاں نہ کتب ہیں اور نہ کوئی وسائل، بسصرف اور صرف آپ کے ذہن رسا کے شاندار نمونے۔ کبھی غالبؔ نے کہا تھا کہ ۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں　　　غالبؔ صریر خامہ نوائے سروش ہے

مولانا یقیناً کثیر المطالعہ شخص تو تھے۔ مگر صرف اتنا ہونا کافی نہیں بلکہ انھوں نے اپنیمطالعہ کو اپنیذ ہنک ے ہارڈ ڈسک میں محفوظ کر لیا تھا اور برمحل اسکا استعمال کرتے رہے جو آج بھی کسی معجزہ سے کم نہیں۔ عربی، فارسی اور اردو کیبے شمار اشعار، اقوال، حوالجات، تحریر کے بین السطور میں موقع کی مناسبت سے اسکا استعمال، بہت بڑی خوبی ہے۔

قید کی زندگی کو عموما بڑی حقارت سے دیکھتے ہیں مگر مولانا آزاد کا معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ ''اپنی چال زمانہ سے الٹی ہی رہی'' کہ ایام اسیری کو آپ نے عہد یوسفی سے تشبیہ دیتے ہوئے بڑی پامردی اور اطمینان سے گذارتے رہے۔ ان حالات میں بھی دنیا وومافیہا کی معلومات لکھ ڈالیں۔ کبھی فلسفہ وحکمت کی باتیں کیں تو کبھی سائنسی مضامین پر اظہار خیال، کبھی انانیت پر تو کبھی رومانیت پر، کبھی حکایات بادہ وتریاک تو کبھی صبح کی منظر نگاری۔ بڑی دلنشین انداز میں تحریر کیں۔ تبھی تو حسرتؔ نے بڑی حسرت سے کہا تھا کہ ۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر　　　نظم حسرتؔ میں بھی مزہ نہ رہا

اصغر گونڈوی نے بھلے ہی کسی اور تناظر میں لکھا ہو مگر میری دانست میں یہ شعر صرف اور صرف مولانا آزاد پر ہی چسپاں ہوتا ہے اور صدفی صد آپ کی شخصیت کا احاطہ کرتا نظر آتا ہے۔ ۔

بنا لینا ہے موج خون دل سے اک چمن اپنا　　　وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

ڈاکٹر ذاکر حسین نے مسلم یونیورسٹی کی طرف سے ابوالکلام آزاد کو اعزازی ڈاکٹریٹ کی سند پیش کرنے کے موقع پر کہا تھا کہ:

''اردو زبان کو ہمیشہ اس پر فخر رہے گا کہ وہ آپ کی زبان سے بولی اور آپ کے قلم سے لکھی گئی''۔

تعلیمی میدان میں آپ نے وہ کارہائے نمایاں انجام دیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ اور یہ صرف اور صرف ایک باشعور، عالمی ظرف اور حساس دانشور ہی رکا کام ہو سکتا ہے۔ کہ ہندوستان میں تعلیم اور اعلیٰ تعلیم کی بنیادیں مضبوط و مستحکم ہوئیں۔ یو جی سی کے مولد و موسس بھی مولانا ہی رہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین یوں رقمطراز ہیں۔

''مولانا نے اپنی مثال سے یہ بتا دیا کہ وہ اپنی ساری زندگی ایک مجاہد کی طرح، اپنی قوم کی آزادی کیلئے اس کی آزادی حاصل کرنے کیلئے، اور آزادی حاصل ہونے کے بعد آزادی کو اچھی نیو اور بنیاد پر قائم کرنے کیلئے صرف کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ علم ایک گورکھ دھندہ نہیں ہے۔ کہ جس سے لوگوں کو دھوکے

دیئے جائیں۔ بلکہ وہ ایک روشنی ہے جس سے آدمی دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے۔''

آخر پر میں اتنا ضرور کہوں گا کہ مولانا آزاد ایک اچھے اور سچے انسان تھے۔ انسانیت کا درد انھیں تھا۔ کیا ہندو اور کیا مسلمان، کیا سکھ اور کیا پارسی، وہ تمام بھارت واسیوں اور ساری انسانیت کے ہمدرد اور غمخوار تھے۔ کیونکہ آپ نے ساری زندگی خدمت خلق میں گذاری۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے الفاظ میں۔

''میرے خیال میں مولانا آزاد نے جو ایک سب سے بڑی خدمت کی، وہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے آدمی کو انھوں نے یہ بتایا کہ مذہب کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک مذہب کی حیثیت وہ ہوتی ہے جو تفریق پیدا کرتی ہے۔ جو لوگوں کو الگ الگ کرتی ہے۔ جو لوگوں میں نفرت پیدا کرتی ہے۔ وہ مذہب جھوٹا مذہب ہے۔ انھوں نے یہ بتلایا کہ مذہب کی روح ملانے والی روح ہے۔ مذہب کی روح ایک دوسرے کو پہچاننے والی روح ہے۔ مذہب کی روح خدمت کی روح ہے، مذہب کی روح دوسروں کیلئے اپنے کو مٹانے کی روح ہے۔ مذہب کی روح وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ اور ایکا ایسا سبق ہے جو تمام مذہبی جماعتوں اور مذہبی جماعتوں اور تمام ان لوگوں کو سیکھنا چاہئے۔ جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنانا چاہتے ہیں۔ زبان کے اوپر، یا کسی جذہب کے اوپر ٹکڑیاں بنا کر ہماری زندگی کی وحدت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو سب سے بڑا مرض ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس جو چھوٹی وفاداریاں ہیں۔ تنگ وفاداریاں ہیں وہ زیادہ قوی ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ اپنی چھوٹی وفاداریوں کو اس بڑی وفاداری کے تابع کریں۔ کوئی ضرورت نہیں کہ چھوٹی وفاداریاں توڑ دی جائیں۔ کسی کیلئے یہ ضروری نہیں کہ وہ سکھ نہ رہے، مسلمان نہ رہے، ہندو نہ رہے، یا پارسی نہ رہے۔ لیکن اس کو پہلے اس دیس کا، پھر تمام انسانیت کا خادم بننا چاہئے۔ تب وسچا مسلمان ہے۔ تب وہ سچا ہندو ہے۔ تب وہ سچا پارسی ہے۔ یہ سبق مولانا کی زندگی سے روشن طور پر ہمیں ملتا ہے۔''

بہر حال شخصیت کے ان تمام پہلوؤں کا مقام اتصال دراصل انسانیت ہے۔ اور مولانا آزاد انسانیت کی معراج پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ عموماً ایسی علمی شخصیتوں کے متعلق یہ کیا جاتا ہے۔ کہ یہ شخصیت عالم باعمل تھی۔ مگر میں قطعاً یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ مولانا بھی عالم باعمل تھے۔ بلکہ میری دانست میں مولانا عالم باعمل نہیں۔ وہ تو عامل باعلم تھے۔

حواشی

۱۔ مولانا آزاد۔ ایک ہمہ گیر شخصیت۔ ۹۷ ۲۔ الہلال۔ ۲۷/ جولائی ۱۹۱۲ء۔

۳۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت۔ ۹۸

۴۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت۔ ۱۲ ۵۔ آواز دوست از مختار مسعود۔ ۱۴۹

۶۔ مولانا آزاد کی کہانی از ڈاکٹر ظفر احمد نظامی ۱۰۲ ۷۔ مولانا آزاد کی کہانی از ڈاکٹر ظفر احمد نظامی ۱۰۲

صبیحہ خورشید (کامپٹی، مہاراشٹر)

ماہیے کی تحریری ہیئت

ماہیا دراصل ایک لوک گیت ہے جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ پنجاب کی عوام کے دل کی دھڑکنوں میں بستا ہوا آرہا ہے۔ انگریزی دورِ حکومت میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے زمانے میں انگریزوں نے ہندوستانی زبانوں میں دلچسپی لینی شروع کی تب ہی لوک گیتوں کو جمع کرنے کا بھی آغاز ہوا۔ لہٰذا دوسرے ہندوستانی لوک گیتوں کی طرح ماہیے بھی جمع کیے گئے۔ ماہیے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے چلے آرہے تھے اب تحریری صورت میں نظر آنے لگے۔ ابتدائیں میں جو ماہیے تحریری کئے جاتے تھے وہ ایک ہی سطر میں ہوتے تھے۔ اسکے بعد ماہیا ڈیڑھ سطر میں لکھا جانے لگا۔ بعد میں اسکی لے کے اتار چڑھاؤ کی تین مختلف کیفیتوں کے احساس سے ماہیا لاشعوری پر سہ مصرعی فارم میں ہی لکھا جانے لگا۔ اب اردو اور پنجابی میں سہ مصرعی فارم ہی ماہیے کی مقبول اور مروج صورت ہے۔

ماہیے کی ابتدائی یک سطری تحریر:

کوٹھے اتوں اڈ کانواں، سد پٹواری نوں، چند ماہیے دے نالاتوں۔

ڈیڑھ سطری صورت / ہیئت:

کوٹھے اتوں اڈ کانواں
سد پٹواری نوں چند ماہیے دے ناں لانواں

سہ مصرعی شکل:

کوٹھے اتوں اڈ کانواں
سد پٹواری نوں
چند ماہیے دے ناں لانواں

ماہیے کی تحریر ہیئت میں جو اختلاف ہے وہ صرف اور صرف اسے تحریری صورت میں پیش کرنے کی وجہ سے ہی ہے۔ ورنہ تینوں صورتوں میں ماہیے کا وزن ایک ہی ہوگا۔

مذکورہ بالا تینوں تحریروں میں ماہیئے کا جو وزن ہے وہ اس طرح سے ہے۔

فعلن فعلن فعلن

فعلن فعلن فع

فعلن فعلن فعلن

پنجابی زبان میں صدیوں سے ماہیا لکھنے کا کوئی رواج نہ تھا۔ اسکی کوئی تحریری ہیئت نہ تھی۔ جب ماہیوں کو جمع کرنے کا آغاز ہوا۔ تب اسے تینوں ہیئتوں میں لکھنا شروع کیا گیا۔ ایک سطر، ڈیڑھ سطر، تین سطر میں جبکہ ان تینوں ہیئتوں میں کوئی بھی پنجاب کی دیہاتی عوام کی ایجاد نہیں ہے کیونکہ وہ صرف ماہیئے گاتے تھے۔ لکھتے نہیں تھے۔ حیدر قریشی ایک سطر میں تینوں مصرعوں کو لکھنے کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جب ماہیا جمع کرنے کا کام شروع ہوا تو جمع کرنے والوں نے شاید کاغذ کے بچت کے خیال سے ایک سطر میں لکھنا شروع کیا گیا لیکن پھر جب ماہیئے کی تین الگ الگ مصرعوں کی پہچان ہوئی تو اسے سہ مصرعی صورت میں لکھا جانے لگا''۔

ماہیئے کی تحریری ہئیت کے سلسلے میں تنویر بخاری نے ماہیئے کی دو ہئیتیں بطور نمونہ پیش کی ہے۔ وہ یہ ہیں۔

(۱) کوٹھے تے راہ کوئی نہیں

ملاں قاضی مسئلہ کیتا پاری لاونا گناہ کوئی نہیں

(۲) دو پتر اناراں نے ساڈے بنے آ بیٹھے کلبوتر یاراں نے

پنجابی اور اردو کے مشہور شاعر امین خیال نے اپنے مضمون ''پنجابی ماہیا'' میں ماہیا کو بطور نمونہ اس طرح ایک ہی سطر میں پیش کیا ہے۔

تھالی وچ کھنڈ ماہیا کنڈ وے کے لنگھنا ایں تیری کنڈ دی وی ٹھنڈ ماہیا۔

(بحوالہ گلبن احمد آباد ماہیا نمبر۔ صفحہ ۲۴)

ماہیئے کو جب تحریری شکل دی گئی تب اس پر طرح طرح کے اعتراضات کئے گئے۔ کسی نے اسے ایک مصرعی لکھا کسی نے ڈیڑھ مصرعی اور کسی نے سہ مصرعی۔ چند لوگوں نے اسکی ڈیڑھ مصرعی ہیئت پر اصرار کیا۔ جس کے جواب میں ماہیا شناسوں نے اپنے اپنے موقف کا اس طرح سے اظہار کیا۔

حیدر قریشی ماہیا جگت کا ایک معتبر نام ہے ان کے بقول:

''اگر پنجابی لوک گیتوں کی تحریری ہیئت واقعتاً ڈیڑھ مصرعی ہے تو اور اس کے سوا کچھ نہیں تو ہمیں یقیناً ڈیڑھ مصرعی ہیئت پر اصرار کرنا چاہئے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر منفی رویے کو ترک کر دینا چاہئے اور اصل سچائی کو مان لینا چاہئے''۔ (کتاب اردو ماہیے کی تحریک از حیدر قریشی ص ۱۵۸)

پروفیسر شارب جو کہ پنجابی زبان کے اسکالر ہیں اپنے مضمون ''کچھ ماہیئے بارے میں'' ماہیئے کی تحریری ہیت کے بارے میں فرماتے ہیں۔

''نہ تو ان لوک گیتوں کو جمع کرنے کا کام کیا گیا اور نہ ہی یہاں کے عالموں نے ان کے بارے میں کوئی تحریری نوعیت کا کام کیا۔'' (پنجابی سے ترجمہ)

آگے پروفیسر شارب اسی مضمون میں پنجابی دیہاتیوں کی ماہیئے کی لے کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔

''ان سیدھے سادے اپنے کام سے غرض رکھنے والے دیہاتیوں کے مدنظر تو یہ ہے کہ ماہیا سُر اور لے میں ہو تو سب ٹھیک ہے۔ سُر (لے) کو گاتے وقت وہ خود ہی ٹھیک رکھتے ہیں۔ کیوں کہ وہ نسل در نسل اسے سنتے آئے ہیں اور ان سے زیادہ سُر کی روایت کو کون جان سکتا ہے۔'' (پنجابی سے ترجمہ) اور اس سے تھوڑا آگے چل کر پروفیسر شارب لکھتے ہیں کہ یہ عوامی ماہیئے ''کسی کتاب کی بجائے سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچتے ہیں۔'' (مضمون 'کچھ ماہیئے کے بارے میں')۔

پروفیسر شارب کی تحریری روایت سے تو یہی حقیقت سامنے آتی ہے کہ ماہیا کاغذ قلم کے ذریعے نہیں بلکہ سینہ بہ سینہ عوام تک پہنچا ہے۔ اسکے لکھنے کا چلن کافی بعد میں ہوا۔ دیہاتیوں کے نزدیک اسکی لے ہی اسکی پہچان تھی۔ لہٰذا ہم ماہیئے کی ڈیڑھ مصرعی ہیئت کا حکم نہیں صادر کر سکتے ہیں۔

درج بالا تحریر کے علاوہ ماہیئے کی تحریری ہیئت کے بارے میں جو روایات درج ہیں حیدر قریشی صاحب کی تحقیق کی روشنی میں دیکھتے چلیں۔

۱۔ **ڈاکٹر روشن لال اہوجا:**

''ایہہ یاں (ماہیئے دیاں) تن تکاں ہوندیاں نیں''

(لہندے دے لوک گیت'' مطبوعہ ماہنامہ ''کوتا'' امرتسر جون ۱۹۹۵ء)

ڈاکٹر روشن لال اہوجا نے اپنے اسی مضمون میں مندرجہ ذیل ماہیا بطور نمونہ پیش کیا ہے۔

کوٹھے تے وان پیا

نکیاں نکیاں کنیاں

ڈھولا چادرتان پیا

۲۔ **علامہ غلام یعقوب انور:**

تنویر بخاری نے اپنی کتاب ''ماہیا فن نے بتر کے صفحہ نمبر ۲۸ پر یہ روایت درج کی ہے کہ ''۱۹۶۵ء سے بھی پہلے کی بات ہے میں نے ایک بار اپنے دوست اور بزرگ حضرت علامہ غلام یعقوب انور (ایڈووکیٹ) کے ساتھ ماہیئے کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ لوگ اسے ڈیڑھ مصرعے کا کہتے

ہیں جبکہ یہ پورے تین مصرعوں کا ہے وہ میرے ساتھ بالکل متفق تھے۔'' (پنجابی سے ترجمہ)

۳۔ فارغ بخاری:

فارغ بخاری نے اپنی کتاب ''سرحد کے لوک گیت'' میں جو ماہیے درج کیے ہیں وہ سہ مصرعی ہیئت میں ہیں۔

۴۔ پروفیسر شارب:

پروفیسر شارب نے اگرچہ اپنے جمع کردہ ماہیے ڈیڑھ مصرعی ہیئت میں شائع کئے ہیں۔لیکن انہوں نے دوسرے مصرعے کو دوا لگ الگ یونٹ بنا کر پیش کیا ہے اور یہ اقرار بھی کیا ہے کہ ماہیے کے تین یونٹ ہوتے ہیں۔

۵۔ اسلم جدون:

اسلم جدون کے تمام ماہیے سہ مصرعی ہیئت میں ہیں۔ مجھے ان ماہیوں کے معیار پر اعتراض ہے۔لیکن ظاہر ہے یہ ایک الگ موضوع ہے۔ جہاں تک ہیئت کا تعلق ہے۔اسلم جدون کی کتاب ''ماہیے'' سہ مصرعی ہیئت کا اثبات کرتی ہے۔

۶۔ ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری:

ممتاز پنجابی دانشور ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری نے ماہیے پر جتنی محنت کی ہے اس کی سہ مصرعی ہیئت کو مدنظر رکھ کر کی ہے۔انہوں نے ڈیڑھ مصرعی ہیئت کو سرے سے اہمیت ہی نہیں دی۔

۷۔ شفقت تنویر مرزا:

پروفیسر شارب کی کتاب ''ماہیا'' پر تبصرہ کرتے ہوئے شفقت تنویر مرزا نے روزنامہ ''ڈان'' لاہور کی ۱۹/اپریل ۱۹۹۵ء کی اشاعت می سہ مصرعی ماہیوں کی دو مثالیں پیش کی ہیں اور انہیں قابل اعتراض نہیں گردانا۔

۸۔ تنویر بخاری:

افضل پرویز، عبدالغفور قریشی، مقصود، ناصر چودھری، کرم حیدری اور محمد بشیر احمد نظامی کے ڈیڑھ مصرعی ہیئت کے ماہیے کے بیانات درج کرنے کے بعد تنویر بخاری کہتے ہیں ''مرتب (تنویر بخاری) اوپر درج کئے گئے کسی بیان سے بھی متفق نہیں۔ یہ سارے بزرگ لائق احترام ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی گہرائی میں جانے کی زحمت نہیں کی۔ان سب کے بیانات میں مشابہت ہے اور ایسے لگتا ہے جیسے ان سب نے کسی کتابی بیان کی نقل کی ہے اور اپنے طور پر کچھ غور نہیں کیا۔'' (پنجابی سے ترجمہ)

تنویر بخاری سہ مصرعی ہیئت کے قائل ہیں ان کی کتاب ''ماہیا۔فن تے بنتر'' ۱۹۸۸ء میں شائع

ہوئی تھی اور اس میں شامل کیا گیا سارا انتخاب سہ مصرعی ہیئت میں تھا۔

۹۔ امین خیال:

اردو اور پنجابی کے معروف شاعر امین خیال اپنے مضمون ''پنجابی ماہیا'' میں لکھتے ہیں۔

''ماہیا اپنی ہیئت کے اعتبار سے تین حصوں، تین ٹکڑوں، تین کلیوں، تین مکھڑوں، تین پتیوں پر ہی مشتمل ہے۔کیوں کہ لمبے یا بڑے مصرعے کا وسرام اسے دو حصوں میں بانٹ دیتا ہے اور گاتے وقت بھی یہ تینوں برگ واضح ہو جاتے ہیں'' (دو ماہی گلبن احمد آباد۔ماہیا نمبر۔جنوری ۱۹۹۸ء) (ماخوذ از اردو ماہیے کی تحریک صفحہ ۶۲۔۱۶۱)

خلاصۂ کلام یہ کہ اردو اور پنجابی کے مستند شاعر، دانشوروں اور مفکروں کے موقف کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ماہیے کی تحریری ہیئت میں سہ مصرعی فارم ہی صحیح فارم ہے اور ماہیا سہ مصرعوں میں ہی لکھا جائے گا۔

ماہیے کی درست اور رائج ہیئت:

کوٹھے اتوں اڈ کانواں
سد پٹواری نوں
جند ماہیے دے نالاں نوں

علاوہ ازیں کلیم شہزاد نے ماہیے کی ظاہری ہیئت میں دو طرح کے تجربات کیے ہیں۔ پہلا تجربہ ماہیے کی گائیکی کو ذہن میں رکھتے ہوئے پہلے مصرعہ کو تیسرے مصرعہ کے بعد دوبارہ پھر دہرایا۔اس ضمن میں حیدر قریشی فرماتے ہیں:

''بات صرف دوسرے مصرعے کو دہرانے کی حد تک ہوتی تو اسے کلیم شہزاد کی منفرد دِکھنے کی کاوش سمجھا جا سکتا تھا۔لیکن معاملہ صرف اتنا نہیں ہے۔حقیقت یہی ہے کہ کلیم شہزاد کے پہلے مصرعے کا چوتھی لائن میں دہرایا جانا معنوی تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے کسی داخلی حوالے تک بھی لے جاتا ہے۔ان کے یہ ماہیے دیکھیں اور ان کے مصرعوں کے ربط باہم سے پیدا ہونے والے معنوی تسلسل پر غور کریں:۔

سب کچھ تھا اشاروں پر
جیون پیاسا تھا
دریا کے کناروں پر
سب کچھ تھا اشاروں پر

تتلی پر پہرے تھے
زنگ آلود ہوئے
جو رنگ سنہرے تھے
تتلی پر پہرے تھے ۴؎

ماہیے کی ظاہری ہیئت میں کلیم شہزاد نے دوسرا تجربہ پنجابی لوک گیت کے ایک خطابیہ ''میریا وے ماہیا'' کا ترجمہ ''میرے اے ماہی!'' کی اضافی سطر کے ساتھ کیا۔

میرے اے ماہی!
فصلیں پک گئی ہیں
کب تو آئے گا
اب آنکھیں تھک گئی ہیں

میرے اے ماہی!
اک جنگل بیلہ ہے
گھر کو واپس آ
اب شام کا ''ویلا'' ہے

ماہیے میں اس طرح کے تجربات اردو ماہیے کو پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کریں گے۔''

حوالہ جات

۱۔ پنجابی لوک گیت۔ ماہیے کی تحریری ہیئت
مطبوعہ: ماہنامہ ''سخنور'' کراچی شمارہ اپریلک ۱۹۹۹ء
۲۔ اردو ماہیے کی تحریک۔ از حیدر قریشی صفحہ نمبر ۱۵۹
۳۔ وہ چاند گواہ میرا۔۔۔ پیش لفظ از حیدر قریشی صفحہ نمبر ۱۱

ماہیے کا وزن

ماہیا ایک غنائی صنفِ شاعری ہے۔ جس کا تعلق گائیکی سے ہے ماہیا کبھی بھی کاغذ قلم کا محتاج نہیں رہا بلکہ صدیوں سے سینہ بہ سینہ عوام کے ذریعہ سفر کرتا رہا چنانچہ یہ گائے جانے والی شاعری پہلے ہے اور اسکے لکھنے کا چلن بہت بعد کی بات ہے۔ اس گائیکی سے تعلق رکھنے والی شاعری کی اپنی ایک مخصوص لے اور دھن ہوتی ہے اسے گانے کا اپنا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم ماہیے کو سب سے پہلے اس کی دھن پر آزما کر چیک کریں گے اور اسی ماہیے کو حقیقی معنوں میں ماہیا کہیں گے۔ جو سہولت اور روانی کے ساتھ گایا اور گنگنایا جاسکتا ہو۔

ماہیا سہ مصرعی صنفِ شاعری جس کے وزن اور دھن کے سلسلے میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی لکھتے ہیں۔

''کسی بھی گانے کی دھن میں پہلا مصرعہ ماہیے کا اٹھاتے وقت جو لَے ہوتی ہے اسی لَے میں تیسرے مصرعہ کو بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔ لیکن دوسرے مصرعہ کو پہلے مصرعہ کے انداز میں اٹھانا چاہیں تو لَے ٹوٹ جاتی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ ماہیے کے پہلے اور آخری دونوں مصرعہ یکساں وزن کے ہیں۔ لیکن دوسرا مصرعہ اس وزن میں نہیں۔۔۔۔'' [1]

لہٰذا دوسرے مصرعہ میں ایک سبب کم والا وزن ہی ایسا ہے جسے ہم سہولت اور روانی کے ساتھ گا اور گنگنا سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں تین مساوی الوزن مصرعوں میں اور دوسرے مصرعے میں ایک سبب زائد والے مصرعے میں ہمیں جھٹکا لگنے اور اٹکنے کا احساس ہوتا ہے۔ اس موقف کو ہم تجربے کے ساتھ بھی دیکھ سکتے ہیں۔

تین مساوی الوزن مصرعہ
فعلن فعلن فعلن
فعلن فعلن فعلن
فعلن فعلن فعلن

دوسرے مصرعہ میں ایک سبب زائد والا وزن
فعلن فعلن فعلن
فعلن فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فعلن

دوسرے مصرعہ میں ایک سبب کم والا وزن
فعلن فعلن فعلن
فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فعلن

۱۔ مذکورہ بالا ماہیوں کے اوزان کو باری باری ماہیے کی کسی دھن پر گنگنائیے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ دوسرے مصرعہ میں ایک سبب کم والا وزن ہی ایسا ہے جو ہم سہولت اور روانی کے ساتھ گنگنا سکتے ہیں۔ جس میں کہیں جھٹکا لگنے یا اٹکنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اسطرح یہ موقف صد فی صد صحیح ثابت ہوتا ہے کہ ماہیے کے تینوں مصرعہ مساوی نہیں ہوتے بلکہ پہلا اور تیسرا مصرعہ ہم وزن ہوتا ہے اور دوسرا مصرعہ میں ایک سبب یا دو حرف کم ہوتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ماہیا جب پنجابی سے اردو میں آیا تو اسکی تحریری صورت میں اختلاف پیدا ہوگیا بعض ادباء اسکے دوسرے مصرعہ کے نازک فرق کو نہیں سمجھ سکے اور لاشعوری اور لاعلمی کے نتیجے میں ہم وزن مصرعوں کے ماہیے تحریر کرتے رہے۔ مثالیں:

کیا روگ لگا بیٹھے
دل ہم کو لٹا بیٹھے
ہم دل کو لٹا بیٹھے

(اختر شیرانی)

اک جام پلا جاؤ
لمحات بلاتے ہیں
مدہوشی بنا جاؤ

(بشیر منذر)

سمٹی ہوئی چاہیں ہیں
پھیلی ہوئی راہوں پر
مایوس نگاہیں ہیں

(عبدالمجید بھٹی)

دونین تھے چھاگل سے
کچھ اور نہ تم پوچھو
ہم لوگ ہیں پاگل سے

(علی محمد فرشی)

سنتا ہے نہ کہتا ہے
گم اپنے خیالوں میں
پاگل کوئی رہتا ہے

(نصیر احمد ناصر)

چاند کی کٹوری ہے
بیوی میرے بھائی کی
کہتے ہیں چٹوری ہے

(سیدہ حنا)

ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ماہیا پنجابی لوک گیت ہے اور اس کی مخصوص لے ہے۔اس بنیاد پر اگر ہم مذکورہ بالا مساوی الوزن مصرعوں والے ماہیوں کو پنجابی لوک لے ماہیا کی طرز پر گانا اور گنگنانا چاہیں تو ہم نہیں گنگنا پاتے۔لہٰذا یہ ماہیا نہ ہو کر ثلاثی کی طرح کوئی اور صنف ہوئی۔

ماہیا کے بنیادی وزن کے سلسلے میں مختلف آرائیں۔

غلام یعقوب انور کے مطابق ماہیے کا وزن فعلات مفاعلین ہے جبکہ پروفیسر شارب اور تنویر

بخاری ماہیے کا وزن مفعول مفاعلین بیان کرتے ہیں۔ان کے علاوہ ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری نے فعلن فعلن فعلن کا وزن پیش کیا ہے۔پروفیسر شارب اپنے مضمون ''کچھ ماہیے بارے میں'' میں فرماتے ہیں

''سر ٹھیک لگدی ہووے تاں سب ٹھیک اے۔۔۔ماہیا سُر میں ہو تو سب ٹھیک ہے۔سُر کو گاتے وقت دیہاتی لوگ خود ہی ٹھیک رکھتے ہیں کیوں کہ وہ نسل در نسل اسے سنتے آئے ہیں اور ان سے زیادہ سُر کی روایت کو کون جان سکتا ہے(پنجابی سے ترجمہ) ۲

اپنی کتاب ''اردو میں ماہیا نگاری'' میں حیدر قریشی ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری اور تنویر بخاری کی آرا پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ

''وزن کی بحث پر دونوں پنجابی اسکالر کا اختلاف واضح طور پر سامنے آیا ہے۔جہاں تک ماہیے کے پہلے اور تیسرے مصرعے کا تعلق ہے مفعول۔مفاعلین بھی ہوسکتا ہے اور فعلن فعلن فعلن بھی ہوسکتا ہے۔غور کیا جائے تو ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری کا موقف زیادہ جاندار ہے کیوں کہ مفعول مفاعلین بھی عملی طور پر حقیقتاً فعلن فعلن فعلن کا روپ دھار لیتا ہے۔مفعول مفاعلین۔۔۔

تاہم تنویر بخاری کا موقف بھی یکسر غلط نہیں ہے۔کیوں کہ بعض ماہیے کے دوسرے مصرعہ کا بنیادی وزن سے ایک سبب یعنی دو حروف کم ہوتا ہے۔ماہیے کا پہلا اور تیسرا مصرعہ اگر مفعول مفاعلین کے وزن پر ہے تو اس کے دوسرے مصرعہ کا وزن فعل مفاعلین بنتا ہے۔یوں پورے ماہیے کا وزن یہ ہوگا:

مفعول مفاعلین
فعل مفاعلین
مفعول مفاعلین

اگر ماہیے کا پہلا اور تیسرا مصرعہ فعلن فعلن فعلن کے وزن پر ہے تو اس کے دوسرے مصرعہ کا وزن فعلن فعلن فع بنتا ہے۔یوں پورے ماہیے کا وزن یہ ہوگا۔۔۔

فعلن فعلن فعلن
فعلن فعلن فع
فعلن فعلن فعلن

اپنی بحث کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے حیدر قریشی رقم طراز ہیں:

''ڈاکٹر جمال ہوشیار پوری اور تنویر بخاری گہری نظر سے کام نہیں لے سکے شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ دونوں صاحبان ماہیے کے پہلے مصرعہ کو بنیاد مان کر ان کے وزن کی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ماہیے کی دھن پر پورا دھیان نہ دینے کے باعث ماہیے کے پہلے اور تیسرے مصرعوں کے مقابلہ میں

دوسرے مصرعہ میں ایک سبب کی کمی کا نازک فرق انہیں سمجھ میں نہ آسکا ہو۔''

آگے وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

''اردو زبان میں زحافات کا تعین ہے۔جن حروف کو گرانے کی اجازت ہے ان کی وضاحت موجود ہے۔لیکن پنجابی زبان میں ایسا کوئی ضابطہ یا اصول نہیں ہے۔ضرورت شعری کے مطابق اس کے حروف کو کھینچ کر لمبا بھی کرلیا جاتا ہے۔اور گرا کر مختصر بھی کرلیا جاتا ہے۔اس عمل کے دوران ملفوظی اور غیر ملفوظی حروف کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔پنجابی زبان میں اس رعایت کا فائدہ ماہئے میں بھی اٹھایا گیا۔جن صاحبان نے پنجابی ماہئے کو تحریری صورت میں دیکھا اور پھر اسے اردو قواعد کے مطابق سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کی وہ اپنی تمام تر نیک نیتی اور اخلاص کے باوجود مغالطے کا شکار ہوگئے۔''۳۵

ماہئے کا وصف اس کی مخصوص دھن ہے نہ کہ اسکی تحریری ہیئت لیکن جب لوگوں نے ماہیوں کو تحریری صورت میں دیکھا تو مغالطے کا شکار ہوگئے اور غلط فہمی کے باعث شعرائے کرام نئے نئے اوزان اور من چاہی بحروں میں مشق آزمائی کرنے لگے اور اس طرح سے ماہیا بھیڑ چال کا شکار ہوگیا۔ مثالیں:

کچھ پا کر کھویا ہے
تر آنکھ ہے نرگس کی
کیا باغ بھی رویا ہے
(عنبر عشرت)

چاندی کی ہیں پازیبیں
اس عید پہ بتلاؤ
تحفہ تمہیں کیا بھیجیں
(**سیدہ حنا**: اوراق ۱۹۹۸)

سچ کہنے کی جرأت دے
اے داتا مگر پہلے
سچ سننے کی ہمت دے
(**دیپک قمر**: توازن مالیگاؤں ۱۹۹۹)

تب ایسے حالات میں درست وزن کی طرف توجہ سب سے پہلے ممتاز عارف نے دلائی۔حیدر قریشی نے بھی اس طرف توجہ کی اور ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۶ء تک ماہئے کی ہیئت وزن اور مزاج پر مختلف ادبی رسائل میں بحث شروع ہوئی۔جس میں خصوصی طور پر افتخار احمد، ناصر عباس نیرؔ، پروفیسر عرش صدیقی، ڈاکٹر مناظر

عاشق ہرگانوی، سعید شباب، ریاض احمد، خاور اعجاز، ایم اے تنویر، نثار ترابی، اور غزالہ طلعت نے بحث میں حصہ لیا نتیجتاً ماہئے کے خدوخال نمایاں ہوئے اور اس کے مزاج کے مسئلے کو خلوص کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ساتھ ہی ڈاکٹر فہیم اعظمی، ڈاکٹر انور سدید اور حمایت علی شاعر کے مختلف تاثرات نے بھی درست وزن کے ماہیوں کو تقویت بہم پہنچائی۔تب ہی حیدر قریشی نے درست وزن کی ماہیا نگاری کی تحریک چلائی اور ماہیا کی دھن کو معیار مان کر اس کے درست وزن دریافت کئے گئے جو کہ سب کے سب ماہئے کی پنجابی لے میں فطری بہاؤ کے ساتھ گنگنائے جاسکتے ہیں۔

ماہیے کی عروضی بحث میں یوں تو بہت سارے لوگوں نے حصہ لیا، ایسے لوگوں نے بھی جنہیں عروض کا کچھ علم نہ تھا اور ایسے لوگوں نے بھی جنہیں عروض کا علم تو تھا لیکن ماہیے کی لوک لے کا کچھ علم نہ تھا۔تاہم جو لوگ بھی اردو میں ماہیے کے لیے عروضی پیمانے مقرر کرنے کا جتن کر رہے تھے، ان سب کے اخلاص اور نیک نیتی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔احمد حسین مجاہد، عارف فرہاد، علامہ شارق جمال اور ناوک حمزہ پوری نے اس میدان میں بطورِ خاص دلچسپی لی۔اور مختلف و متبادل عروضی پیمانوں کے تعین میں اردو ماہیے کے استحکام کے لیے کاوش کی۔ان کے علاوہ خضر ناگپوری نے بھی نہایت خلوص کے ساتھ اس کام میں دلچسپی لی۔

خضر ناگپوری اپنی کتاب ''راز حیات'' میں ماہیے کی بحر کا تعین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

''آیئے ہم پہلے ''ماہیا'' کا زیر بحث آہنگ دیکھیں پھر اصول، بحور و ارکان تجویز کریں۔پنجابی ماہیے کا آہنگ (جیسا کہ تمام مضامین سے ظاہر ہے۔) ان دونوں اوزان پر مشتمل ہے۔

۱:۔ مفعول مفاعیلن — فاع مفاعیلن — مفعول مفاعیلن

۲:۔ فعلن فعلن فعلن — فعلن فعلن فع — فعلن فعلن فعلن

اصول و بحر کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ''ماہیا کے آہنگ کا تقاضہ کیا ہے، بڑے مصرعے بحر ہزج اخرب سالم میں بالکل ٹھیک ہیں۔لیکن چھوٹے مصرعے کا تقاضہ ہے کہ اس کی شناخت کے لیے اس کی اپنی بحر ہو۔ماہیا کی بحروں کو مربع مربع، مسدس یا مثمن لکھنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔کیوں کی ان کے ارکان کی تعداد کبھی کم زیادہ نہیں ہوتی۔اسی طرح اس میں ابتداء، صدر، عروض، ضرب اور حشوین کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ایک ہی بحر میں چھوٹے بڑے مصرعے بھی نہیں کہے جاسکتے کہ یہ اردو شاعری میں قواعد عروض کی خلاف ورزی ہے۔بحر کا رکن سالم ''مستفعلن ، زحاف طی سے مفتعلن بروزن ''فاع مفا'' اور زحاف سے حذ سے ''فعلن'' بروزن عیلن ہے یعنی مفتعلن فعلن ، ہے۔بروزن'' فاع مفاعیلن'' ہے۔مفعول مفاعیلن عمل تخنیق سے مفعولم فاعیلن'' بروزن'' مفعولن مفعولن یعنی فعلن فعلن فعلن فعلن کا ہم وزن ہے۔اس طرح مفتعلن عمل تسکین سے مفعولن بروزن ''فعلن فع'' ہے۔بحر رجز، بحر ہزج کے انفکا کسے حاصل ہوئی

ہے اسلئے ''ماہیا'' میں ان دو بحروں کی جوڑی نہایت مناسب ہے،''

آ گے خضر ناگپوری ماہیا کا عروضی اصول بتاتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''ماہیا ان تینوں مصرعوں کے تسلسل کو کہتے ہیں جو دو مخصوص بحروں کے مخصوص اوزان پر کہا جاتا ہے۔(اس اصول سے کسی وزن میں تین مصاریع کہہ کر اسے ماہیا کا نام دینے کا جو غلط چلن کا رواج پا گیا ہے۔وہ رک جائیگا۔'' بحور ماہیا:۔

۱:۔ بحر ہزج اخرب سالم — مفعول مفاعیلن

بحر رجز مطوی اخذ — مفتعلن فعلن

بحر ہزج خرب سالم — مفعول مفاعیلن

۲:۔ بحر ہزج مخنق اخرب سالم — مفعول مفاعیلن

بحر رجز مسکن مطوی احذ — مفعول فعلن

بحر رجز مخنق اخرب سالم — مفعولن مفعولن

ماہیے کا درست اور رائج وزن:۔

فعلن فعلن فعلن

فعلن فعلن فع

فعلن فعلن فعلن ۴؎

جملہ عروضی مباحث کو ماہیا کی لَے کا پابند قرار دینے پر اصرار کرتے ہوئے حیدر قریشی نے بڑی صراحت کے ساتھ لکھا؛

''مجموعی طور پر اب تک آٹھ متبادل اوزان سامنے آ چکے ہیں۔کسی عروضی بکھیڑے میں پڑے بغیر میرے لئے یہ سب کے سب اس لئے قابل قبول ہیں کہ یہ ماہیے کی پنجابی لے میں فطری بہاؤ کے ساتھ گنگنائے جا سکتے ہیں۔ابھی تک کے دریافت شدہ آٹھ اوزان یہ بنتے ہیں۔

(۱)		(۲)	
	مفعول مفاعیلن		فعلن فعلن فعلن
	فعِل مفاعیلن		فعلن فعلن فع
	مفعول مفاعیلن		فعلن فعلن فعلن
(۳)	فعلات مفاعیلن	(۴)	فعلاتن فعلاتن
	فعِل مفاعیلن		فعلاتن فعلن
	فعلات مفاعیلن		فعلاتن فعلاتن

(۵)		(۶)	
	مفعول مفاعیلن		مفعول مفاعیلن
	فعِل فعولن فع		فاع مفاعیلن
	مفعول مفاعیلن		مفعول مفاعیلن
(۷)	فعلن فعلن فعلن	(۸)	مفعولن مفعولن
	مفتعلن فعلن		مفعولن فعلن
	فعلن فعلن فعلن		مفعولن مفعولن

پنجابی سے ناآشنا اردو والے دوستوں کی آسانی کیلئے فلم پھاگن میں محمد رفیع اور آشا بھوسلے کے گائے ہوئے مکالماتی ماہیوں کا حوالہ دے رہا ہوں۔تم روٹھ کے مت جانا/ مجھ سے کیا شکوہ/ دیوانہ ہے دیوانہ۔اس دو گانے کی دھن کو معیار بنالیں اور پھر مذکورہ بالا آٹھوں اوزان کو اس دھن پر گنگنا کر چیک کرلیں۔یہ سارے اوزان اس دھن پر پورے اترتے ہیں۔پنجاب سے تعلق رکھنے والے شعرا یا پنجابی سے آشنا اردو شعراء کو اردو میں ماہیے کہتے وقت کسی عروضی حساب کتاب کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ وہ تو ماہیے کی لے کے بہاؤ میں روانی سے ماہیے کہتے جاتے ہیں۔یہ جو تھوڑا بہت عروضی فہیم کا سلسلہ چلا ہے تو ان دوستوں کی سہولت کے لئے جو پنجابی ماہیے سے آشنا نہیں ہیں،ممکن ہے ان آٹھ اوزان کے علاوہ بھی مزید متبادل اوزان تلاش کر لئے جائیں۔یوں ماہیے میں عروضی لحاظ سے خاصی آزادی مل جائے گی لیکن یہ ساری آزادی ماہیے کی لے کے اندر ہی میسر ہوگی۔جن دوستوں کو اردو کے عروضی قواعد سے ہٹنا اچھا نہیں لگتا وہ آخر الذکر تین اوزان کو آسانی سے اپنا سکتے ہیں۔''۵؎

مذکورہ بالا بحث سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ماہیا تین مساوی الوزن مصرعوں پر مشتمل نہیں ہوتا۔اس کے لیے دوسرے مصرعے میں ایک سبب کا کم ہونا احسن سمجھا جاتا ہے۔کیونکہ اسی طرح ماہیا اپنی لوک لَے کے مطابق رہتا ہے۔

حواشی

۱:۔مضمون ماہیا اور اس کے وزن کا تعین۔از شارق جمال ناگپوری (گلبن احمد آباد ۱۹۹۸ء ماہیا نمبر صفحہ ۶۰)

۲:۔ مضمون ماہیے کی کہانی۔۔از حیدر قریشی (گلبن احمد آباد ماہیا نمبر ۱۹۹۸ء صفحہ ۲۷)

۳:۔ماخوذ از ماہیے کا وزن کا مسئلہ (حیدر قریشی) مطبوعہ اردو ماہیا نگاری صفحہ ۱۵۔۱۴

۴:۔ کتاب ''راز حیات'' از خضر ناگپوری صفحہ نمبر ۲۶۔۲۵

۵۔انتخاب از خط بنام ''ایڈیٹر ماہنامہ 'ایوان اردو' از حیدر قریشی'' (مطبوعہ ماہنامہ ''ایوان اردو'' دہلی ستمبر ۱۹۹۸ء)

نورالہدیٰ (کلکتہ)

ارشد کمال......مصلوب روزگار
(شاعری کی روشنی میں)

سرزمین ہند میں پائے جانے والے متعدد عجائبات میں ایک عجوبہ اردو شاعری بھی ہے۔نامساعد حالات کے طوفان میں اس کا زندہ رہنا بھی ایک کرامت ہے، ورنہ تاریخ بتاتی ہے کہ جو چیز بھی یہاں جنم لیتی ہے اسے 'دیس نکالا' ملتا ہے۔

ارشد کمال نے شعروشاعری کو اپنا شعار ایسے وقت میں بنایا ہے جبکہ شاعر کے فکروفن کے لئے حالات سازگار نہیں رہے۔اردو زبان خود اپنے وطن میں بے وطنی کی صعوبتوں سے دوچار ہے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ اس دَورِ انحطاط و ابتذال میں بھی شعراء کثرت سے پیدا ہو رہے ہیں اور شعری تخلیقات کی بہتات ہے۔لازمی طور پر جب کسی چیز کی کثرت ہوتی ہے تو اس کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے۔لیکن اصول اور قانون کے کچھ مستثنیات ہوتے ہیں، اسی طرح ارشد کمال کی شاعری اس کثرت میں وحدت کے نمونے پیش کرتی ہے۔علم و ادب کے معاملے میں اخلاق و مروت کے اصولوں کی گنجائش نہیں۔ یہ ایک قسم کی ادبی بے راہ روی ہے۔لہٰذا نہایت ذمہ دار الفاظ میں یہ کہنا بجا ہے کہ ارشد کی شاعری عام روِش سے ہٹ کر ہے۔.....اپنے جذبات و احساسات کے اعتبار سے، اور موضوع کے انتخاب و اظہار نیز ندرت کے زاویے سے بھی۔

ارشد کی شاعری کا مرکزی تصور یا بنیادی سمبال آج کا انسان ہے۔آج کا انسان جس کجروی اور تشکیک کا شکار ہے اور 'پائے رفتن نہ جائے ماندن' کی کشمکش میں مبتلا ہے اس کے نقوش ارشد کی شاعری میں موجود ہیں۔ان نقوش کو ابھارنے کے لئے شاعر نے دردمندی کا سہارا لیا ہے۔اس میں ایک پوشیدہ کرب ہے، ایک ایسا کرب اور بے چینی جو وطن میں بے وطنی، انسانی رشتوں کی بے اعتباری اور سماجی اختلاط و اتحاد کی بے سمتی سے پیدا ہوتی ہے۔

ارشد کمال نظم وغزل ہر دو اصناف سخن کے شاعر ہیں اور دونوں اصناف کے فکری مواد میں بڑی ہم آہنگی محسوس ہوتی ہے۔اظہار کے طریقے میں فرق ہونے کے باوجود مزاج اور پیغام میں فرق نہیں ہے۔عصر حاضر

کا انسان جن حالات سے دوچار ہے ان کی عکاسی نہایت فنکارانہ طور پر کی گئی ہے اور اظہار میں ایک قسم کی نیازمندی اور انکساری ہے جس کی وجہ سے پڑھنے والا اثر قبول کرتا ہے۔ یہ شاعری بدلتی ہوئی قدروں کی شاعری ہے۔زمان و مکان کی قدریں معین ہیں۔قدرت کے قوانین میں استحکام ہے لیکن زمین پر بسنے والے انسان جس ماحول، جس مٹی اور جس آب و ہوا میں رہتے ہیں ان کے اثرات جذبات و احساسات پر پڑتے ہیں۔انسان کا تمدن، اس کے سیاسی، مذہبی، سائنسی حالات بدلتے ہیں تو تخلیقی عمل کے زاویے بھی بدل جاتے ہیں۔لہذا ہر صنف اظہار عصری حالات و واقعات کی مزاج داں ہوتی ہے۔

جس آب و ہوا میں ارشد کی شاعری پرورش پا رہی ہے وہ مادیت اور زر پرستی کا دَور ہے۔وسائلِ زندگی کی سہولتیں اور عیش و آرام کی فراوانی نے سماجی ڈھانچے منتشر کر رکھے ہیں۔آج کا انسان اجتماعی زندگی کی برکتوں سے ناآشنا ہے۔ ہر فرد اپنی ذات میں گم ہے۔وہ قدریں جو آدمی کو انسان بناتی ہیں روبہ انحطاط ہیں۔اخلاقی قدروں کی اسی شکست و ریخت کا ذمہ دارانہ اظہار ہمیں ارشد کی شاعری میں تواتر کے ساتھ نظر آتا ہے۔اس صورت حال سے شاعر سمجھوتہ نہیں کر پاتا ہے۔اس کے اظہار میں حسرت و یاس اور ایک طرح کی بیزاری ہے، لوازمِ حیات کی پامالی کا شکوہ ہے۔ایک تحریر میں اپنے شاعرانہ مافی الضمیر کو ارشد کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں........" جہاں تک شعروادب سے متعلق میری ذاتی رائے کا سوال ہے تو جیسا کہ میں نے اپنے مجموعۂ کلام 'دھوپ کے پودے' کے پیش لفظ میں تحریر کیا ہے، خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا کو انسان خوبصورت بنانے کے بجائے ہر لمحہ بدصورت بنانے میں مصروف ہے اور یہی وہ بنیادی کڑھن ہے جس کا پرتَو مجھے اپنی شاعری میں جابجا نظر آتا ہے۔" ارشد کی شاعری اس صورت حال کے خلاف ایک مہذب احتجاج ہے۔شاعر انسان کی دورنگی سے نالاں ہے ۔

رہزنی ہے جس کی فطرت، راہبر کیوں کر ہوا　　　پھول سے گلچیں کا رشتہ معتبر کیوں کر ہوا
ہر کرن ہی تیرگی کا تازیانہ ہے یہاں　　　وقت ایسی روشنی پر منحصر کیوں کر ہوا
کارزارِ عشق میں بھی اب سیاست آ گئی　　　جو رقیبِ روسیہ تھا، نامہ بر کیوں کر ہوا

....

زمیں پہ غلبۂ شیطاں، فلک برائے ملک　　　بشر غریب پریشاں کہ وہ کدھر جائے

اس طرح کے سوالات ارشد کمال کی شاعری میں جابجا ملتے ہیں، لیکن ان کا جواب زمانۂ حاضر کے دسترس سے باہر ہے۔چنانچہ شاعر ایک روحانی کرب میں مبتلا ہے۔وقت کی صلیب پر لٹکا ہوا وہ اپنے ناکردہ گناہوں کا کفّارہ ادا کر رہا ہے۔اس احساس نے اس کے اندر ایک باغیانہ کیفیت پیدا کر دی ہے ۔

اپنا ٹھکانہ ہی ٹھہرا جب اک صحرا کے آنگن میں　　　کیوں نہ سجائیں بزمِ جنوں ہم ذہن و دل کے آنگن میں
میرا غم جو مشتہر ہو جائے گا　　　یہ جہاں زیر و زبر ہو جائے گا

خیر و شر کے درمیاں اک فیصلہ ہوگا یہاں   یہ کہانی سنتے سنتے وقت بوڑھا ہوگیا

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ارشد کی شاعری ایک مہذب احتجاج ہے اور اس تہذیب نے ان کی شاعری کو متانت اور سنجیدگی سے متصف کیا ہے۔غزل کا مزاج تو یوں بھی اعتدال چاہتا ہے۔ان کی نظموں میں بھی شور اور ہنگامہ نہیں ہے۔تبلیغ و تلقین بھی ان کا شعار نہیں،لیکن تجربات اور مشاہدات کے سہارے انسانی کردار کی کمزوریوں کی طرف اشارہ ضرور کرتے ہیں اور ان اشاروں میں ملیح طنز اور شکوہ شامل ہے۔

کھلتے تھے جن کے دروازے ایک ذرا سی دستک پر   شورِ قیامت سن کر بھی اب آتے نہیں وہ روزَن میں
خاموشی کے جنگل کاٹو، شہرِ صدا کے دیوانو   آوازوں کے پیڑ اُگاؤ اپنے گونگے آنگن میں

....

میں جب بھی کھینچتا ہوں ایک نقشہ روزِ روشن کا   نہ جانے کیسے اس میں شب کا منظر جاگ اُٹھتا ہے!

....

درآتا ہے نہ جانے کس طرح اشعار میں میرے   بظاہر خوشنما گلشن کے ہر آزار کا قصہ

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید ذہن کے شاعر ارشد نے انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔انھوں نے جدید زندگی میں فرد کے احساسات کو جس چابکدستی سے اپنی شاعری میں نمایاں کیا ہے اس سے ان کے کلام میں خاصا تنوع پیدا ہوگیا ہے۔اکثر دیکھا گیا ہے کہ احتجاج سے لیس طنزیہ شاعری میں شاعرانہ جمالیات کا فقدان ہوتا ہے۔لہجے اور اسلوب میں موجود ایک طرح کا کھردراپن قاری کے ذوق طلب کی تسکین کا سامان مہیا نہیں کرپاتا۔لیکن ارشد کی طنزیہ اور احتجاجی شاعری اپنے اندر جمالیاتی شادابی کے ساتھ طرز بیان کی دلکشی بھی رکھتی ہے۔

چراغِ شب میں تو جلنے کا حوصلہ ہی نہیں   وہ چاہتا ہے کہ تہمت ہوا کے سر جائے
وفورِ شوق سے رشتہ جو کچھ توانا ہو   سراب و آب کا قصہ تمام ہوجائے

....

بجز ہمارے، مداوا کوئی نہیں اس کا   غریب دشت جو تنہا دکھائی دیتا ہے

....

خود اپنے گھر کا اندھیرا نچوڑ کر ہم نے   نہ جانے کتنے چراغوں کو روشنی دی ہے

اپنے مجموعۂ کلام (دھوپ کے پودے) کی ترتیب و تدوین میں ارشد نے غزلوں پر نظموں کو اولیت دی ہے۔تمام نظمیں صنف آزاد میں ہیں۔راقم الحروف کو آزاد نظموں سے ہمیشہ الرجی رہی ہے۔کسی نظم کو اس کے آخر تک نہیں پڑھ سکا، پڑھا تو سمجھا نہیں، سمجھا تو تعریف و توصیف کی راہ مل نہیں پائی۔ ''قہر درویش بر جان درویش''....جب جی داب کر ارشد کمال کی نظموں کو پڑھا تو حیرت بھی ہوئی اور ندامت بھی۔ندامت اس بات کی

کہ آزاد نظموں کے باب میں ہماری رائے اتنی فرسودہ اور غیر منصفانہ کیوں رہی.....حیرت اس بات پر کہ بغیر کسی عالمانہ پیچ و خم کے اتنی سادگی سے آزاد نظمیں بھی لکھی جاتی ہیں۔ارشد کمال کی نظمیں مختصر بھی ہیں اور قابلِ فہم بھی۔انہیں سمجھنے کے لئے علم غیب کی ضرورت نہیں پڑتی۔ہر نظم کا ایک مخصوص پیغام ہے اور جیومٹری کے مسئلۂ اثباتی کی طرح ایک سوال ہے اور اس کا جواب بھی۔ہر سوال عصر حاضر کے انسانی معاشرہ کے نو بہ نو منظر نامے سے ابھرتا ہے۔شاعر کے انداز بیان نے ان میں انکسارانہ اور عاجزانہ خوبیاں پیدا کردی ہیں۔

نظموں کی فکری اساس اور ان کے مرکزی تصورات غزلوں کے مزاج اور مواد سے مختلف نہیں ہیں۔ظاہر ہے کہ مادّوں کی ہیئت بدلتی ہے تو ان کے خواص نہیں بدلتے۔صرف حالت بدل جاتی ہے۔

ارشد کی نظموں کے بنیادی تصورات کا جزوی منظر نامہ کچھ اس طرح ہے :

o انسان کی ذات چونکہ مکمل نہیں ہے لہذا وہ حقائق زندگی کے نکتۂ کمال تک نہیں پہنچ سکتا۔تشنگی اور تلاش و جستجو کی خلش باقی رہتی ہے۔(ماسوا)

o انسانی قدریں معدوم ہوتی جارہی ہیں۔عجب نہیں کہ انسان ظلمت اور گمنامی کے اس مقام پر پہنچ جائے جہاں سے وہ چلا تھا۔(خدشہ)

o شاعر کے یہاں قنوطیت اور فرار کا انداز نہیں۔اس کے یہاں زندگی کی قدر و قیمت ہے۔وہ اقتدارِ آدم کا پرستار ہے۔(آدم خاکی)

o کارخانۂ قدرت میں انسانی مداخلت اہل زمین کے لئے نفع بخش نہیں۔انسان اور خدا کے درمیان صف آرائی میں نقصان ہمیشہ انسان کا ہوتا ہے۔(ٹیوب زدگی)

o انسانی زندگی کا سفر برسہا برس سے جاری ہے۔مادی ترقی کے نام پر انسان نے بڑے کمالات دکھائے ہیں، تاہم 'خود اپنی انجمن میں چراغاں نہ کرسکا' والی صورت حال برقرار ہے اور اس سے نجات جب ہی ممکن ہے جب چراغ ذہن روشن اور منور ہوگا۔(سعیٔ رائیگاں)

ارشد کمال کی چند نظموں کے حوالے سے یہاں اس لئے گفتگو کی گئی تاکہ ان کی فکری نفسیات کا سرا ہاتھ آئے اور ان کے پرواز تخیل کا محاسبہ ہوسکے۔متذکرہ بالا مسائل عصر حاضر کے ہیں۔گمان اغلب یہی ہے کہ آنے والے دنوں میں یہ اور بھی شدت اختیار کریں گے۔انسانی تہذیب و تمدن شکست و ریخت کے مزید مرحلوں سے گزرے گی۔اُس وقت ارشد کمال کی شاعری کے Relevance میں اور اضافہ ہوگا۔

اشعار وجود میں آتے ہیں لفظوں کی ترتیب و تنظیم سے۔اس لیے کامیاب شاعری میں الفاظ کا انتخاب اور ان کا درو بست بڑی اہمیت رکھتا ہے۔اس سے اشعار میں حیرت و استعجاب کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے جو اچھے اشعار کی پہچان ہے۔ارشد کی شاعری میں الفاظ کا حسن انتخاب اور ان کی نشست و برخاست کسی شعوری یا انتخابی

عمل کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی شاعرانہ جبلت کا حصہ ہے۔روزمرہ کے علاوہ معرّب ومفرّس الفاظ اور محاورہ وضرب المثل کو اپنے اشعار میں کھپانے کا ہنر بھی انھیں معلوم ہے۔ظاہر ہے کہ یہ فن کسی اسکیم کے تحت وجود میں نہیں آتا۔

آمدِ الفاظ اوران کے محلِ استعمال کی خصوصیت کے علاوہ تراکیبِ الفاظ کا حسن بھی ارشد کمال کی شاعری میں نمایاں ہے۔شہر صدا، گونگے آنگن،صحبتِ آئینہ، غازۂ بے چہرگی، قربِ خرد، توفیقِ سرکشی، بساطِ آگہی، نشیمن گیر، تمدن کے گھرانے، ساعتِ بیمار، خامۂ احساس،اوربحرِ مصلحت وغیرہ ایسی تراکیب ہیں جن میں سے بیشتر اردو زبان میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔اس کے علاوہ موصوف کی شاعری میں مرادفات اور متضادات کا باہمی رشتہ (co-relation) بھی خوب ہے۔یہ موازنائی فن ارشد کی شاعری کا خاص وصف ہے،اس قبیل کے چند اشعار۔

تم اپنی فکر کو کچھ پختگی کا جامہ دو　　خیالِ خام نے فن کو برہنگی دی ہے

....

اذاں ’آمد‘ کی سن لی ہے،نماز اب ’رفت‘ کی ہوگی　　کہاں کچھ وقت لگتا ہے اس آنے اور جانے میں!

....

ارشد!فصیلِ ذہن میں بڑھنے لگا جو حبس　　ہم شہرِ دل میں جاکے ذرا تازہ دم ہوئے

....

خاموشی کے جنگل کاٹو،شہرِ صدا کے دیوانو　　آوازوں کے پیڑ اُگاؤ اپنے گونگے آنگن میں

غرض یہ کہ ارشد کی نظمیں ہوں یا غزلیں،وارداتِ قلب اور مشاہداتِ زمانہ کی نہایت مؤثر عکاسی ان میں ملتی ہے۔خیالات میں فکر کی قابل لحاظ گہرائی اور اظہار میں اخلاص اور روانی ہے۔اشعار کی متحرک ساخت بیداریٔ فکر پر دلالت کرتی ہے اور غیر ضروری پیچیدگی سے پاک ان کا کلام حادثات اور وارداتِ قلب کا لطیف پیرائے میں مخلصانہ اظہار ہے۔چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ ارشد کمال کی کاوشِ سخن،شاعری کے ’’کم آب صحرا‘‘ میں ایک فرحت بخش نمی کا احساس دلاتی ہے۔

☆☆☆

کاوش عباسی (سعودی عرب)

مدیر جدید ادب کے نام خط

مکرمی جناب حیدر قریشی صاحب سلام

جدید ادب کے تازہ شمارے (نمبر۱۴) کا کچھ ریویو حاضر ہے۔اس مقصد کے لیے میں گوشہ حمایت علی شاعر اور غزلوں کے بارے میں کچھ لکھوں گا۔سب سے پہلے میں نے گوشہ حمایت علی شاعر پڑھا۔

شاؔعر کے نام اوران کی فلمی شاعری کو دیکھ، پڑھ کر بچپن،لڑکپن کے ہمکتے، گنگناتے لمحے پھر سے دھڑک اُٹھتے ہیں۔ انہی فلمی نغموں کے ساتھ ہمارے بچپن،لڑکپن کے ان لمحوں نے نیا نیا دھڑکنا سیکھا تھا اور ہمارے اندر کے ادب کی کلی انہی کی فضا و ہوا میں کھل کر پھول بننے لگی تھی۔ان کے فلم ’’کنیز‘‘ کے گانے،اور وہ دوگانا ’’جب رات ڈھلی۔۔‘‘ تو میں یہ رسالہ پڑھنے کے بعد دو تین دن گاتا، گنگناتا رہا۔اور وہ رائل گانا (غزل) ہر قدم پرنت نئے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں لوگ۔۔نوسیقار نے کیسی رائل میلوڈی اور نور جہاں نے کیسی رائل آواز کے ساتھ یہ غزل کمپوز کی۔اس غزل کو سن کر لگتا تھا کہ ہم نے شاہانہ زندگی دیکھی ہے۔پھر فلم ’’بدنام‘‘ میں ان کے گانے آئے، وہ لوری، آ تجھ کو سناؤں لوری، حالات سے چوری چوری۔۔۔،واہ۔

فلم ’’نائلہ‘‘ کا یہ گانا ’’کوئی پروانہ اِدھر آئے تو کچھ بات بنے‘‘ تو مجھے حال ہی میں کراچی آرٹس کونسل میں جب شاؔعر کے لیے ایک خصوصی لائف ٹائم اچیومنٹ کا پروگرام کیا گیا تو اس دوران پروجیکٹر پر اُن کے فلمی گانے بھی دکھائے گئے تو وہاں مجھے معلوم ہوا کہ یہ گانا ان کا ہے۔کیا، کیا گانا ہے، رنجِ محبت کی کیا فضا ہے اس گانے میں جو برسوں سے ذہنوں میں سمائی ہوئی ہے۔اور فلم ’’دامن‘‘ کا گانا ’’نہ چھڑا سکو گے دامن‘‘ تو میں کہتا ہوں سارا سارا دن ریڈیو پر بجتا رہتا تھا اور پورا پاکستان اس میں نہال تھا۔پھر جب اوپر نیچے احمد فراز کی مہدی حسن کی دو غزلیں مشہور ہوئیں: اب کے ہم بچھڑے تو۔۔اور وہ مشہور و رسوائے زمانہ غزل رنجش ہی سہی دل ہی دُکھانے کے لیے آ۔ اِس کے کچھ بعد حمایت علی شاؔعر کی غزل ’’اُس کے غم کو غمِ ہستی تو مرے دل نہ بنا‘‘۔۔ہم ایسی غزلوں سے شاعری کا ابتدائی انداز سیکھتے تھے۔ویسے میرے خیال میں ان کا مہدی حسن کا گانا ’’نوازش، کرم، شکریہ، مہربانی‘‘ مجھے اکثر لگتا ہے کہ اتنا پُرادب ہے کہ اس کی ہر لائن میں ایک بھرپور ادبی امیج اور بُنت ہے اور کوئی بھی لائن نیچے نہیں گرتی۔

ہمیشہ میری خواہش ہوتی تھی کہ یہ گانا سب لوگوں کے لبوں پر ہو، سب کو پسند ہو تو ہماری سوسائٹی میں ادب کتنا پھیلے گا۔ اُن سے اسی رومانٹک تصور کے ساتھ ایک بار، کافی پہلے، جناب نکہت بریلوی صاحب کے ساتھ، جو ان کے پرانے سچے دوست اور مدح خواں ہیں، اور اُس وقت ماہنامہ ''افکار'' کا مستقل حصہ تھے، اور میری ان سے بہت دوستی تھی، ان سے ملنے ان کے گھر گیا تھا۔ اور خاموش انہیں دیکھتا، سنتا رہا تھا۔

مگر پھر یہ بھی ہوا کہ پچھلے پندرہ بیس برسوں میں مجھے کراچی (اور پاکستان) کے شعری دھاروں میں شاؔعر کی شمولیت بکھری بکھری اور غیر موجود سی لگتی رہی۔ کراچی میں ان کے ہم عصر، سینیئر شعراء و ادباء میں جمیل الدین عالی، سحر انصاری، محمد علی صدیقی زیادہ سرگرم اور مرتکز رہے جبکہ شاؔعر کہیں سائیڈ لائن میں بکھرے بکھرے لگتے رہے۔ حالانکہ ان کے بیٹے اوج کمال کا کراچی میں اور شعر و ادب میں، اپنے پبلشنگ کاروبار کی وجہ سے کافی اچھا نام اور ایک کامیاب شخص کا تصور ابھرا۔ (یہ الگ بات کہ اس نام اور کامیابی میں بھی شاؔعر کے پس منظر کا حصہ تھا)

ذاتی طور پر میں سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں کہ کہ اپنے تمام تر ہم عصر سینیئر ز کے مقابلے میں شاؔعر صاحب نے ترقی پسند اور نظریاتی زندگی میں زیادہ گہرا اور سچا قدم رکھا تھا۔ انہیں آج بھی ترقی پسندانہ، نظریاتی و ادبی راہنمائی، مستقل پن اور ٹھوس پن کو قائم و ظاہر کرتے رہنا چاہیے تھا۔ آخر محمد علی صدیقی بھی تو، جیسا بھی انہوں نے ترقی پسند نظریے کو سمجھا، ادھر اُدھر بیان کرتے ہی رہتے ہیں۔ (ساحر کی طرح) ایک ایسا نقلابی طبعِ رسا اور دلپذیر و محبوبانہ طرزِ ادا رکھنے والا شاعر اپنے طبعی راستے یعنی ترقی پسندی اور نظریاتی سچائی کے راستے کو ادھورا چھوڑ دے، یہ نئے، آگے آنے والوں کو جن کے لیے یہ راہ پہلے ہی اتنی خراب و ویران و پسماندہ ہو چکی ہو، مجروح کرتا ہے۔ خیر۔۔ شاید اب کافی دیر ہو چکی ہے مگر اُن سے محبت کے نقوش آج بھی کبھی کبھی تازہ ہو جاتے ہیں۔ اچھا ہوا کہ اپ نے یہ گوشہ شائع کر دیا اور ان سے تعلق کا تصور جو پچھلے چار پانچ برس کراچی میں رہتے ہوئے stale ہو چلا تھا پھر زندہ ہو اُٹھا۔

یہیں، اسی گوشے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے فلم انڈسٹری کو کیسی ادھوری طرح چھوڑ دیا۔ اُنہیں فلم انڈسٹری نہیں چھوڑنی چاہیے تھی۔ مجھے یقین ہے تب بھی ان کے بچے کسی نہ کسی طرح یا شاید بالکل اسی طرح کامیاب ہوتے۔ کراچی میں، اہلِ کراچی کی، اب تو ایک اپنی طاقت ور پاپولر پولیٹیکل پارٹی بھی ہے اور ثقافتی و شہری سرگرمیاں بھی بہت ہوتی ہیں۔ کاش یہ سب لوگ مل کر پھر سے کراچی میں فلم انڈسٹری، فلم میکنگ شروع کر دیں۔ یہ کام خود جناب حمایت علی شاؔعر کی سرکردگی میں کیا جا سکتا ہے۔ کتنی بار خیال آیا کہ کبھی ملاقات ہو تو یہ بات ''ریاض'' کے اپنے پرانے شناسا اور حساس رفیق جناب رؤف صدیقی (موجودہ صوبائی وزیر سندھ) سے کہوں کہ کراچی میں (جناب حمایت علی شاعر کی سرکردگی میں) فلم انڈسٹری دوبارہ شروع کریں۔ اور اب تو کراچی کے، فلم کے ایک اور اہم ستون اداکار کمال کا بھی انتقال ہو گیا۔ تو دیکھیں وقت اپنے تھیلے سے آگے کیا نکالتا ہے۔

گوشۂ کلیاتِ شاعر پر آپ کا ادارتی نوٹ میں نے اس گوشے کے مضامین شعر و نثر پڑھنے کے بعد پڑھا اور بہت خوش اور حیران ہوا کہ اس سے آپ کی بھی بچپن، لڑکپن، جوانی کی یادیں جاگی تھیں۔ لیکن آپ نے لکھا کہ: ''اپنے لڑکپن اور جوانی سے ہم آہنگ کئی گانے کہ جن کا احوال لکھنے بیٹھوں تو یادوں کا ایک نیا باب رقم ہو جائے'' تو برائے مہربانی ضرور لکھیں۔ اس دمبدم سڑتی جاتی قوم کے لیے کبھی خود اس کی گزاری ہوئی ''ادب و فلم و موسیقی'' کی شاندار زندگی (جسے اس نے خود جانے کن ہاتھیوں کے ہاتھوں روندوا دیا) کی یادیں دہرانا، اسے تھوڑی زندگی عطا کرنا، کشادہ زندگی میں سانس لینے کا موقعہ فراہم کرنا ہے۔

گوشۂ حمایت علی شاعر کے بعد میں نے اس شمارے کی ساری غزلیں پڑھی ہیں اور ان کے بارے میں جو ریویو میرے زہن میں بنا ہے وہ درج ذیل ہے۔

ا۔ سب سے پہلے تو وہ غزلیں جو پوری کی پوری مجھے پسند آئیں، وہ یہ ہیں۔

ضمیر طالب کی غزل:

وہ ایک سوچ سے آیا تھا، میں نہیں سمجھا وہ دھوپ جیسا ہی سایا تھا، میں نہیں سمجھا (واہ)

ناصر نظامی کی دونوں غزلیں:

حسن خاموش رہ کے بولتا ہے دل میں چاہت کے رنگ گھولتا ہے

ہاتھ میں لے کے دل کا درپن ڈھونڈ رہا ہوں میں اپنا پن (واہ۔واہ)

۲۔ مختلف غزلوں/شاعروں کے درج ذیل اشعار اچھے اور دل پسند لگے۔

اس کو دیکھوں تو میں سوچوں اکبؔر جس کی قسمت کا ستارا چمکے **(اکبر حمیدی)**

میاں کیا لازمی تھا خاک اُڑانا کسی کو راستہ دینے سے پہلے **(مظفر حنفی)**

پھرتا تھا کہیں خواب خلاؤں میں اکیلا میں گردشِ افلاک کے محور سے نکل کر **(رشید ندیم)**

وہ جسے مجھ سے واسطہ نہیں کچھ ایسی دنیا سے واسطہ ہے مجھے **(احمد صغیر صدیقی)**

حادثے ہیں کہ پرے باندھے ہوئے پھرتے ہیں نذر کس کس کو کریں تحفۂ جاں شہر کے لوگ **(عباس رضوی)**

بساطِ منظر و ناظر بچھانے والے اب ہمارے کھیل کا خود بھی نظارہ کرتے ہیں

تمام خواہشیں حیدؔر کبھی کی چھوڑ چکے کہو تو خود سے بھی اب ہم کنارا کرتے ہیں

کسی الزام کا اقرار بھی حیدؔر نہ کیا نہ بریت کے لیے کوئی صفائی دی ہے **(حیدر قریشی)**

میں اک قدم تری دہلیز سے اٹھاتا ہوں تو دوسرا قدم اوجِ خلا میں رکھتا ہوں **(ایوب خاور)**

(ایوب خاور صاحب امیج سازی میں اور بیان کی بنت میں فارسی تکلف کا ''بہت'' استعمال کرتے ہیں۔)

تیرے حصے کا انتظار کیا پھر نمازِ وفا ادا کر دی **(خالد ملک ساحل)**

ابھی تواس کے لبوں پرسوال آئے نہیں ابھی سے کیوں سرِ منظر جواب رکھنے لگی

کیا کہیں اس دل کو کیسا مرحلہ درپیش ہے آنکھ میں آنسو نہیں اور سانحہ درپیش ہے

راستے مسدود ہیں یاں رہروانِ شوق پر اور سفرنا آشنا کو راستہ درپیش ہے **(شہناز نبی)**

دیوار کا سایہ تو مجھے مل نہیں پایا بیٹھا ہوں تری یاد میں اب لگ کے ستوں سے

عجلت میں نہیں ہوگی تلاوت ترے رُخ کی آ بیٹھ مرے پاس ذرا دیر سکوں سے

جو رنگہائے رُخِ دوستاں سمجھتے تھے وہ ہم نفس بھی مرا دکھ کہاں سمجھتے تھے

مجھ کو پھر دیس میں ہی لوٹ کے جانا ہے سعیدؔ دل لگانے کے لیے، خواب سنانے کے لیے

تو نہیں مانتا مٹی کا دھواں ہو جانا تو ابھی رقص کروں؟ ہو کے دکھاؤں تجھ کو؟ **(مبشر سعید)**

۳۔مختلف غزلوں میں رشعروں میں یہ مصرعے بہت خوب لگے۔

؎ راستہ لے کے چل رہا مجھے **(احمد صغیر صدیقی)**

؎ جس طرح ہمیں چاہیں یہ حالات گزاریں **(شہناز نبی)**

؎ تم ہی سوجاؤ مجھے خواب دکھانے کے لیے **(مبشر سعید)**

۴۔غزلوں میں کچھ نقائص بھی نظر آئے جو کچھ ادبی ہیں تو کچھ اشاعتی، وہ یہ ہیں۔

☆اکبر حمیدی کے ایک مطلع میں ''گھَن''لفظ نہیں ہونا چاہیے۔(اشاعتی)

☆ صادق باجوہ کے ایک شعر میں ''تشنہ طلب''۔بحر قناعتوں'' عجیب ہے اور غلط ہے۔(ادبی)

میرا خیال ہے صادق باجوہ جیسی غزل کو کافی season ہونے دینا چاہیے، پھر اُنہیں شائع کرنا چاہیے۔

☆ شہناز نبی (افکار میں مجھے ان کی نظمیں پسند اتی تھیں) کو چھٹی غزل میں لفظ ''رنگ'' کو ''رگ'' اور ''خوامخواہ'' کو ''خامخاہ'' نہیں باندھنا چاہیے۔(ادبی)

☆معید رشیدی کی پانچویں غزل کی بحر میں ردیف ''اُٹھانا چاہتے ہیں'' کا وزن غلط بیٹھتا ہے۔یہ کیا ہے؟(ادبی)

یہ غزل شائع نہیں ہونی چاہیے تھی۔۔۔۔اب میں رسالے کے باقی مندرجات پڑھوں گا۔

اجازت

بہت محبت کے ساتھ

آپ کا مخلص

کاوش عباسی ۱۴؍جنوری ۲۰۱۰ء

ریاض۔سعودی عرب سے

حیدر قریشی

دو نظموں کا مطالعہ

(**نوٹ:** ڈاکٹر وزیر آغا کی صرف دو طویل نظموں کے لیے یہ گوشہ مختص کرتے ہوئے مجھے اپنا ایک پرانا مضمون یاد آیا۔اس مضمون کے اقتباسات یہاں پیش کر رہا ہوں کہ دونوں نظموں کے مطالعہ کے نتیجہ میں اُس وقت میرا جو تاثر قائم ہوا تھا، وہ ایک حد تک سامنے آجاتا ہے۔باقی قارئین خود ان نظموں کے مطالعہ سے کیا تاثر قائم کرتے ہیں۔اس کا اظہار تو وہ خود کریں گے۔**حیدر قریشی**)

وزیر آغا کی طویل نظم ''آدھی صدی کے بعد'' آج سے نو سال پہلے شائع ہوئی تھی اس نظم کو میں نے کئی بار پڑھا اور ہر بار ایک نیا لطف اٹھایا اس کا تاثراتی سحر ایسا تھا کہ میں اس سے لطف اندوز تو ہوا مگر کوشش کے باوجود اس کے بارے میں کوئی مضمون لکھنے سے قاصر رہا۔اب وزیر آغا کی ایک اور طویل نظم ''اک کتھا انوکھی'' چھپ کر آئی ہے تو یوں لگا ہے جیسے میں اب ''آدھی صدی کے بعد'' پر مضمون لکھنے کی خواہش پوری کرسکوں گا۔

''آدھی صدی کے بعد'' وزیر آغا کی منظوم آپ بیتی ہے جبکہ ''اک کتھا انوکھی'' منظوم جگ بیتی ہے آپ بیتی کا کمال یہ ہے کہ اس میں جگ بیتی کی ایک زیریں لہر ساتھ ساتھ چلی جاتی ہے۔جبکہ موجودہ جگ بیتی کا کمال یہ ہے کہ اس میں آپ بیتی کی ایک زیریں لہر ساتھ ساتھ چلتی ہے۔دونوں نظموں کے سفر اندر کے رستے سے طے ہوئے ہیں۔ ''آدھی صدی کے بعد'' میں پانی کا دھارا ایک تمثیل کے طور پر آیا ہے جو جھرنا، ندی اور دریا کے چینل سے گزر کر سمندر کا روپ بنتا ہے۔''اک کتھا انوکھی'' میں بھی ابتداً پانی کے طوفان کا ذکر آیا ہے:

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''اک کتھا انوکھی'' میں آئرن ایج کا المیہ فطرت کے حسن کی تباہی کا نوحہ بن جاتا ہے:۔۔۔۔پانی کی روانی ارتقاء کی کہانی ہے۔پانی رک جائے تو جوہڑ بن جاتا ہے۔محبت اور انسانیت بھی پانی کی طرح ہوتے ہیں۔''آدھی صدی کے بعد'' میں وزیر آغا نے اس حقیقت کی نشاندہی کی ہے:

۔۔۔''اک کتھا انوکھی'' میں ''آدھی صدی کے بعد'' کا یہ اشارہ کھل کر بیان ہوا ہے یہ ایک سطح پر ہمارا قومی المیہ ہے تو دوسری سطح پر پوری دنیا کے انسانوں کا المیہ ہے۔آج کا انسان اپنے تعصب کی نجاستوں میں گھرا پوری انسانیت کو تباہی کے دہانے پر لے آیا ہے:۔۔۔۔۔۔۔۔نسلی پاگل پن قومی اور بین الاقوامی دونوں سطحوں پر ہمارے سامنے ہے۔یہاں ''ساگر'' کے معنوں میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔مذہبی طور پر بھی یہی تصور ہے کہ انسان کو

پانی سے پیدا کیا گیا۔سائنسی طور پر بھی یہی کہا جاتا ہے کہ زندگی کی پیدائش سمندر سے یا پانی سے ہوئی......اب وہی سمندر ایک طرف صنعتی دور کی آلودگیوں کا شکار ہے دوسری طرف بڑی طاقتوں نے اپنی بحری قوتوں کو حد سے زیادہ بڑھا لیا ہے۔گویا دوسروں پر غالب آنے اور ان پر قابض ہونے کی ہوس جو اندر کے جوہڑ میں بدل چکی ہے اس نے کھلے سمندر کو بھی جوہڑ میں تبدیل کر دیا ہے۔۔۔۔۔''اک کتھا انوکھی'' میں جنگل کے وسیلے سے عالمی ثقافتی بحران بلکہ ثقافتی تباہی کا دکھ۔۔۔۔۔بیان ہوا ہے:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سوال یہ ہے کہ کیا وزیر آغا جدید سائنس، اس کی ترقی اور فیوض و برکات سے انکار کر رہے ہیں؟صنعتی ترقی، راکٹ، جمبو جٹ۔۔کیا وزیر آغا نے ان حقائق کو جھٹلایا ہے؟

وزیر آغا کو پوری طرح پڑھنے والے جانتے ہیں کہ وہ مذہب، نفسیات، اساطیر اور تاریخ تہذیب کو بھی جدید ترین انکشافات کی روشنی میں دیکھتے ہیں اور علم الحیات، علم الانسان، طبیعات فلکیات غرضیکہ تمام علمی دھاروں سے بڑی حد تک آگاہ رہتے ہیں۔وہ نہ صرف جدید علوم اور جدید ترین انکشافات میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ ادب کو ان سے ہم آہنگ بھی کرتے ہیں۔اس لئے وہ جدید سائنس کی برکات سے انکار نہیں کر رہے ہیں بلکہ انہوں نے یہ بتایا ہے کہ جس کسی بہت زیادہ مفید شے کا منفی استعمال بہت زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے اسی طرح صنعتی ترقی کے منفی استعمال نے انسانیت کو تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے، صنعتی ترقی نے شہروں کو پھیلا دیا ہے، دیہاتوں اور جنگلوں کو ختم کیا ہے۔حرص و ہوس نے مادیت پسندی کو فروغ دیا ہے۔جس میں روحانی اور اخلاقی قدریں پامال ہو رہی ہیں۔نفسا نفسی کے اس ماحول نے نفرتوں اور عصبیتوں کو جنم دیا ہے۔ایٹم، نیپام، نیوٹران۔۔ظاہر ہے ہوس پرستوں نے یہ تباہ کن بم ڈیکوریشن پیس کے طور پر تیار نہیں کرائے۔انسان کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ اس کے سینے میں اب دل نہیں دھڑکتا بلکہ وہ اب روبوٹ ہو کر رہ گیا ہے۔اس کی پہچان کے مقامی ثقافتی دائرے سے لے کر عالمی ثقافتی دائرے تک سب نشان مٹتے جا رہے ہیں۔حرص و ہوس اور نفرت کے پاگل پن کی ایک دوڑ لگی ہوئی ہے۔

اس ساری صورت حال نے انسان کے اندر کی روحانی اور تخلیقی روشنی کو بجھا دیا ہے۔لفظ غیر اہم ہو گئے ہیں اور ان کی جگہ ہندسوں نے لے لی ہے۔دراصل وزیر آغا نے کرّہ ارض کے تخلیقی لحاظ سے بانجھ ہو جانے پر اپنے دکھ کا اظہار کیا ہے۔لیکن بے یقینی اور خوفناک حالات کے باوجود مایوس بھی نہیں ہیں۔منفی صورتحال کو پیش کرنے کے بعد وہ دعائیہ انداز اختیار کرتے ہیں اور ان کے اس دعائیہ انداز میں قبولیت دعا کا یقین شامل ہے:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''آدھی صدی کے بعد'' اور ''اک کتھا انوکھی'' کے موضوعاتی مطالعہ سے ہٹ کر ان نظموں کی ایک خوبصورتی یہ ہے کہ یہ اپنے ثقافتی پس منظر سے ابھرتی ہیں اور عالمی ثقافتی دائرے تک جاتی ہیں۔''آدھی صدی کے بعد'' میں برصغیر کی بعض قدیم روایات کے حوالے بھی آئے ہیں۔مثلاً سوئمبر، لچھمن ریکھا اور یم راج۔اور برصغیر سے باہر کے بعض حوالے بھی آئے ہیں: مثلا اوڈیسس، قاف اور شانگری لا۔''اک

کتھا انوکھی'' میں اس سلسلہ میں خاصی وسعت آئی ہے ایک طرف تو اس میں ماں پتر وا اور کنڈ کانگڑی کے دو اہم حوالے آئے ہیں جو کشمیری علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔دوسری طرف آئسس، شمس، زیوس اور شیو کے ناموں سے مصری، سمیری، یونانی اور ہندی تہذیبوں کے قدیم ترین حوالے ابھرتے ہیں۔''اک کتھا انوکھی'' کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک بھی اضافت استعمال نہیں کی گئی اور فارسی کے اثرات کی بجائے مقامی اثرات زیادہ نظر آتے ہیں۔

وزیر آغا کی تمام نظموں میں بالعموم اور ''آدھی صدی کے بعد'' اور ''اک کتھا انوکھی'' دونوں نظموں میں بالخصوص جو امیجری آئی ہے اس میں اتنی تازگی، شگفتگی، اور یجنلٹی اور RICHNESS ہے جو جدید نظم میں اور کہیں نظر نہیں آتی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''آدھی صدی کے بعد'' زندگی اور اسکے حقائق سے بے خبر نہیں ہے۔لیکن ماضی کی خوبصورت یادوں کے باعث اس پر ایک خواب ناک فضا چھائی ہوئی ہے، جس سے نظم کے حسن میں اضافہ ہوا ہے۔لیکن نصف صدی سے بھی کم عرصہ میں اس دھرتی پر جو تیز تر تبدیلیاں آئی ہیں اور جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، ان تلخ حقائق نے وزیر آغا کو خوابناک فضا سے نکال کر جگ بیتی رقم کرنے پر آمادہ کیا ہے۔''اک کتھا انوکھی'' انہیں تلخ حقائق کا شیریں ثمر ہے۔اس نظم کے دو کردار سویا ہوا انسان اور اسے جگانے والا دونوں ایک ہی وجود ہیں اور ظاہر و باطن کی علامت ہیں۔ہمارے بیشتر دکھوں کا سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنے اندر کے شخص کو مار ڈالا ہے یا سلا رکھا ہے۔وزیر آغا نے اس نظم کے اسلوب سے دراصل ہمیں اپنے اندر کو بیدار کرنے کی تحریک دی ہے، کیونکہ اس کی بیداری ہی میں ہمارے مسائل کا حل ہے:۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وزیر آغا کے نزدیک ہمارا ''اندر'' سے کٹ کر ''باہر'' میں آباد ہونا ہی ہمارے عذابوں کا سبب بنا ہے۔''اندر'' لفظ تخلیق کرتا ہے ''باہر'' اسے ہندسوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔اسی سے تخلیقی لحاظ سے بانجھ پن پھیلا ہے۔''سونے والا'' بیج کی چھال میں لپٹا ہوا ہے۔بیج تخلیقیت کی علامت ہے اور سونے والے کو بیدار کرنا بانجھ پن کو ختم کرنے کا عزم ہے۔یوں یہ نظم اس دھرتی کے مسائل کے ساتھ ادب کے ایک اہم اور بنیادی مسئلے پر بھی بحث کرتی ہے اور اس کا حل سامنے لاتی ہے۔

''آدھی صدی کے بعد'' اور ''اک کتھا انوکھی'' دونوں نظمیں وزیر آغا کے اندر کا سفر نامہ ہیں۔پہلی نظم ماضی سے حال تک آتی ہے اور اس میں آپ بیتی غالب ہے جبکہ دوسری نظم حال میں رہتے ہوئے ماضی کو چھو کر مستقبل تک لے جاتی ہے اور جگ بیتی بن جاتی ہے۔دونوں نظمیں وزیر آغا کی بہترین نظمیں ہی نہیں جدید ادب کی اعلیٰ ترین اور خوبصورت ترین نظمیں ہیں۔''آدھی صدی کے بعد'' نے نو سال کے عرصہ میں جدید نظم نگاروں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔''اک کتھا انوکھی'' بھی جدید نظم نگاروں کی ایک نسل کو متاثر کرے گی اور نظم نگاری میں مزید تبدیلیاں پیدا کرے گی۔

بلاشبہ وزیر آغا جدید نظم کے مجتہد اور جدید تر نظم کے پیش رو ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا (لاہور)

آدھی صدی کے بعد

جھرنے

شب کا پچھلا پہر
پھڑ پھڑاتے ستارے
گھنی گھاس کی نوک پر آسماں
سے اترتی نمی
اور پورب کے ماتھے پہ
قشقے کا مدھم نشاں
رات ۔۔۔۔ اِک آبنوسی جواں رتھ
شرارے اگلتے ہوئے اَسپِ وحشی
کے پلّو سے بندھنے کو تیار!
ہلکی ہلکی ہوا
اور میں
اپنے معصوم دل میں
مسرت کی دولت چھپائے
شکستہ سی اک بیل گاڑی میں
خوشبو میں لپٹی ہوئی چھتّیوں کو
کھلونوں کی صورت
دھڑکتے ہوئے اپنے سینے سے بھینچے
قلاقند اور شہد ایسے دنوں
رس بھری نرم جامن سی
تازہ رُتوں کے لیے
کتنا بیتاب!
اور منتظر!
منتظر اُس کی ہمکتی ہوئی ایک ساعت کا جب
بیل گاڑی
مِرے گاؤں کی گرم شہ رگ میں
اترے
معاً بیل گاڑی سے میں کود کر
بانہیں کھولے ہوئے اپنے گھر میں
لپک کر گھسوں
ماں کے سینے سے ٹکراؤں
ہونٹوں کے حیرت سے کھلنے کا
اور پو کے پھٹنے کا منظر
میں دیکھوں
مسرت کی زرتار کرنوں میں
لپٹے ہوئے
نرم بوسوں کی شبنم کو
الجھے ہوئے اپنے بالوں پہ
گرتے سنوں
پھر میں ہنسنے لگوں!

پھر میں ہنسنے لگوں
اور گزری رُتیں لَوٹ آئیں

پرندوں کی چہکار ۔۔۔۔ مانوس
گائے کے نازک تھنوں سے
اُترتی ہوئی دُودھ کی دھار
تازہ
مہکتے ہوئے گرم تنور کی کوکھ سے
دن بدم جست بھرتی
سنہری چنگیروں
میں ٹپ ٹپ اُترتی ہُوئی
روٹیاں
روٹیوں پر جھپٹتے ہوئے
ہات
چھوٹے چھوٹے سے ہات!
گول بوٹی
رکابی کی دلہن
اُمڈتا ہوا سورماؤں کا لشکر
سوئمبر کا منظر
بدن کی کمانوں سے
نظروں کے تیروں کی
بھوکی لپک
جیت کے قہقہے
ہار کی سسکیاں
پھر قمیصوں کی اُڑتی ہوئی دھجّیاں
پھر کسی شے کے گرنے کی
آواز
اور بھاگتے دوڑتے پاؤں کی جوڑیاں
جوڑیوں کے تعاقب میں
دادا کی چیخوں میں ڈھلتی ہوئی گالیاں
پھر خموشی
خموشی کی اِک چادرِ آبگوں
دوپہر تک سکوں!

دوپہر تک سکوں
دوپہر ۔۔۔ دھوپ
اور آسماں
دھوپ کا سائباں
اور تلووں کے نیچے
دہکتی زمیں
نہر میں کودتے
ننھے منّے برہنہ بدن
''گاچنی'' ایسے پانی میں
گرتی ہوئی تختیاں
مُردہ لفظوں کے بہتے ہوئے
پھول
اور پتیاں
دھوپ کی قاش ایسے
سنہری بدن
زرد پانی میں جیسے ہمکتا چمن
پھر وہ بادل کے پازیب کی
چھن چھنن
مست پُروا کا نازک ہنڈولا
ہنڈولے میں تتلی
چلو آؤ تتلی کو پکڑیں

چلو، ہاں چلو
سُرخ تتلی کے پیچھے چلو
اِک تعاقب، تجسس
پکڑنے کی خواہش
اسے، جس کا کوئی بدن
اور نہ چہرہ
فقط اِک ہیولیٰ
فقط اِک ہیولیٰ کہ جس کے
تعاقب میں آدھی صدی
جیسے اِک پَل کی صورت
گزرتی گئی!

دن کا پچھلا پہر
اور اوڈیسؔس کے جرار ساتھی
چری، باجرے، دھان اور نیشکر
کے پُراسرار کھیتوں کا
کالا سمندر
سمندر میں لکڑی کے تختے
شکستہ سے تختوں پہ
کیچڑ کے چیچک نما داغ
چہروں پہ چپکائے
بالوں کے گچھوں کے نیچے
چمکتی ہوئی تیز آنکھیں سجائے
ٹیٹری کے رنگین انڈوں
حَسیں چھتریوں والی ''کھمبوں''
چھنکتے ہوئے
ہریلوں
نیل کنٹھوں، بھجنگوں
کے اُجلے پَروں کے لیے
اک انوکھی تڑپ
ننھے سینوں
کے جھرنوں کے اندر
چھلکتی ہوئی
بے قراری
سمندر کے اندر
سمندر!

سرِ شام
سوندھی سی خوشبُو سے
سرشار
بھٹّی پہ بونوں کی یلغار
دانے،
ہرے لانبے بھُٹّوں سے ٹوٹے ہوئے
زرد دانے
پٹاخے
سلگتی ہوئی ریت پر
زرد دانوں کا کھِلتا چمن
دور --- مغرب میں
جلتی ہوئی شام
سرخ بھٹّی پہ جیسے کڑھائی
کڑھائی میں
ہنستے، تڑختے، اُچھلتے ستاروں کا گلزار

جلتی ہوئی شوخ آنکھوں کے گلزار پر
خندہ زن!

شب کی کالی قبا
اور درختوں کے بھاری ذخیرے کے پیچھے
گھٹتا، محافظ شعاعوں کے
گھیرے میں، آگے کو آتا ہوا
چاند
گاؤں کے لڑکوں کی
تیر و تبر سے مسلّح سپہ
اپنے سالار کے حکم پر
آگے بڑھتی
شعاعوں کے نیزوں سے ٹکراتی
پَل پَل اُلجھتی
سُموں سے اُڑاتی وہ ذرّے
جو دشمن کو بے بس کریں
پھر
زمیں سے فلک تک
کبڈی کی ''شُوکر''
مقفّل سے اِک دائرے میں
بکھرتے، سمٹتے ہوئے
چاند جسموں کی لہریں
بپھرتا ہوا شور
چیخیں
مسرت بھری تیز چیخیں
ہوا میں معلّق
گھنی گرد کا نقرئی جال
اور بھوت، ہی بھوت
بھوتوں کے گرداب میں
چاند کی لاش
نیزوں کی نوکوں پہ
ٹھہری ہوئی!

نصف شب
جیسے خوشبو بھری گود
رِستے ہوئے زخم پر جیسے پھاہا
بدن کو تھپکتی ہوئی چاندنی
سَر کے ژولیدہ بالوں میں پھرتی ہوئی
ریشمی انگلیاں
ماں کے ہونٹوں کی لَو پر
سلگتی ہوئی اِک کہانی کے پَر
سات رنگوں کے پَر
قافؔ کی اُس پری کے
جسے ڈھونڈنے کے لیے
شاہزادہ
پہاڑوں کی جانب روانہ ہوا
پہاڑوں کا دامن تہی تھا
پری اُس کی اپنی ہی آنکھوں کی
پایاب سی باؤلی میں
مکیں تھی
مگر شاہزادے کی آنکھیں تو باہر کی جانب

کھلی تھیں
پری اُس کی آنکھوں کے غُرفوں سے
تکتی تھی اپنے تعاقب کا منظر
تھکا ہارا شہزادہ
لمبا سفر!

آج آدھی صدی کی مسافت پہ
پھیلے ہوئے
ایک لمبے سفر سے
مَیں لوٹا ہوں
اور گاؤں
آنسو کے موٹے سے قطرے کی صورت
مِری بھیگی پلکوں کی
چلمن سے لگ کر کھڑا ہے
کسی صاف شفّاف بلّور
مرقد کی صورت مِرے سامنے ہے
مِری ماں کو رخصت ہوئے
جیسے لاکھوں برس ہو چکے ہیں
پرانے مکانوں،
درختوں، پرندوں میں
کوئی بھی باقی نہیں ہے
مِرے شوخ بچپن کی
اب راکھ تک
اُڑ چکی ہے
مگر چاروں جانب
مہکتے ہوئے گرم تنّور -----
نہر کی کوکھ ------
کھیت کی منڈھ-----
شب کی کالی قبا
ہر طرف
ہر جگہ
اُلجھے بالوں، چمکتی ہوئی
تیز آنکھوں میں بچپن
خنک چاندنی کی طرح
آج بھی موجزن ہے
زمانے کی رفتار پر خندہ زن ہے!

ندی

زمانے کی رفتار پر خندہ زن ہے؟
زمانہ تو بھیگا ہوا ایک چابک ہے
میرے بدن پر
مسلسل
انوکھے سفر کی کہانی سی اِک
لکھ رہا ہے
مجھے لوحِ محفوظ گردانتا ہے
کہ شاید
میں خود ایک لنگڑا تا رِستا قلم ہوں
زنامے کے اوراق پر
زخم چسپاں کئے جا رہا ہوں

مِرا کام
اس کے سوا کچھ نہیں ہے
کہ جب وقت بولے
میں لکھنے لگوں
پھر میں جو کچھ لکھوں
اپنے اخبار کو بھیج دوں
جب وہ خاموش ہو -----
پر وہ خاموش ہوتا نہیں ہے
پرندے کی منقار پر بیٹھ کر
چہچہاتا ہے
دیپک کی لَو پر ہُمکتا ہے
تارے کے بھیگے پَروں پر
زباں کی لرزتی ہوئی نوک پر
اُس کی روشن صدا
گونجتی ہے
کبھی چوڑیوں کی چھنک میں
وہ آواز دیتا ہے
گاہے وہ سر اپنا دیوار سے مار کر
چیختا ہے
کبھی رونے لگتا ہے
یا زور سے بولتا ہے
کبھی قہقہہ بن کے
دیوار کو توڑتا ہے
گلی میں اُتر کر
کسی بھولے بھٹکے ہوئے
خشک جھونکے کے جاروب کی
زد میں آئے ہوئے
کل کے اخبار کو ڈھونڈتا ہے
کبھی گھر کی دہلیز پر بیٹھ کر سوچتا ہے
کبھی خود کو پڑھتا ہے
بچپن کے اُجلے ورق کو اُلٹ کر
جوانی کی تصویر کو دیکھتا ہے

جوانی کی تصویر کو دیکھتا ہے
تو عارض کی رنگت میں گھل کر
چنبیلی کی خوشبو میں ڈھل کر
دھڑکتی ہوئی سانس بن کر
پگھلتی ہوئی موم بتّی کی
رِستی ہوئی آنکھ میں
ڈولتا ہے
معطّر سی، میٹھی سی سرگوشیوں میں مجھے
اُس زمانے کا منظر دکھاتا ہے جو
مجھ سے اوجھل بھی ہے
اور ہر دم نگاہوں میں لرزاں بھی ہے
مجھ سے کہتا ہے:
وہ دن بھی کیا دن تھے جب
گھاس کی باس میں
نیلے فلک پر تھرکتی پتنگیں
چمکتی ہوئی سائیکل
گیند، ریکٹ
ربڑ کے چمکتے ہوئے بوٹ
تانگے کے آدھے بدن پر

سیہ رنگ چادر
سیہ رنگ چادر کے گھونگھٹ سے
تکتی ہوئی شوخ آنکھیں
---- ہر اِک شے سے جیسے
ترے دل کے سب تار
جُڑ سے گئے تھے
گلی سے گزرتے ہوئے
جب کوئی چق لرزتی
تو دل تیرے سینے کی دیوار سے
ٹکریں مارتا
اور گردن کی رگ
اس قدر زور سے پھڑ پھڑاتی
کہ جیسے کوئی تازہ پنچھی
شکاری کی مُٹھی میں محبوس ہو!

ہاں ---- وہ پاگل زمانہ
عجب شان سے آ گیا تھا
جوانی نے
بچپن کو اِک کینچلی کی طرح
اپنے تن سے علیٰحدہ کیا
اور خود
گھر کی دہلیز کو پار کر کے
کُھلے شہر میں
تیز خوشبو بنی مشتہر ہو رہی تھی
نگاہوں میں نشہ
لبوں پر دہکتی ہوئی ایک لرزش
ہر اک شے کو چھونے کی
اور چوم لینے کی بے نام خواہش
لہو بن کے
نیلی رَگوں میں رواں تھی
اُدھر شام،
پھولوں کا گجرا بنی
رُوبُرو آ کے رُکتی
اِدھر میں
بڑے باغ کے
سرد پھولوں کی جانب،
لپکتا
گلاب ایسے مہکے ہوئے پھول کو
اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر
بڑے غور سے دیکھتا
پھر دہکتے ہوئے اپنے عارض کو
برفاب سے پھول کے گال پر رکھ کے
خوشبو میں سرشار
مدہوش
سَپنوں کی بارش میں بھیگا
یُونہی ---- ایک بُت سا بنا
شام کی رخصتی تک
وہیں باغ کے نیم روشن سے گوشے میں
محبوس رہتا
اچانک
شبِ تار اُونچے درختوں
کی شاخوں سے نیچے اترتی، مجھے چھیڑتی،

نرم سپنوں سے بیدار کرتی
یہ کہتی:
اُٹھو، یوں نہ پاگل بنو
گھر کو لوٹو
کہ جب رات آئے
تو کوئی مسافر بھی زیرِ فلک
یوں ٹھہرتا نہیں!

مگر میں تو جیسے
ہوا کے سمندر میں
ٹھہرا ہوا اِک جزیرہ تھا
مرکز تھا
ہر دم اُبھرتے ہوئے دائروں کا
مِرے گرد
لمحوں کی چنچل جواں گوپیاں
رقص کرتی تھیں
ہونٹوں سے میرے جو تانیں اُترتیں
منقش سے دھاگوں میں
ڈھل کر
زمانے کی جانب لپکتیں
میں سورج تھا
اور سبز ریشم میں ملبوس
ماتھے پہ جھومر سجائے
یہ دھرتی
مِرے گرد پھرتی تھی
گلیوں کے غاروں
مکانوں کی درزوں
کلس اور مینار کی رفعتوں سے
مجھے جیسے آواز دیتا تھا کوئی
یہ کہتا تھا:
تُو
شہر کا دل ہے
دل میں
لہو کی تڑپتی ہوئی بُوند ہے
تجھ پہ سارے جہاں کی نگاہیں جمی ہیں
تُو پلکیں اُٹھا
دیکھ
سارا زمانہ تُجھے دیکھتا ہے!

اور میں
جیسے مَیں خُود بھی
حیرت میں ڈوبے زمانے کی
آنکھوں سے بس خود کو ہی
دیکھتا تھا
بدن میرا
جادو کی نگری تھا
آئینہ صورت تھا
مجھ کو دکھاتا تھا
میرا ہی منظر
کبھی ایسے لگتا
کہ جیسے یہ دھرتی بھی

اِک آئینہ ہے
کبھی رات جب بھیگتی
نیند
رُوٹھی دلہن کی طرح
آنکھ کے گرم بستر سے
باہر نکل کر ٹہلتی
تو میں گھر کی چھت پر
کھلے آسماں کے تلے
کھردری چارپائی پہ لیٹا
ستاروں کے
بکھرے ہوئے مقبروں پر
دیئے ٹمٹماتے ہوئے دیکھتا
مجھ کو احساس ہوتا کہ سارا فلک
ایک ٹوٹا ہوا آئینہ ہے
ستارے
چمکتی ہوئی کرچیاں ہیں
میں خود
ہر ستارے کی کرچی میں ہوں
جیسے کمسن زمیں
اور بوڑھا فلک
اور معصوم تارے
سبھی میرے ہمراز
سب میرے اپنے ہیں
مَیں
سبز مخمل کی مسند پہ
بیٹھا ہوں
تینوں زمانے
مرے سامنے
دست بستہ کھڑے ہیں!

مگر پھر
کوئی اُڑتی سرگوشی ۔۔۔ تتلی
نجانے کدھر سے
مری سمت آتی!
مری سمت آتی تو مسند سے اُٹھ کر
میں تینوں زمانوں کو
بچپن کے ہمجولیوں کو
گلے سے لگاتا
گلے سے لگاتا تو وہ
مجھ کو پہچان جاتے
چمکتی ہوئی کرچیاں
پھر سے آئینہ بن کر
مجھے گھورتیں
اب وہ مجھ میں
میں اُن میں تھا
لمحوں کا ٹوٹا ہوا ہار،
جُڑ سا گیا تھا
نظر میں
انوکھی سی پہچان آنے لگی تھی
میں حیران تھا
دیکھتا تھا
کہ اندھے خلا میں

زمیں ایک کنکر ہے
کنکر پہ تازہ پھپھوندی لگی ہے
حیات
اِک پھپھوندی ہے
ڈائن ہے
اپنے ہی اعضا کو
رغبت سے کھاتی ہے
کیڑے، مویشی، پرندے
زمیں پر بچھی گھاس
پودے
ہر اک زندہ شے کا نوالہ بنی ہے
عظیم اور جی دار انساں
تو اپنا بھی قاتل ہے
اپنے ہی ساتھی کا
تازہ لہو پی رہا ہے
یہ عفریت
گالی ہے
بدبو ہے
دھبّہ ہے
اپنی غلاظت میں ہر روز
اشنان کرتا ہے
اپنے تعفّن کا
خود پاسباں ہے!

اچانک مجھے جیسے اُبکائی آتی
غلاظت
مرے مُنہ سے باہر اُچھل کر
مجھے ڈانٹتی
اور تعفّن
مجھے اپنی مٹّھی میں لے کر
مَسلتا
مرے چاروں جانب
مکانوں کے پنجر
کتابوں کے معبد
دعاؤں کے گنبد
بسیں، گاڑیاں
اور فقیروں کے گلّے
مرا منہ چڑاتے
یہ کہتے:
کہاں پھر رہے ہو؟
یہاں لفظ کا کوئی معنی نہیں ہے
یہاں تو فقط گیلی مٹّی ہے
مٹّی کی شکلیں ہیں
بارش کا پہلا ہی چھینٹا پڑا تو
پگھل جائیں گی
اور کیچڑ سے بازار
بھر جائیں گے
تم بھی مٹی کے پتلے ہو
برکھا کے آنے تلک
اپنی صورت کو باقی رکھو
تم بھرم اپنے ہونے کا
باقی رکھو!

اور میں سوچتا
اس قیامت سے
کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکے گا
تو پھر فائدہ؟
کیوں میں بے کار
رسّی کے زینے پہ چڑھتا رہوں؟
مجھ کو لگتا
زمیں اور فلک میں
فقط لاکھوں رسّی کے زینوں کا
اِک سلسلہ ہے
سبھی
جھولتے ڈولتے نرم زینوں پہ
پاؤں رکھے
آسماں کی طرف اُٹھ رہے ہیں
سبھی
باری باری
زمیں کی طرف گر رہے ہیں
نشستوں پہ بیٹھے تماشائی
مُردوں کے پنجر ہیں
آنکھوں کے بے نور غرفوں سے
سرکس کے بازی گروں کو
خموشی سے تکتے چلے جا رہے ہیں
تو کیا مَیں بھی
اِن روزنوں کے لیے
اِک تماشہ دکھاؤں

نہیں!
مَیں تماشہ نہیں ہوں
کھلونا نہیں ہوں
مَیں بجھنے کی
خود کو بجھانے کی
شکتی ہوں
اپنا مقدر
مَیں خود ہوں۔۔۔۔۔

مجھے
تب مجھے
موت کے لمس کی آرزو
ہر گھڑی گدگداتی
میں خوشبو کی صورت، بدن سے نکل کر اُڑوں
سب پکڑتے رہیں
میں نہ ہرگز رکوں
یا کسی شام، آوارہ پھرتے ہوئے
رہگزر میں کہیں
گر پڑوں، میرے ماتھے سے تازہ لہو
ایک فوّارہ بن کر، ابلنے لگے
پھر کہیں سے
کوئی آ کے، نازک سے ہاتھوں سے
مجھ کو اُٹھائے
مِرے سر کو آغوش میں لے کے، رونے لگے
پر میں رُوٹھا رہوں
موت کی وادیوں کی طرف چل پڑوں،

اور چلتا رہوں
مجھ کو محسوس ہوتا
ہر اک دل میں خطرہ پھڑکتا ہے:
''یہ مرکز ہست
مجھ سے جدا ہو نہ جائے
جدا ہو نہ جائے۔۔۔''
مگر مَیں
خدا سے
زمیں سے
فلک سے
میں تینوں سے رُوٹھا ہوا تھا۔
مجھے گندگی میں
گھٹن میں
شکستہ سے رشتوں کی
بکھری ہوئی گرم منڈی میں
اِک پل بھی رکنے کی
خواہش نہیں تھی
میں اِک سرد جھونکے کی صورت
مقفّل گھروں پر، بس اِک ہلکی دستک سی دے کر
کہیں دور ۔۔۔۔۔۔
بجھتے دلوں کے، پُراسرار ساحل سے
ٹکرا کے، رُکنے کا خواہاں تھا
میں تیرگی
بیکراں تیرگی کے لیے
کیسا پاگل ہوا تھا!

میں پاگل ہوا تھا
گھنی تیرگی کی گُپھا میں
اترتا چلا جا رہا تھا،
کہ تاریکیوں میں
کوئی اپنے چاندی سے ہاتھوں پہ
شمعیں جلائے
ستاروں سے نیچے، اترنے لگا
روشنی کا مدھر دائرہ
میری جانب اُمڈنے لگا
اور پھر ایک دن، میں نے دیکھا
میں اِک نور کے دائرے میں
کھڑا تھا
مِرے گرد
سونے کے کنگن کا
حلقہ بنا تھا!!

دریا

مِرے گرد
سونے کے کنگن کا حلقہ بنا تھا
زمانہ
سُلگتا ہوا تیر
قوسِ عدم سے نکل کر اُڑا تھا
اُڑا تھا کہ کنگن کو
کنگن سی دھرتی کو

تاراج کرنے میں اِک
کربِ انگیز لذّت تھی
اِک جان لیوا خوشی تھی
مگر میں نے دیکھا
زمانے کی رفتار، مرنے لگی
اور اُڑتا ہوا تیر، رنگیں پروں کو سمیٹے
درختوں کی پھیلی ہوئی، سبز جھولی میں
بے بس سا ہو کر، گرا
ایک تابندہ لمحہ
ازل سے ابد تک کھنچا ایک پُر نور جملہ
ہزاروں سلگتی ہوئی، ساعتوں
ننھے منّے کروڑوں،
چمکدار لفظوں میں
ڈھلنے لگا

تب ہَوا نے، بیاضِ زمیں کھول دی
اور رنگین اوراق، اُڑنے لگے
لفظ،
جملوں کی شاخوں سے نیچے
اُترنے لگے
مکڑیوں
شہد کی مکھیوں
اور ریشم کے کیڑوں میں ڈھل کر
تھرکنے لگے
سُرخ چڑیاں سی بن کر
پھُدکنے لگے
اپر پاروں
گُلابی پتنگوں کی صُورت
فلک کی طرف اُٹھ گئے
قطرہ قطرہ
زمیں کے بدن پر
انوکھی، پراسرار بھاشا میں
اِک ساتھ جینے کی مرنے کی،
تحریر لکھنے لگے
میں نے دیکھا، پُراسراری روشنی
پھیلتی جا رہی تھی
پہاڑوں، درختوں، کتابوں
کی خوشبو مجھے چھیڑتی تھی
زمیں پر بچھی ندیاں
بے قراری سے، اِک دوسری کی طرف
آ رہی تھیں، گلے مل رہی تھیں
کشادہ،
سجل
بانکے دریا کو
گھیرے میں لے کر
مہکتی چلی جا رہی تھیں!

معاً میں نے
پھُولوں کے گجروں کی درزوں سے دیکھا
میں ندیوں کے جھرمٹ میں محصُور
پلکوں کی ٹھنڈی سلاخوں کے پیچھے
کھڑا تھا

پیازی سے گالوں کے
بلّور میں
میرا چہرہ چھپا تھا
چمکتی ہوئی سرخ بندیا
مِرا نام جپتی تھی
خوشبو
گلابی لبادوں سے باہر نکل کر
مجھے سونگھتی تھی
لبوں سے ٹپکتے ہوئے بول
مصری کی ڈلیاں تھے
کانوں میں گھل کر
مِرے تن کی شریانوں
ننھی رگوں تک کو
میٹھی تمازت سے مسحور کرتے تھے
چاروں طرف
ریشمیں ڈوریاں، ندّیاں
مجھ کو تھامے کھڑی تھیں
مِرے سامنے
ایک بانکا، سجل، تیز دریا تھا
دریا
جو ریشم کا دھاگا تھا
سوزن تھا
اپنے ہی دونوں کناروں کو
پیہم رفو کر رہا تھا
زمیں کے اُدھڑتے ہوئے چاک کو
سی رہا تھا!
عجب روشنی تھی
مہکتے ہوئے سبز باغات
پنچھی
کسانوں کے گھر
کھیتیاں
میرے دامن پہ
گوٹے کناری کی صورت
دمکتی تھیں
میں ساری دھرتی کو
سینگوں پہ اپنے اُٹھائے
کھڑا تھا
مِرے دَم سے
گندم کے خوشوں میں دانے تھے
اشجار بارِ ثمر سے جھکے تھے
سفیدی کے دھبّے
ہَری گھاس میں چر رہے تھے
میں ہل کی اَنی تھا
درانتی کی گُبڑی زُباں تھا
اُگاتا تھا میں
خود ہی پھر کاٹتا تھا
پُرانی سی اِک بیل گاڑی میں پھر
خود کو میں لادتا تھا
سڑک بن کے
شہروں کے پھولے ہوئے پیٹ تک
رینگتا تھا
رگوں میں لہو بن کے پھر

دوڑتا تھا
قلم کی اَنی
مُوقلم کی زباں سے
لرزتی ہوئی انگلیوں کی کماں سے
شبیہ اِک بناتا تھا ایسی
کہ جو اصل پر خندہ زن تھی
مَیں دھاروں کا سنگم
گلوں کی روانی تھا
رنگوں کی سیّال حدّت میں
بھیگا پڑا تھا!

کبھی ۔۔۔ جب ہَوا
کالے مردہ پہاڑوں سے
پلّو چھڑا کر
مری سمت آتی
تو رنگین فرغل پہنتی
دَبے پاؤں چلتی
مِرے گھر کی چوکھٹ سے ٹکرا کے
رُکتی
شگوفوں سے، بچّوں سے
میرا پتہ پوچھتی
اور مَیں
اپنی آنکھوں کے پَٹ بھیڑ کر
ہلکی ہلکی تھکاوٹ کی تہہ
اپنے سارے بدن پر جمائے
اُسے اُس کے قدموں کی
بڑھتی ہوئی ۔۔۔۔ اور گھٹتی ہوئی چاپ سے
پاس آتے
پلٹ کر کہیں دور جاتے ہوئے
دیکھتا
ساری دنیا
نہ سوئی پڑی تھی نہ بیدار تھی
اِک نشیلی سی، جادو بھری اُونگھ
تینوں زمانوں پہ چھائی ہوئی تھی
زمیں
آسماں
ابر پارے
پَروں میں سروں کو چھپائے ہوئے
جَل کے پنچھی
کھجوروں کے سایے میں
نرجل کے باسی
بس اِک اونگھ تھی
جو میری بند آنکھوں سے
صحرا کے ٹیلوں
ستاروں کے بکھرے ہوئے مخملوں تک
ہر اک شے کو
زردوزلوری کے
زرناب دھاگوں میں
جکڑے ہوئی تھی!

سحر
روز، کمرے کی چق کو ہٹاتی

مِرے پاس آتی
مِرے نرم بستر کی چادر بدلتی
مجھے، جیسے پَر مار کر
گھر سے باہر نکلنے پہ
مجبور کرتی
یہ کہتی:
بہت سو لیے تم
اُٹھو
گھر سے باہر نکل کر بھی دیکھو
ہوا کیسی تازہ ہے
کومل ہے
اور دھوپ کے لمس میں
کتنا نشّہ ہے
لذّت ہے
کب تک یونہی
پوستی بن کے
بستر میں لیٹے رہو گے؟

سحر
روز، ایسے ہی بکتی
مگر شام ہوتے ہی
کہتی:
بہت تھک گئے ہو
چلو
اپنی آرام کرسی میں لیٹو
اتارو
یہ چمڑے کے
سُوکھے ہوئے بُوٹ
دیکھو
یہ بالوں میں پھر
''ڈینڈرف'' آ گیا ہے
بہت تھک گئے ہو
یوں ہی ۔۔۔ اپنی آرام کرسی میں
لیٹے رہو
بس ۔۔۔ اسی طرح لیٹے رہو!

اور مَیں ۔۔۔۔
اپنی آرام کرسی میں لیٹا ہوا
آتے جاتے زمانوں کو تکتا تھا
اور اُونگھتا تھا
پھر اِک دن
مِرے دَر پہ دستک ہوئی
اِک ہیولے نے
نیلے فلک سے اُتر کر
بڑے زور سے میرے شانے
ہلائے
ہلائے ۔۔۔۔ تو مَیں
شانگری لا کا باسی
ذرا کسمسایا
بکھرتی ہوئی دُھند کے چاک سے
میں نے دیکھا، زمانے کا موسم بدلنے لگا تھا
گھنی کھیتیاں

سبز جنگل
کسانوں کے گھر
سب کو
کائی میں لپٹے ہوئے لجلجے کیکڑے
اپنے پنجوں میں لے کر کُترنے لگے تھے
ہرے، مدھ بھرے
میرے دونوں کنارے
سلگنے لگے تھے
خوشی
سربرہنہ، اکیلی، جواں
اِک کنارے پہ روتی تھی
اور بین کرتی تھی
دُکھ
اپنا لشکر لیے
دوسرے گھاٹ پر
خیمہ زن، شادماں
اور میں
دُکھ کی ننگی خوشی
اور خوشی کی سُلگتی ہوئی پیڑ
کے درمیاں
اِک نشاں
جیسے لچھمؔن کی ریکھا
جسے پاؤں کی نوک چھولے
تو تاریخ کا رخ بدلنے لگے!

تو --- تاریخ کا رُخ
بدلنے لگا
وہ دریا کہ اپنے کناروں کے اندر تھا
بادل کے بے رحم چابک
کی ضربوں سے
پاگل ہوا
تند لہریں
دمکتے ہوئے صاف ماتھے کی
شکنیں بنیں
جُست بھر بھر کے
دونوں کناروں کو
تکنے کی کوشش سی کرنے لگیں
جڑ سے اُکھڑے درختوں کے پنجر
پرندوں کے پَر
اور بچوں کے نازک کھلونے
غضبناک، وحشت زدہ،
تیز غرّاتی موجوں کے راکب بنے
ڈھور دھرتی سے کٹ کر
سیہ مچھلیاں بن کے رہنے لگے
اینٹ گارے سے دامن چھڑا کر
مکاں، کشتیاں بن کے بہنے لگے
سانپ پتوار، بچھو مُسافر بنے
آدمی غرق ہونے لگے
ہر طرف چادرِ آب بچھتی گئی
پھر خموشی نے
ہر شے کو خاموش رہنے کی تلقین کی
اور زمیں چُپ ہوئی

آسماں چُپ ہُوا
اور دریا
خود اپنے بدن سے لپٹ کر
سسکنے لگا
پھر وہ اپنے ہی مرکز کے
ٹیلے سے نیچے اُتر کر
اُترتے ہوئے پانیوں کے
سیہ دائرے سے نکلنے لگا
اُس نے دیکھا، وہ سارے نشیب
اور خالی کنویں
جن کے سینوں پہ بھاری قدم رکھ کے
اُس نے
اُفق کی بھڑکتی ہوئی زرد جھالر کو
چھُونے کی کوشش سی کی تھی
وہ سب، اُس کے سیّال تن سے
گھڑے، کوزے، کشکول
لاکھوں جگوں کی جلی خشک مشکیں بھرے
ہنس رہے تھے، مگر اُس نے دیکھا
وہ دریا نہیں تھے
فقط چھوٹے چھوٹے سے جوہڑ تھے
ٹھہرے ہوئے باسی پانی کے
اِندھے گڑھے تھے
سنگھاڑوں، جڑی بوٹیوں
سُوکھے گنجان جھاڑوں سے
لپٹے پڑے تھے
اُسے یوں لگا
جیسے پانی رواں ہو تو پانی ہے،
ورنہ غلاظت سے لبریز
اندھا گڑھا ہے
فقط ایک اندھا گڑھا!

اور پھر --- یوں ہوا
سرسراتی سی پرچھائیں
یم راج کی
میری پیہم روانی پہ،
برہم ہوئی
میرے پیچھے،
دبے پاؤں آنے لگی
ہر قدم پر مجھے،
برف ہاتھوں سے چھو کر
گزرنے لگی
ایک دن
بھاری بھرکم،
ربڑ کے گھِسے تیز پہیّوں پہ بیٹھی
مجھے
اپنے لوہے کے جبڑے سے نابُود کرنے کو آئی
مگر سوچ میں پڑ گئی
اُس نے اک قرمزی پھول
ہاتھوں میں میرے تھمایا
رُکی
ایک شیشے کا نازک سا گلدان بن کر
سڑک پر گری

ریزہ ریزہ ہوئی!

دوسری بار
اونچے فلک سے
کسی بھوکے گدھ کی طرح
اپنے گندے پروں کو سمیٹے، سیہ چونچ کھولے
وہ اک چیخ سی مار کر، مجھ پہ جھپٹی
گری
پھر مکانوں کے ملبے پہ اِک پَل رکی۔۔۔رُک کے
تیزی سے آگے بڑھی
مجھ کو کھا جانے والی، عجب
لال پیلی نگاہوں سے تکتی ہوئی!

تیسری بار
ساون کی اِک گنگناتی ہوئی
کالی شب میں
وہ دُزدانہ آئی
میرے کھاٹ سے لگ کے تا دیر بیٹھی رہی
پھر اندھیرے میں
اُس کا بدن
مجھ سے ٹکرایا
طوفان آیا
وہ کُنڈلی سے باہر کو لپکی
چمکتی ہوئی ایک ٹھوکر بنی
پھر نہ جانے اُسے کیا ہوا، وُہ مُڑی
اور دہلیز کو پار کر کے
گھنی، گہری جنگلی گلابوں کی اِک باڑ میں
گُم ہوئی،
اپنی ہی ذات میں
چھپ گئی!

آخری بار
اُس نے مجھے
قہر آلود نظروں سے اس طور گھورا
کہ میں آج تک
خوف کی کپکپی
اپنے سارے بدن میں رواں دیکھتا ہوں
میں پٹڑی پہ بیٹھا تھا
وہ
اِک سیہ فام عفریت کے روپ میں
ساری دنیا کو لرزاتی
پٹڑی کی چیخوں کے کُہرام میں
ایک وحشت زدہ تیز سیٹی بجاتی
مِری سمت آئی
بس اِک لحظہ
جانے مجھے کس نے پٹڑی سے جیسے اُٹھا کر
ہوا میں اچھالا
نجانے وہ کب
دَن سے
میرے لبادے کو چھوتی ہوئی
برق کے ایک کوندے کی صُورت
گزرتی گئی

پھر افق کی سیاہی میں
دھبّہ سا بنتی گئی
آخرش
مٹ گئی!

مٹ گئی
نیلے آکاش کا
آخری ابر پارہ بنی
اپنے اندر اُتر کر
فضاؤں میں تحلیل ہوتی گئی
اور میں
اپنے بوجھل پپوٹوں کے محبس سے
آزاد ہو کر
ہزاروں برس کی گھنی نیند سے
جیسے بیدار ہو کر
تحیّر میں ڈوبا
انوکھی چکا چوند کے
رُو برو آ گیا
میں دیکھا کہ ہر چیز
خود اپنے ہونے کا اعلان تھی
اپنی خوشبو کے اندر بسی تھی
خود اپنی ہی لَو سے منوّر تھی
چاروں طرف
قُرب کی موہنی دلکشی میں
حِنائی سا اِک دستِ نازک بنی
ہر کسی کو نظر آ رہی تھی
نظر آ رہی تھی
مگر ریت پر
''جانے والی'' کے قدموں کے گہرے نشاں
اب بھی باقی تھے
بیمار کتّوں کی آواز میں
بین کرتے تھے
روتے تھے
دریا مگر مطمئن تھا
گھسے تیز پہیوں، پروں
سیٹیوں کے
لگاتار حملوں سے
محفوظ
پانی کے بے نام دھاروں میں
ڈھلتا
سمندر کی تہہ میں
اُترنے لگا تھا
کسی طفلکِ گمشدہ کی طرح
ہاتھ پھیلائے
روتی ہوئی مادرِ مہرباں کی طرف
جا رہا تھا
پہاڑوں کے دامن سے
اُدھڑے ہوئے ساحلوں تک
وہ ہر دم سفر میں تھا
ہر دم
رُکا بھی ہُوا تھا

سمندر کی جانب رواں تھا
مگر خود
سمندر کا پھیلا ہوا ایک بازو بھی تھا
سب نے دیکھا، پہاڑوں کے شانوں پہ
اِک ہاتھ رکھے
وہ اپنی ہی سوچوں میں
گُم
اِک فروزاں سے لمحے میں
ڈوبا ہُوا
کِس قدر شانت
کتنا بڑا ہو گیا تھا!!

سمندر

وہ چھِن بھر میں
کتنا بڑا ہو گیا تھا!
اُچھلتے ہوئے شوخ جھرنے
جواں ندّیاں
سُست دریا
سبھی دست و بازو تھے اُس کے
مہک اُس کی
کھیتوں، گھنے جنگلوں
سبز چوغوں میں ملبوس ٹیلوں
دھڑکتے مکانوں
چمکتے ہوئے تازہ جسموں میں
پھیلی ہوئی تھی
وہ تارے کی لَو میں لرزتا تھا
آنسو کی بھیگی ڈلک میں نہاں تھا
فلک
اُس کے شفاف سے آئینے میں عیاں تھا
جھمکتی جھلکتی ہوئی مچھلیاں
اُس کی پایاب لہروں میں
ہر دم اُسے ڈھونڈتی تھیں
اُسے اپنے سینوں سے چمٹائے
پھرتی تھیں
اُس کے لیے
کیسی پاگل ہوئی تھیں!

وہاں --- جس جگہ آج
ایک صحرا بچھا ہے
کبھی، صدیوں پہلے
وہاں بڑ کا اک پیڑ رہتا تھا
ہر روز --- مَیں
آگے بڑھ کر
چرن اُس کے چھوتا
وہ ہر روز مجھ کو اُٹھا کر
گلے سے لگاتا
یہ کہتا:
"مجھے اپنے تن سے جُدا مانتے ہو؟
سنو!

مَیں کوئی خشک بے برگ پنجر نہیں ہوں
جسے تم اُٹھانے کو ہر روز آؤ
مَیں زندہ ہوں
ہر دم تمہیں
اپنی شاخوں، جڑوں
سبز پتّوں میں
نیلے سمندر کی صورت!
رواں دیکھتا ہوں
مگر تُم تو کچھ جانتے ہی نہیں ہو------"

وہ ہر روز مجھ سے یہ کہتا
مگر میں تلاطم تھا
اپنی ہی آواز میں گُم
مجھے بڑ کی باتیں
فقط ایک مجذوب کی بَڑ لگی تھیں
وہ بڑ
کب کا صحرا کے سینے میں گُم ہو چکا ہے
مگر آج میں جانتا ہوں
وہ میری ہی تصویر تھا
میرا اوتار تھا
میرا چہرہ تھا وہ
میں نے خود اُس کو بھیجا تھا
اپنی طرف
اُسے خود بُلایا تھا اپنی طرف!

اور پھر--- یوں ہُوا
مَیں نے اِک بار پھر
بڑ کا بہروپ بدلا
خود اپنے ہی اندر سے باہر نکل کر
وہاں، جس جگہ اب سے پہلے
خنک ریت کا ایک صحرا بچھا تھا
مَیں پتوں کا اِک تاج
سر پر سجائے
کھڑا ہو گیا
پھر مَیں
اپنے ہی چھتنار کی ٹھنڈی چھاؤں میں
اپنی ہی ریشِ مبارک کے سائے میں
دھرتی کی مسند پہ
تشریف فرما ہُوا
آلتی پالتی مار کر
ایسے بیٹھا کہ جیسے ازل سے
یہی میرا مسکن تھا
آنکھوں کو میچے
مَیں اپنے ہی محور پہ
گردش سی کرنے لگا
اپنے "ہونے" کے ٹوٹے ہوئے آئینے میں
خُود اپنے ہی منظر کو
تکنے لگا!

مَیں نے دیکھا
ہَوا ہر جگہ تھی
مگر جب ہلاؤ

تو بیدار ہوتی
ہر اک شے کو بیدار کرتی
سجل اوس کی کرچیوں کو
زمیں پر گراتی
پرندوں کو
اُوپر کی جانب اُڑاتی
''یہاں'' کو ''وہاں'' سے جُدا کر کے
لمبی مسافت کا منظر دکھاتی
حسیں بادباں اپنے سینے پھُلائے
کنارے اُسے اپنی جانب بُلاتے
وہ چلتی تو لگتا، کڑے کوس
جھانجھن سی بن کر چھنکنے لگے ہیں
ہر اک شے، خود اپنی جدائی کا نوحہ بنی ہے
لرزتی ہوئی گھنٹیوں کی صدا
مُشکی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز
کالے بادل کی بوجھل خوشی
رعد کی چیخ
بھاری لبادوں کے نیچے
گھُٹے تنگ سینوں کے ساگر میں
بپھری ہوئی شارکیں، خواہشیں
سارا منظر، ہَوا کے سفر کا کرشمہ تھا
ہر فاصلہ اُس کی کروٹ سے
چھوٹا تھا
وہ
ہر جگہ تھی
مگر اُس کے ہونے نہ ہونے میں
اِک سرسراہٹ کا پردہ سا
حائل تھا
سب فاصلے
نرم ریشے تھے
اُس کے بدن سے نکل کر
سمندر کی چھاتی
بیاباں کی ریگِ رواں پر بچھے تھے
لرزتے ہوئے
لاکھوں مکڑی کے باریک دھاگے بنے تھے!

کبھی دن ڈھلے جب
ہَوا
تازیانے کی صُورت
سمندر پہ گرتی
تو سینے کے زنداں میں
دبکی ہوئی موج
باہر کی جانب اچھلتی
پہاڑوں سے ٹکرا کے
بپھرے ہوئے تُند دھاروں کی صُورت
زمیں کی ہتھیلی پہ آوارہ پھرتی
ہتھیلی پہ ریکھائیں بن کر چمکتی
پلٹ کر
زمیں کی لرزتی ہوئی اوک سے
قطرہ قطرہ
سمندر کے مُنہ میں اُترتی
سدا دائروں میں

سفر کے مراحل کا منظر دکھاتی
دلوں کو لُبھاتی!

معاً
مَیں نے دیکھا
زمیں پر ہَوا تھی
ہَوا کے تڑختے ہوئے فاصلے تھے
مگر سبز دھرتی کی
ٹھنڈی تہوں میں
جڑوں کی پُر اسرار وحدت تھی
سب فاصلے
ایک نقطے میں سمٹے ہوئے تھے
ہزاروں جڑیں
ایک ہی جڑ سے پھُوٹی تھیں
آگے بڑھی تھیں
مگر جڑ سے ایسی جُڑی تھیں
کہ چلنے کے عالم میں
ٹھہری ہوئی تھیں
یہ ساری جڑیں
سب دھرتی کی اپنی جڑیں تھیں
جو خود اُس کے گیلے بدن میں
اُترتی گئی تھیں
کہو کون تھا وُہ؟
کہ جس نے کہا تھا:
ستارے فقط پات ہیں
کہکشائیں
گندھی نرم شاخیں ہیں
آکاش
اِک سبز چھتنار
ہر شے پہ سایہ کُناں ہے
مگر اس کی جڑ
اس کے اپنے بدن میں
نہیں ہے!
کہو کون تھا وہ
کہ جس نے ہَوا کی حسیں سرسراہٹ
لرزتی ہوئی گھنٹیوں کی سہانی صدا
مشکی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز
اور خواہشوں کے تلاطم کو
دکھ کا سبب کہہ دیا تھا؟
وہ جس نے
خود اپنے ہی پانچوں حواسوں کو
اپنی جڑوں کو
فریبی، سیہ کار، جھوٹا کہا تھا؟

مرا اُس سے
کوئی تعارف نہیں ہے
مجھے تو فقط
اپنے ''ہونے'' کا عرفان ہے
میں تو بس اس قدر جانتا ہوں
پَروں کو ہلاتی
حسیں قوس بن کر
مری سمت آتی ہوئی

فاختہ
پھڑ پھڑاتے ستارے
گھنی گھاس کی نوک پر آسماں
سے اُترتی نمی
اور پُورب کے ماتھے پہ
قشقے کا مدھم نشاں
تیرگی کی گُپھا سے نکلتا ہُوا
روشنی کا جہاں
دھرتیاں، کہکشائیں، جھروکے
جھروکوں میں اطلس سے کومل بدن
بھیگی پلکوں پہ دکھ کی تپکتی چُبھن
سبز شبدوں کی بہتی ہوئی آبجُو
اِک انوکھے پُراسرار معنیٰ کے
گھاؤ سے رِستا لہو
مُسکراتے ہوئے لب
یہ سب
میرے اوتار ہیں
میری آنکھیں ہیں
مُجھ کو ہمیشہ سے تکتی رہی ہیں
سدا مجھ کو تکتی رہیں گی!

وزیر آغا

اک کتھا انوکھی

اک جنگل تھا
گھنی گھنیری جھاڑیوں والا
بہت پرانا جنگل
جس کے اندر اک کٹیا میں
اپنے بدن کی چھال میں لپٹا
اپنی کھال کے اندر گم صُم
جانے کب سے
کتنے جگوں سے
پھٹے پرانے چوغے پہنے
وہ اک خستہ بیج کی صورت
بے سُدھ
بے آواز پڑا تھا!

بادل آتے
کڑک گرج کر اُسے بلاتے
بن برسے ہی پچھّم کی جانب مڑ جاتے
ہوا دہکتی آنکھیں
ٹھنڈی پوریں لے کر
اس کے چاروں جانب پھرتی

پر کیا کرتی
گیدڑ، مور، ہرن اور بندر
سب کٹیا کے باہر ملتے، سبھا جماتے
اس سے کہتے:
''اب تو اُٹھ جا
آخری جُگ بھی بیت چکا
سورج میں کالک اُگ آئی
چاند کا ہالہ ٹوٹ گیا
دیکھ کہ گھاس جلی جھلسی ہے
ندیوں میں جل سوکھ گیا
جس بھی سنہری بیج سے
یہ برہمانڈ اُگا تھا
واپس شاید اسی کے اندر
اُتر گیا!''
لیکن وہ کٹیا کے اندر
اپنے بدن کی چھال میں لپٹا
بند پڑا ہے
یوں لگتا ہے جیسے اب وہ
اپنی شکتی کھو بیٹھا ہے
یا پھر باہر آنے سے، وہ ڈرا ہوا ہے
اور برہمانڈ کے
اُگ آنے کو
بہت بڑا اک پاپ سمجھتا ہے!

پاپ اور پُن کی کتھا پُرانی
کون اس کو سمجھائے
نازک تتلی رس چوسے
اور بھنورا شور مچائے
رشتے
بانکی موجوں ایسے
لپک جھپک کر آئیں
پَل بھر رُک کر
گرہ بنائیں
پھر ساحل کی سِل پر
گر کر
کرچ کرچ ہو جائیں!

سُن کر میری بات کٹیلی
اُس کے لب پر
جاگ اُٹھی مُسکان رَسیلی
بوجھل پلکوں کی درزوں سے
جھانکا
اُس کے من کا اُجالا
اُس نے جیسے
کروٹ لی ہے
اور پوچھا ہے:
کہاں ہوں میں؟ کیا سَمے ہوا ہے؟؟
اس بے انت گھنیری بوجھل نیند سے پہلے
رانجھن، سوہنی، مرزا، رادھا، پُنوں ۔۔۔ سارے
شبنم کے نمناک ستارے
ان میں سے بھی کوئی بچا ہے؟
کوئی بچا ہے؟؟

کون بچا ہے!
آنسو پی کر
رُندھی ہوئی آواز میں اُس سے
میں کہتا ہوں:
تُو کس جُگ میں رُکا کھڑا ہے
آنکھیں کھول کے باہر آ
اور دیکھ کہ گلیاں سب
اُجڑی ہیں
گلشن بے آباد ہیں سارے
ریت کے دھارے!
ریت کے دھارے، تیل کے دھارے بن کر
اُبل پڑے ہیں
لوہا جیسے جاگ اُٹھا ہے
چہک رہا ہے
چاروں جانب کُوک رہا ہے
تتلی، بھونرا، کوئل، چڑیا
سب لوہا ہے
لوہے کے پَر اُگ آئے ہیں!

وہ کہتا ہے:
یہ سب کیسے ہوا ہے بھائی؟
مَیں جب سویا
ہر شے جاگ رہی تھی
پُھولوں میں رَس
ندیوں میں چاندی بہتی تھی
دریاؤں کے پاٹ کشادہ
پیڑوں پر پھل پھول لگے تھے
گائے گابھن، گری لبالب
نار کی گود ہری تھی
راجہ خوش تھا، پرجا خوش تھی
دھرتی جیسے کنول کی صورت کھلی ہوئی تھی!

میں کہتا ہوں:
وہ ست جُگ تھا سونے والے!
یہ کلجگ ہے
کلجگ جو سرطان کی صورت
پھیل چکا ہے
دُھواں اُگلتے، آہیں بھرتے
بوڑھی، بانجھ مِلوں کے پنجر
کھمبوں کی صورت
دھرتی کے اندر سے جیسے اُگ آئے تھے
جن کے زہر کو ہم
فصلوں پر/اور بچوں پر
روز چھڑکتے ہیں
بِس کی پُڑیاں/گیس کے گولے
ڈالر، ایڈز، پلاسٹک، پھوڑے،
ان میں بانٹ رہے ہیں
دھویں کے کاجل سے
بچوں کی
ننھی منی سندر آنکھیں ''روشن'' کر کے
سیب ایسے ان کے گالوں پر
زہریلا، مٹیالا پاؤڈر مَل کر

ہم کہتے ہیں:
آہا! کیسا نکل آیا ہے چاند سا مکھڑا
کیسا پیارا پھول کھلا ہے!!

چُپ ہو جاؤ!
پھٹ کر اس کا اندر جیسے چیخ اُٹھا ہے
رُک جاؤ
وہ چُر مُر ہو کر/ منّت کر کے
پوچھ رہا ہے:
یہ سب کیسے ہوا ہے بھائی!
میں جب سویا۔۔۔۔۔۔

میں کہتا ہوں:
نیند کے ماتے!
تُو جب سویا
ہر شے جاگ رہی تھی
صدیوں تک/بیدار رہی تھی
پھر اک دن
آکاش سے اک دُم دار ستارہ
آنسو کا اک بھاری پربت
اس دھرتی پر آن گرا تھا
دھرتی جننا بھول گئی تھی
لوہا، سر پر اک فولادی تاج رکھے
اس دھرتی کا سرتاج ہوا تھا
وہ دن اور پھر آج کا دن
اس دھرتی پر نہ رات اائی
نہ دن نکلا
نہ شام ہوئی ہے
ایک مسلسل آندھی
بے آرام ہوئی ہے
وقت نے اُٹھ کر
اک اندھی رفتار سے خود کو
لیس کیا ہے
بجلی کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھا ہے!

سونے والے!
تُو جب خود کو اوڑھ کے سویا
کانوں کے پٹ
اندر کی جانب کھلتے تھے
کومل، میٹھی ااوازیں تب
اندر سے دستک دیتی تھیں
اندر۔۔جو پریوں کا مسکن
آئسس، شمس، زیوس، شیو۔۔سب کی
آوازوں کا ایک نگر تھا
خود ''باہر'' بھی
جس ''اندر'' کا اک حصہ تھا!

سونے والے!
تُو گُم صُم، بیہوش پڑا تھا
اور ہم روگی جاگ رہے تھے
یک دَم / ایک پہاڑ پھٹا تھا
پنڈورا کا قفل کھلا تھا

اور بلائیں
چیخوں کی صورت نکلی تھیں
کومل، میٹھی آوازوں پر جھپٹ پڑی تھیں
بم، راکٹ، جٹ، جمبو، باجے، بھڑک اُٹھے تھے
تُند ہوا کی چیخیں شُوکر
پھیل گئی تھی
کانوں کی نابینا آنکھیں
باہر پر مرکوز ہوئی تھیں
''باہر'' اور ''اندر'' میں اک
دیوار کھنچی تھی
تیز نکیلی آوازوں کی
فصل اُگی تھی!

فصل اُگی تھی؟؟
مجھے بتا
اس بے سمتی
اس ہاہا کار میں
چیخوں کی اندھی برکھا
اور چُپ کی تہ در تہ سلوٹ میں
انسانوں پر کیا بیتی ہے؟
کس نے ان کی رکھشا کی ہے؟

سونے والے!
جب دھرتی پر آوازوں کا شور اُٹھا تھا
اور فولاد کا راج ہوا تھا
انساں سارے
لوہے کے روبوٹ بنے تھے
بے چہرہ بے نام ہوئے تھے
کالے، پیلے ہندسے بن کر
لفظوں کے انکھووں پر جیسے ٹوٹ پڑے تھے
اک اک ''لفظ'' پہ ثبت ہوئے تھے
اور اب
ہندسے ہی ہندسے ہیں
جمع کرو۔۔تو دُگنے تگنے ہو جاتے ہیں
لاکھوں کا اک لشکر بن کر
آگ اور خون کے کھیل کا منظر
دکھلاتے ہیں
ضرب لگے تو
بھنور سا بن کر تیز ہوا کا،
پاگل بھوتوں کے
وحشی گرداب کی صورت
ایک ہی پل میں
دھرتی اور آکاش سے اونچے اُٹھ جاتے ہیں
کرو اگر تفریق صفر ہو جاتے ہیں!
تُو کہتا ہے:
چُپ کی تہ در تہ سلوٹ میں
انسانوں پر کیا بیتی ہے
کس نے ان کی رکھشا کی ہے؟
میں کہتا ہوں:
ان کو رکھشا کی حاجت ہی کیا ہے
یہ سب
نسلی پاگل پن کی رکھشا میں ہیں!

ساگر جس نے
ان کیڑوں کو جنم دیا تھا
اب اک گندا جوہڑ بن کر
ان کے اندر کے جوہڑ سے
آن ملا ہے
ساگر کا اپمان ہوا ہے
ساگر ماں ہے
ماں ہتھیا
اس کلجگ کا ایمان ہوا ہے!

اور اب۔۔۔یہ سب
گندے کیڑے
جنگل پر بھی جھپٹ پڑے ہیں
جنگل جس نے کتنا ان سے
پیار کیا تھا
ان کی کتنی نسلوں کو پالا پوسا
آباد کیا تھا
اب یہ اس جنگل کو
اپنے ساتھ ستی ہو جانے پر
مجبور کریں تو بول
یہ کیسا انیائے ہے!
جنگل جنگل آگ لگی ہے
اور یہ مُورکھ
لُو کے تھامے
جگمگ جگمگ ناچ رہے ہیں
گیدڑ، مور، ہرن اور بندر
رو رو کر ہلکان ہوئے ہیں
اندر
ماس کے جلنے کی بدبُو پھیلی ہے
باہر
نیزہ پھن پھیلائے جھوم رہا ہے
اور جنگل کے پنچھی سارے
آگ کے جلتے بجھتے اکّھر
دور آکاش کی جانب اُڑ کر
چانداور سورج کے کنگروں پر
جا بیٹھے ہیں
وہاں سے بُھر کر
حرفوں کے ریزوں کی صورت
دھرتی کے آنگن میں جیسے
آن گرے ہیں
اک منحوس عبارت بن کر
ہم پُرشوں کے ماتھوں پر
مرقوم ہوئے ہیں
اور ہم
جواَب پُرش نہیں ہیں
اپنی اپنی قبروں پر ہم
نصب ہوئے ہیں
ہم جو اُڑتی کالک اور
آواز کے چاک سے اُترے ہوئے
کوزوں کے نقش ہیں
اپنے آپ کی پرچھائیاں ہیں
دھڑ دھڑ جلتے جنگل میں ہم

ننگے پیروں چلتے
اپنے آپ کا اک مدھم سا عکس
ہوا کا لمس بنے ہیں
ہم اب راکھ ہیں اور
ہم سب نے
اپنی راکھ کو
اپنے ہی تاریک مکھوں پر
تھوپ لیا ہے
آنسو کی بے نام نمی سے
اپنی پیاسی ''پیاس'' کو بے زنجیر کیا ہے!

سونے والے!
تجھ کو شاید خبر نہیں ہے
برسوں پہلے
تیری اس کٹیا سے دور
پہاڑ کی اوٹ میں اک قصبہ تھا
اُس قصبے میں
نامؔی نام کی ایک سہاگن
سدا سہاگن
جانے کب سے
اپنی ہی خوشبو کے اندر بسی ہوئی تھی
سب کہتے ہیں
اک دن ایسا بھی آیا تھا
اُس خاموش ابھاگن کا اکلوتا بیٹا
جھیل کنارے گیا
مگر لوٹا ہی نہیں تھا

اور وہ عورت
ایک ہی شب میں
کالؔی بن کر بھڑک اُٹھی تھی
''ماں پُتر و! ماں پُتر و!''[1] کہتی
قصبے کی گلیوں میں
ساری رات بھٹکتی پھرتی تھی
بند کواڑوں پر
دو ہتڑ مار کے روتی
چیخوں سے حملے کرتی تھی
اور گلیوں میں
جو بچہ بھی اُس کو ملتا
وہ خونی پنجوں سے اس کی
بوٹی بوٹی کر دیتی تھی
پھر ندی پر جا کر اُس کو
کھا جاتی تھی!

---

[1] 'میاں پوترو'۔ کشمیری زبان کا لفظ، بمعنی 'میرے بیٹے'

تجھ کو شاید خبر نہیں ہے
ماں پُتر و! ماں پُتر و!۔۔ کی مانوس صدا
بازاروں اور گلیوں سے نکل کر
کھیتوں، ٹُنڈ مُنڈ پیڑوں
سُوکھے اور سنسان پہاڑوں
صحراؤں، دریاؤں اور جنگلوں میں پھیل چکی ہے
لج لج کرتے شپرک بن کر
ایک اک شاخ سے جھول گئی ہے

ایک اک ہونٹ سے
پھوٹ رہی ہے
تجھ کو شاید خبر نہیں ہے
خود دھرتی بھی اک شپرک ہے
نامؔی نام کی ناری ہے
ماں پُتر و! ماں پُتر و! کہتی
سُورج کی گلیوں میں
چیخیں مار رہی ہے
جھکے ہوئے آکاش کی
کنڈ کنگڑی[1] کے اندر
جھانک رہی ہے!

---

[1] کانگڑی (کشمیر کے لوگ آگ تاپنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

سونے والے!
تُو کٹیا کے کا چھلکا اوڑھے
بیج کی صورت
بند پڑا ہے
اور ہم تیری کھوج میں
نامؔی نام ہوئے ہیں
کتنے بے آرام ہوئے ہیں
جب سے، ہم
''اندر'' سے کٹ کر
''باہر'' میں آباد ہوئے ہیں
بھاری بوجھل آوازوں کے
قدموں میں پامال ہوئے ہیں

اور ہماری آنکھیں جب سے
اگنی وِش
کی برکھا سے دوچار ہوئی ہیں
آتش بازی کے منظر کا حصہ بن کر
خود بھی آتش بار ہوئی ہیں
اندر والے دیپ کی
بھیگی خوشبو سے ناراض ہوئی ہیں!

نیند کے ماتے!
دیکھ!۔۔ وہ سندر دھوپ
وہ اونی شال
جسے ہم اوڑھ کے روز پھرا کرتے تھے
دُھوپ کہ جس کے لمس میں
ماں کے نرم گداز لبوں کی شیرینی تھی
جس کے سانس میں
مرغابی کے پر کی گرمی
کچی نرم سگندھ کلی کی
رچی بسی تھی
وہ ناری
اب آتش پیکر
آتش کا پرکالہ ہے
اک چنگاری ہے
بھڑک اٹھی ہے
آنکھوں کے غرفوں سے ہم کو
گھور رہی ہے
ہونٹوں کی محراب سے لُو کے

پھنک رہی ہے!

سونے والے!
اب تو اُٹھ جا
دیکھ کہ آگ گھنے جنگل کی
آتش ناک بھجنگ کی صورت
شُوک رہی ہے
اور ہوا بدمست ہوئی ہے
تجھ کو شاید خبر نہیں ہے
پہلے بھی اک ایسا ہی
طوفان آیا تھا
تب اک بیج کی کشتی میں تُو
پانی کی شکنوں پر چلتا
ایک پہاڑ پہ جا پہنچا تھا
ایک نیا انکھوا
پھوٹا تھا
ایک نیا سورج نکلا تھا!

آج وہی طوفان
نئے انداز میں ہم پر ٹوٹ پڑا ہے
لیکن اب کی بار یہ طوفاں
اگنی کا ہے
جلے ہوئے کیسر کے ڈنٹھل
شعلوں کے گرداب
ہوا کا شور
گھنے بادل کے تن پر
دھڑ دھڑ پڑتے
آگ کے دُرّے
ایک عجب کہرام بپا ہے
تُو اپنی کٹیا کے اندر
بند پڑا ہے
سونے والے!
باہر آ
اور امرت رس سے بھرا ہوا
مہتاب کا کاسہ
سورج کے ہاتھوں سے لے کر پی
کہ تیری آنکھ سے پھر
کرنوں کا سونا
چشمہ بن کر پھوٹ بہے
اس میرے جگ کو
نئے جنم کی ملے بشارت
میرے مُورکھ دل کو بھی آنند ملے
میری آنکھ بھی
کشتی کا بہروپ بھرے
پال اُڑا کر
نورانی موجوں پر سفر کرے
بُجھے ہوئے اس میرے قلم کی
نوک پہ بھی اک
پربت جتنے
شبنم ایسے
لفظ کا دیپ جلے!!
اک ''لفظ'' کا دیپ جلے!!

مختصر کوائف

ڈاکٹر وزیر آغا

پیدائش 18 مئی 1922
ایم۔اے (معاشیات۔گورنمنٹ کالج لاہور 1943
پی ایچ ڈی (اردو) پنجاب یونیورسٹی 1956
جائنٹ ایڈیٹر 'ادبی دنیا' لاہور 1960 تا 1963
ایڈیٹر 'اوراق' 1965 سے

تصانیف

شاعری

1۔شام اور سائے (نظمیں) 1964
2۔دن کا زرد پہاڑ (نظمیں اور غزلیں) 1969
3۔غزلیں 1973
4۔نروبان (نظمیں) 1979
5۔آدھی صدی کے بعد (طویل نظم) 1981
6۔گھاس میں تتلیاں (نظمیں) 1985
7۔اک کتھا انوکھی (غزلیں اور نظمیں) 1990
8۔چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل (کل شاعری) 1991
9۔یہ آواز کیا ہے؟ 1995
10 ۔عجب اک مسکراہٹ (نظمیں) 1997
11۔ چنا ہم نے پہاڑی راستہ (نظمیں) 1999
12۔ہم آنکھیں ہیں (نظمیں) نظمیں 2001
13۔دیکھ دھنک پھیل گئی (نظمیں) 2003
14۔چٹکی بھر روشنی 2005
15۔ہوا تحریر کر مجھ کو 2008
16۔ مگر ہم عمر بھر پیدل چلے ہیں (منتخب نظمیں) 2008
17۔واجاں باجھ وچھوڑے (پنجابی نظمیں، غزلیں) 2003

کلیات

18۔غزلیں (1972 تک کی تمام غزلیں) 1973
19۔چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل (۱۹۹۰ء تک کی تمام نظمیں غزلیں) 1991
20۔چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل (کلیاتِ غزل، اس مجموعے میں کل غزلیں شامل ہیں) 1991
21۔چہک اٹھی لفظوں کی چھاگل (زیرِ طبع کلیاتِ نظم، اس مجموعے میں کل نظمیں شامل ہوں گی)
22۔طویل نظمیں (زیرِ طبع، اس مجموعے میں الگ سے کل طویل نظمیں شامل ہوں گی)

انشائیہ

1۔خیال پارے 1961
2۔چوری سے یاری تک 1966
3۔دوسرا کنارا 1982
4۔سمندر اگر میرے اندر گرے 1989
5۔ پگڈنڈی سے روڈ رولر تک (کل انشائیے ایک جلد میں) 1995
6۔ پگڈنڈی سے روڈ رولر تک (کل انشائیے، دوسرا ایڈیشن) 2010

تنقید

1-اردو ادب میں طنز و مزاح 1958
2- نظم جدید کی کروٹیں 1963
3-اردو شاعری کا مزاج 1965
4- تنقید اور احتساب 1968
5- تخلیقی عمل 1970
5-نئے مقالات 1972
6-تصورات عشق و خرد اقبال کی نظر میں 1977
7-نئے تناظر 1979
8- تنقید اور مجلسی تنقید 1981
9-دائرے اور لکیریں 1986
10-تنقید اور جدید اردو تنقید 1989
11-انشائیہ کے خدوخال 1990
12-مجید امجد کی داستان محبت 1991
13-ساختیات اور سائنس 1991
14- معنی اور تناظر 1989
15-غالب کا ذوقِ تماشا 1997
16- کلچر کے خدوخال 2009
17-امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر 2006

متفرق

1-مسرت کی تلاش 1953
2-تین سفر (سفرنامہ)
3-شام دوستاں آباد 1976
4-شام کی منڈیر سے 1986
5-دستک اس دروازے پر 1994
6-The Symphony of Existence 1995

تالیفات

1-1958ء کی نظمیں
2-1959ء کی نظمیں
3-1960ء کی نظمیں
4-1961ء کی نظمیں
5-عبدالرحمٰن چغتائی۔شخصیت اور فن 1980ء
6-مولانا صلاح الدین احمد شخصیت اور فن 1990ء
7-انتخابات جدید نظم (حصہ دوم)
انجمن ترقی اردو کراچی 1981ء

دوسری زبانوں میں تراجم

1. Selected poems of Wazir Agha.
(English 1978)
2. Half a Century Later
(English 1989)
3- Half a Century Later
(Danish 1982)
4- A Tale so Starnage
(Greek)
5- A Tale so Stange
(Svedish 1995)
6- Adhi Sadi Ke bad
(Hindi 1983)
7- Adhi Sadi ke Bad
(Bangalid 1992)
9- Urdu Shairee Ka Mizaj
(Hindi 1983)
10- Baharvan Khilari
(punjabi 1985)
11-Adhi Sadi pishoon
(Punjabi 1994)
12- Winds Of Free

Translated into English 1994
13- Chnvian Nazman
(Sarayaki 1980)
14- Seven Poems of Wazir Agha
(Translated into English 1995)
15- Selected light Essays(1995)

10۔ وزیر آغا کی بہت سی متفرق نظمیں جرمن، مالٹیز، جاپانی، مراٹھی، ہندی، انگریزی، ہسپانوی، یونانی، ڈینش، اور سویڈش زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔

وزیر آغا کے فن پر کتابیں اور رسائل

1-وزیر آغا ایک مطالعہ ڈاکٹر انور سدید
2-شام کا سورج مرتب ڈاکٹر انور سدید
3-الزبیر (وزیر آغا نمبر) مرتب شہاب دہلوی
4-آوازِ جرس (وزیر آغا نمبر)
مرتب ظفر معین، افتخار، ایلی
5-سکائی لارک انٹرنیشنل (وزیر آغا نمبر)
مرتب بلدیو مرزا
6-معاصرین کی نظر میں مرتب سجاد نقوی
7-دن ڈھل چکا تھا (وزیر آغا کی شاعری پر تنقید)
ناصر عباس نیّر

دیگر کتب

1-وزیر آغا کے دیباچے مرتب ڈاکٹر سید احسن زیدی
2- پہلا ورق (اوراق میں وزیر آغا کے اداریے)
مرتبہ حیدر قریشی، راغب شکیب
3-وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام
مرتبہ ڈاکٹر انور سدید
4-مکالمات (وزیر آغا سے) مرتبہ ڈاکٹر انور سدید
5-وزیر آغا کی نظمیں (انتخاب) ڈاکٹر غلام حسین اظہر
6-وزیر آغا کے خطوط اکبر حمیدی
7- ڈاکٹر وزیر آغا عہد ساز شخصیت حیدر قریشی

وزیر آغا پر جامعات میں کام

1۔بہار یونیورسٹی (بھارت) میں ڈاکٹر عبدالواسع کی نگرانی میں پی ایچ ڈی مقالہ:عنوان ''وزیر آغا کا فن''
2۔پٹنہ میں وہاب اشرفی کی نگرانی میں پی۔ایچ ڈی کا مقالہ: ''وزیر آغا کی تنقید''
3۔ مارواڑی کالج بھاگلپور میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ:
''وزیر آغا کی انشائیہ نگاری''۔
4۔جے پور یونیورسٹی میں ڈاکٹر فیروز احمد نگرانی میں ایم فل کا مقالہ: ''وزیر آغا کی تنقید نگاری''۔
5۔''وزیر آغا کی شاعری:
پنجاب یونیورسٹی ایم اے کا مقالہ۔
6۔''وزیر آغا کی شاعری:
پنجاب یونیورسٹی ایم اے کا مقالہ۔
7۔وزیر آغا کی تنقید: پنجاب یونیورسٹی ایم اے مقالہ
8۔وزیر آغا کی اقبال شناسی: اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور ایم اے کا مقالہ
9۔وزیر آغا کی انشائیہ نگاری: اسلامیہ یونیورسٹی پشاور ایم اے کا مقالہ
10۔وزیر آغا کے انشائیے: اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

میراجی

نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستا بُھول گیا
کیا ہے تیرا کیا ہے میرا اپنا پرایا بُھول گیا
کیا بُھولا، کیسے بُھولا، کیوں پوچھتے ہو؟ بس یوں سمجھو
کارن دوش نہیں ہے کوئی بھولا بھالا بُھول گیا
کیسے دن تھے، کیسی راتیں کیسی باتیں گھاتیں تھیں
من بالک ہے پہلے پیار کا سندر سپنا بُھول گیا
اندھیارے سے ایک کرن نے جھانک کے دیکھا، شرمائی
دھندلی چھب تو یاد رہی کیسا تھا چہرہ، بُھول گیا
یاد کے پھر میں آ کر دل پر ایسی کاری چوٹ لگی
دُکھ میں سُکھ ہے سُکھ میں دُکھ ہے بھید یہ نیارا بُھول گیا
ایک نظر کی، ایک ہی پل کی بات ہے ڈوری سانسوں کی
ایک نظر کا نور مِٹا جب اک پل بیتا، بُھول گیا
سُوجھ بوجھ کی بات نہیں ہے من موجی ہے مستانہ
لہر لہر سے جا سر پٹکا، ساگر گہرا، بُھول گیا
ہنسی ہنسی میں کھیل کھیل میں، بات کی بات میں رنگ مٹا
دل بھی ہوتے ہوتے آخر گھاؤ کا رِسنا بُھول گیا
اپنی بیتی جگ بیتی ہے جب سے دل نے جان لیا
ہنستے ہنستے جیون بیتا رونا دھونا بُھول گیا
جس کو دیکھو اُس کے دل میں شکوہ ہے تو اتنا ہے
ہمیں تو سب کچھ یاد رہا — پر ہم کو زمانہ بُھول گیا
کوئی کہے یہ کس نے کہا تھا کہہ دو جو کچھ جی میں ہے
میراجی کہہ کر پچھتایا اور پھر کہنا بُھول گیا

میراجی

گناہوں سے نشو ونما پا گیا دل
درِ پختہ کاری پہ پہنچا گیا دل
اگر زندگی مختصر تھی تو پھر کیا
اسی میں بہت عیش کرتا گیا دل
یہ ننھی سی وسعت یہ نادان ہستی
نئے سے نیا بھید کہتا گیا دل
نہ تھا کوئی معبود، پر رفتہ رفتہ
خود اپنا ہی معبود، بنتا گیا دل
نہیں گریہ وخندہ میں فرق کوئی
جو روتا گیا دل تو ہنستا گیا دل
بجائے دل اک تلخ آنسو رہیگا
اگر ان کی محفل میں آیا گیا دل
پریشاں رہا آپ تو فکر کیا ہے
ملا جس سے بھی اس کو بہلا گیا دل
کئی راز پنہاں ہیں لیکن کھلیں گے
اگر حشر کے روزپکڑا گیا دل
بہت ہم بھی چالاک بنتے تھے لیکن
ہمیں باتوں باتوں میں بہکا گیا دل
کہی بات جب کام کی میراجی نے
وہیں بات کو جھٹ سے پلٹا گیا دل

ساقی فاروقی (لندن)

حملہ آور کوئی عقب سے ہے
یہ تعاقب میں کون، کب سے ہے

شہر میں خواب کا رواج نہیں
نیند کی ساز باز سب سے ہے

لوگ لمحوں میں زندہ رہتے ہیں
وقت اکیلا اسی سبب سے ہے

ہم خیالوں کے مشربوں کا زوال
خوف سے، جبر سے، طلب سے ہے

شعلہ باروں کے خاندان سے ہوں
روح میں روشنی، نسب سے ہے

مظفر حنفی (دہلی)

کیا غم کہ قدر بے ہنروں میں نہیں رہی
گنتی مِری تماشہ گروں میں نہیں رہی
اب مسئلہ ہے ہم سفروں کی شناخت کا
پچھلے سفر کی دھول سروں میں نہیں رہی
نرگس عبث اداس ہے بے نور آنکھ پر
میری طرح وہ دیدہ وروں میں نہیں رہی
اپنائیت کا لمس، رفاقت کا ذائقہ
پہلی سی ایک بات گھروں میں نہیں رہی
کانٹے ہی کھینچ دیتی تھی منزل کی آرزو
اب وہ بھی میرے ہم سفروں میں نہیں رہی

مظفر حنفی

دنیا سے ہٹ کے سوچنے والے ہوئے تھے ہم
اک سانپ آستین میں پالے ہوئے تھے ہم
کیا زخم کھائیے کہ بدن میں لہو نہیں
اب تک تو یہ محاذ سنبھالے ہوئے تھے ہم
تھا عرش پر دماغ،قدم آسمان پر
زنجیر ایک پاؤں میں ڈالے ہوئے تھے ہم
کم قامتی کا راز عدو پر نہ کھل سکا
نیزوں پہ اپنے سر کو اچھالے ہوئے تھے ہم
تا عمر سینچتے رہے کھیتی گناہ کی
فردوسِ بے ثمر کے نکالے ہوئے تھے ہم

ندا فاضلی (ممبئی)

زرخیز ہے زمین بھی برسات بھی ہے ٹھیک
موسم بدل بھی سکتا ہے، یہ بات بھی ٹھیک ہے

اتنا بڑا ہے شہر تو ہو گا کہیں تو کچھ
اپنا تو دن بھی چین سے تھا، رات بھی ہے ٹھیک

غم میں کسی کے خود کو رلانا بھی ہے نماز
مسجد میں مولوی کی مناجات بھی ہے ٹھیک

مزدور کا تھکن کے سوا کون شہر میں
اپنا ہو کوئی ساتھ تو فٹ پاتھ بھی ہے ٹھیک

او جانے والے بھوک کو روٹی کھلاتا جا
اب تک تو تیرا پاؤں بھی ہے، ہاتھ بھی ہے ٹھیک

ندا فاضلی

جو ہوتا آرہا ہے اب کہیں ایسا نہیں ہوگا
کبھی تو مِل کے سب بولو نہیں ایسا نہیں ہوگا

نہ جانے اب وہ کیسی ہو مگر جب اُس کو دیکھا تھا
یقیں ہے آج بھی کوئی حسیں ایسا نہیں ہوگا

میں اپنی جستجو میں ہوں نہ جانے کب نظر آؤں
کہیں بھی یوں ہی جھک جائے جبیں، ایسا نہیں ہوگا

تمہارے اسلحوں پر چاہے جو بھی نام لکھا ہو
مگر میرا تو ربّ العالمیں ایسا نہیں ہوگا

جہاں سیلاب آتا ہے وہاں کشتی بھی ہوتی ہے
چلی جائے زمیں زیرِ زمیں، ایسا نہیں ہوگا

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

کس کے قلم سے بھاگ ہمارے لکھے گئے
آنسو نہ لکھ سکے تو ستارے لکھے گئے

اظہار کی مروتیں تھیں اور کچھ نہ تھا
طوفان کی بجائے کنارے لکھے گئے

وہ جو ہماری جان کے دشمن بنے رہے
ہم ان کو اپنی جان سے پیارے لکھے گئے

ایسی عبارتیں تھیں کہ پڑھنی محال تھیں
تحریر کی جگہ بھی اشارے لکھے گئے

وہ بھی تھے جن کو جھولیاں بھر کر دیئے گئے
قسمت میں اپنی صرف گزارے لکھے گئے

کس سے کہیں وہ خواہشیں جو حسرتیں بنیں
احسان پھر بھی نام ہمارے لکھے گئے

اک اک اچھے دن کا بھی دینا پڑا حساب
اکبر وہ اچھے دن جو اُدھارے لکھے گئے

نسیم سحر (سعودی عرب)

مرے بیکار معیارِ ہنر پر خاک ڈالو
مری دستار پھاڑو، میرے سر پر خاک ڈالو
بچھا دو خار، اور ہر رہگذر پر خاک ڈالو
مری منزل، مرے شوقِ سفر پر خاک ڈالو
ضرورت ہی کہاں ہے اب کسی کو روشنی کی
سو اب دل کھول کر شمس و قمر پر خاک ڈالو
پرائے لشکروں کے ہاتھ رسوائی سے بہتر
خود اپنے شہر کے دیوار و در پر خاک ڈالو
سبھی زرخیزیوں کو دفن کر ڈالو زمیں میں
شجر کاٹو، ہر اک شاخِ شجر پر خاک ڈالو
جنہوں نے اپنے ملبے میں کیا ہے دفن تم کو
تم ان بیتے ہوئے شام و سحر پہ خاک ڈالو
سفر کی دھن میں جس پر پاؤں دھر کر بڑھ گئے ہو
کہیں رستے میں تم اُس ہم سفر پر خاک ڈالو
جو یوں تاریکیاں ہی راس آنے لگ گئی ہیں
بجھا دو سب دیئے، اہلِ نظر پر خاک ڈالو
بہت اعزاز پائے ہیں سو اب اُن کی سزا میں
نسیم اب تم بھی عہدِ کم نظر پر خاک ڈالو

شہناز نبی (کولکاتا)

اب محبت کا بھی دماغ نہیں
اپنی راتوں میں یہ چراغ نہیں

یاد آتا ہے شاذ و نادر تو
غمِ دنیا سے ہی فراغ نہیں

تو بھی عاری ہے جامِ الفت سے
اپنے ہاتھوں میں بھی ایاغ نہیں

کیا کہوں کس طرف گئیں خوشیاں
دشتِ دل میں کوئی سراغ نہیں

تو بھی شرمندۂ وفا ٹھہرا
ہم یہ سمجھے کہ تجھ میں داغ نہیں

کھل رہے ہیں ببول صحرا میں
اپنی قسمت میں کوئی باغ نہیں

ڈھک گیا سارا شہر کووں سے
کس جگہ اب ہے شورِ زاغ نہیں

شہناز نبی

تردید کریں بھی تو کیا مانے گا زمانہ
مجرم ہمیں ہر طور بتائے گا زمانہ

اب تک تو ضرورت مری محدود بہت ہے
کیا جانئے کس وقت جھکائے گا زمانہ

دو چار گھڑی ہنس کے اجالا کریں گھر میں
یہ طے ہے کہ بے بات رلائے گا زمانہ

اس دور میں یہ دردِ تہہِ جام بہت ہے
کتنوں کو تو پیاسا ہی اٹھائے گا زمانہ

آؤ کہ حفاظت سے کہیں خود کو رکھیں ہم
اک روز کسی سے ہمیں مانگے گا زمانہ

ہم پر تو کسی روز نگہ اس کی پڑے گی
ہم سوختہ جانوں کو بھی باچھے گا زمانہ

کاوش پرتا پگڈھی (دہلی)

گزر بسر کے لیے کاروبار کچھ تو ہو
ملازمت نہ سہی،روزگار کچھ تو ہو

یہ سچ ہے پاس مرے پُر وقار منصب ہے
کسی طرح کا مگر اختیار کچھ تو ہو

غرور،بغض، عداوت کے ہم نہیں قائل
مگر بشر میں انا کا بخار کچھ تو ہو

سپرد کس کے کریں قوم کی امامت کو
یہاں کسی پہ ہمیں اعتبار کچھ تو ہو

دکھی بہت ہیں جہاں بھر کے سلجھے ذہن کے لوگ
یہاں وہاں کی فضا خوشگوار کچھ تو ہو

یہ ٹنڈ منڈ سا کب کا کھڑا ہے آنگن میں
درخت کیسا ہے یہ، برگ و بار کچھ تو ہو

یہ بزمِ مَے ہے یہاں صوفیوں کی آمد کیوں
ہر آنے والا یہاں بادہ خوار کچھ تو ہو

شکار کرتا ہے اکثر وہ بے گناہوں کا
عمل پہ اپنے کبھی شرم سار کچھ تو ہو

نہ نانِ خشک ،نہ تر مال ہے مقدر میں
شکم کے واسطے پروردگار کچھ تو ہو

یہ کب کہا کہ سلامت رہے وہ صدیوں تک
حضورِ والا! مگر پائیدار کچھ تو ہو

ہمیشہ نقد ہی سودا لیا ہے لالہ جی!
ذرا بچار کریں،آج ادھار کچھ تو ہو

کاوش پرتا پگڈھی

پھیرے پڑے ہوا گٹھ بندھن
کایا ہو گئی کندن،روشن
آئے کتنے بھادوں ساون
کبھی نہ بھیگا من کا آنگن
سر میں سورج کا قبضہ ہے
من کی گٹھڑی میں ہے چندن
داتا کا درباری ہوں میں
مجھے کہاں ہے فرصت راجن!
جیون بھر جیون کو دیکھا
سمجھ نہ پایا جیون درشن
ناکامی پر چرچا ہو گا
ہو گی بیٹھک، ہو گا منتھن
گیانی دھیانی، ملا کو بھی
اندھا کر دیتا ہے جوبن
موم سے بھی وہ نازک نکلا
بنتا تھا جو مردِ آہن
کبھی تھا میرا سخت مخالف
اب میں اس کے دل کی دھڑکن
تاش کی گڈی کہاں ہے رکھی
بکھر گئے وہ پتے باون
کھلا پلا کے طعنہ دینا
حضرت یہ تو ہے گھٹیا پن
آج سویرے ہی سے کاوش
بیاکل ہے کچھ چنچل چتون

کاوش عباسی (سعودی عرب)

ہوئے ختم دھوکے سفر میں خوشی کے
ہمیں راستے چاہئیں واپسی کے

عجب چاہ تھی یہ کہ خواہاں رہے ہم
ہمیشہ کسی اور کی روشنی کے

تھا مانگے کا سب دل کا عالم ہمارا
یہ چانداِس کسی کے ، وہ خواب اُس کسی کے

کہیں تھے قدم بھر،کہیں عمر بھر ہم
یہ اپنے ہی میزان تھے زندگی کے

وہ دریا ہے آگے کہ سانپوں کا جنگل
نہیں کچھ بتاتے شواہد ابھی کے

بنے، بگڑے، ٹوٹے، ہوئے اجنبی پھر
تھے سب رشتے ایسے دلِ اجنبی کے

وہ تھے حمبدِ خوں ،اب ہیں لَو موت کی وہ
جو تھے خواب،خنجر ہیں اب خود کشی کے

پڑا آکے وار اور اک میری جاں پر
میں بیٹھا ہی تھا کاوشؔ اک خواب سی کے

کاوش عباسی

ملنے کے دل ہمارے تھے ہی نہیں
ہم مقدر کے پیارے تھے ہی نہیں

وہ تو طوفاں تھیں صد فضاؤں کا
اُلجھنوں کے کنارے تھے ہی نہیں

زہر اور گرد تھے ہمارے بیچ
چاند،سورج،ستارے تھے ہی نہیں

آگ کے کھیل میں اترنا تھا
وہ محبت کے دھارے تھے ہی نہیں

ہر پَل اک رنج تھا اُن آنکھوں میں
مست،سرخوش اشارے تھے ہی نہیں

میری خاطر وہ اک نشاط بھی تھے
دل کو ایسے سہارے تھے ہی نہیں

کاوشؔ آخر یہی سمجھنا تھا
اب نہ تب، وہ ہمارے تھے ہی نہیں

احمد حسین مجاہد

اگرچہ یہ مری کوشش کی انتہا بھی نہ تھی
وہاں چراغ جلایا جہاں ہَوا بھی نہ تھی

سبھی سے اُس نے بگاڑی ہُوئی تھی میرے لیے
وُہ میرے عشق میں حالانکہ مبتلا بھی نہ تھی

مجھے یہ دُکھ ہے کہ جب اُس کے سامنے مجھ کو
کسی نے بوسہ دیا تھا تو وُہ خفا بھی نہ تھی

تُو میرے ساتھ ہے اَب بھی تو مہربانی تری
مری گرہ میں تو ورنہ کوئی دُعا بھی نہ تھی

مجھے اُتارا گیا تھا اِک ایسی بستی میں
جو مجھ سے پہلے محبت سے آشنا بھی نہ تھی

احمد حسین مجاہد

آسمانوں سے فرشتہ تَو نہیں اُترے گا
شعر اُتریں گے، صحیفہ تَو نہیں اُترے گا

پار جانا ہے تو دریا میں اُترنا ہَو گا
سوچتے رہنے سے دریا تَو نہیں اُترے گا

بات بے بات نہ یاد آئے خدوخال سمیت
وُہ مرے دِل سے کچھ ایسا تَو نہیں اُترے گا

مکتبِ عشق سے تحصیلِ جنوں کرتا ہُوں
میرے شانے سے یہ بستہ تَو نہیں اُترے گا

ہَو گئے صبح کے آثار ہُویدا بھی تَو کیا
اِس قفَس میں کوئی زینہ تَو نہیں اُترے گا

غَم کے اِظہار میں کیا چیز ہے مانع احمد
سَر ہی اُترے گا،یہ نَشہ تَو نہیں اُترے گا

صادق باجوہ (امریکہ)

شبِ تاریک کے بسیروں میں
روشنی کھو گئی اندھیروں میں

کار گاہِ جہاں میں محوِ سفر
صبح سے شام، شب سویروں میں

کوئی پُرسانِ حال تھا، نہ ہوا
بستئ دل رہی اندھیروں میں

کیوں لیں احسان، ڈال دی ہم نے
ناؤ منجدھار کے تھپیڑوں میں

کوئی انمول شے بِکے کیونکر
کیا وفا گِھر گئی لٹیروں میں

عمر بھر دل میں ماحصل کی طلب
پھر حصولِ طلب بکھیڑوں میں

ہر گھڑی دل سے خدمتِ انساں
یونہی گزرے نہ ہیروں پھیروں میں

صادق باجوہ

بھولی بِسری ہوئی ہر یاد مٹا دی جائے
یہ ضروری تو نہیں دل کو سزا دی جائے

ہو اگر بس میں تو تفریق مٹا دی جائے
دل تو کہتا ہے عدو کو بھی دعا دی جائے

خواہشِ چارہ گری تشنہ طلب ہو جب تک
ڈوبتے دل کی ذرا آس بندھا دی جائے

گو مقدر کے لکھے پر بھی یقیں ہے لیکن
کیوں نہ خوابیدہ سی تقدیر جگا دی جائے

کوئی واویلا و مظلوم دُہائی سن کر
ڈھونڈ کر منصفی زنجیر ہِلا دی جائے

چاہ سے سَطوَتِ شاہی کی منازِل ہیں کٹھن
رَہروِ زِیست کو تعبیر بتا دی جائے

طَلَبِ آبِ بقا لے تو سکندر کو گئی
گھُپ اندھیرے میں مگر کس کو صدا دی جائے

پھر مسیح ہائے دُکھ و درد ہوئے ہیں مصلوب
ہے حقیقت ہی یہ صادق تو بتا دی جائے

غلام مرتضی راہی (فتح پور، یوپی)

برق کا رازدار تھا پانی
مدتوں میں کہیں کھلا پانی

چونٹیوں کی طرح اُٹھے بادل
پتھروں کی طرح گرا پانی

جس طرف بھی سفر پہ نکلے ہم
آخری موڑ پر ملا پانی

اب تو گہرائی میں کوئی جائے
خاک میں جذب ہو گیا پانی

آئنے کی طرح چمکتا تھا
پاؤں کے نیچے آ گیا پانی

دیکھتے رہ گئے ندی نالے
راستے میں نہیں رُکا پانی

غلام مرتضی راہی

جلتے بجھتے دیکھوں اندر اندر آگ
جان رہی ہے مجھ کو اپنا محور آگ

کھلی ہوا میں چھوڑ کے ہم نے دیکھ لیا
دور دور تک پھیل گئی چُٹکی بھر آگ

کیسے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاؤں میں
لگی ہوئی منظر تا پس منظر آگ

آگ لگانے والے اتنا جانتے ہیں
دَب جاتی ہے کر کے سب خاکستر آگ

جاڑوں کی راتوں میں اچھا لگتا ہے
سوتی ہے میرے سینے سے لگ کر آگ

بن کر بھاپ اُڑا جاتا ہے پانی سب
کون بجھانے جائے ساگر ساگر آگ

راجہ محمد یوسف خان (جرمنی)

میّتِ اقدار ہے پر نوحہ خواں کوئی نہیں
بے حِسوں کی بھیڑ ہے، بھاگو، یہاں کوئی نہیں

تم بھی دیواروں سے باتیں کر رہے ہو آج کل
کیا تمہارا بھی یہاں پر رازداں کوئی نہیں

وقت کا پردا ہے، اپنے وقت پر، اُٹھ جائے گا
ورنہ میرے اور اُس کے درمیاں کوئی نہیں

کارواں کے ہر مسافر کو ہے زُعمِ راہبری
کارواں کے ساتھ میرِ کارواں کوئی نہیں

اِس قدر خائف نجانے موت سے کیوں لوگ ہیں
زندگی سے جبکہ بڑھ کر امتحاں کوئی نہیں

بے وجہ یوسفؔ نہیں ہیں طالبِ نظرِ کرم
تجھ سے بڑھ کر واقفِ سوزِ نہاں کوئی نہیں

تبسم وڑائچ (سرگودھا)

مقدر جب سے اپنے سو گئے ہیں
دریچے اجنبی سے ہو گئے ہیں

سجے زنداں نہ کوئی دار روشن
یہاں کے لوگ شاید سو گئے ہیں

نہ جانے کب تلک یہ کاٹنا ہیں
میرے آباء جو فصلیں بو گئے ہیں

سلامت فصلِ گل میں بھی گریباں
یہ کیسے سانحے سے ہو گئے ہیں

دیے کی روشنی شیشم کی چھاؤں
کہاں بچپن کے وہ دن کھو گئے ہیں

حمیدہ معین رضوی (لندن)

یہ سلسلہ حیات کا۔ کہیں نہیں قرار ہے
ہے دائروں میں اک سفر نہیں رہِ فرار ہے
خزاں ہے کیوں یہ مستقل؟ کھڑی ہے فصلِ زہر کیوں؟
اجاڑ، بستیوں میں گونجتی یہ کیوں پکار ہے
جھلس گئیں ہیں مسجدیں، اجڑ گئے ہیں مکتبے
ہے دشت ،اب یہ پیاس کا، یہ درد کا دیار ہے
یہ شہروں میں عروس تھا، معاشرت کی روح تھا
یہ منبعِ فنون تھا ،جو ذلتوں میں خوار ہے
نہ روح کو سکوں ہے، نہ امن شہرِ دل میں ہے
مگن ہیں پھر بھی، لزتوں کا یوں چڑھا خمار ہے
نہ راستے عیاں ہیں اب، نہ منزلوں کی کچھ خبر
شکستہ پا ،لہولہو، نظر میں بس غبار ہے
شکست کی جو تہمتیں اٹھا نہ پایا وہ ہی ہے
کفن کو سر سے باندھ کر چلا جو سوئے دار ہے
سگانِ دہر لڑ رہے ہیں ، چاہ میں متاع کی
ہمارے واسطے،۔تباہی کا بس اک حصار ہے
دعائیں جا نہ پا سکیں، منافقت کے بوجھ سے
گماں ہے یہ کہ عرش پہ، ہمارا انتظار ہے

عاطر عثمانی (ملائیشیا)

ہوا کس شان سے خوشبو اُڑا کر لے گئی ہے
کسی گلفام کو رتھ پر بٹھا کر لے گئی ہے

مِری اس عمر سے سب روشنی کی کہکشائیں
کوئی تتلی مِرے جگنو بجھا کر لے گئی ہے

نجانے کیا کرے گی میری بستی میں ہوا یہ
جو سوتے میں بلاؤں کو جگا کر لے گئی ہے

مری یہ ذات مجھ سے میرے یہ ساتوں سمندر
مِری ہی ذات کا صحرا دکھا کر لے گئی ہے

بہت بپھری ہوئی تھی کل یہاں آندھی جو عاطرؔ
پرندوں کو کہاں جانے اڑا کر لے گئی ہے

نصرت گوالیاری (دہلی)

عجب تعبیر منظر ہنس رہے ہیں
یہ کس کے خواب کس پر ہنس رہے ہیں

نہیں سورج سے کم توقیر ان کی
جو ذرے سر اُٹھا کر ہنس رہے ہیں

زمیں کے غم کا اندازہ نہیں ہے
مزاجِ آسماں پر ہنس رہے ہیں

کئی قصے سناتا ہے وہ برگد
کئی دیواریں اور در ہنس رہے ہیں

فقیروں کی دعاؤں کا اثر ہے
مریدوں کے مقدر ہنس رہے ہیں

یہ دور، عافیت کب ہے؟ ابھی تو
ستم کرکے ستم گر ہنس رہے ہیں

طلب کی راہ میں ہر گام ،ہر سُو
تحیّر خیز منظر ہنس رہے ہیں

بنایا جس نے دیوانہ،اسی کو
وہ دیوانہ سمجھ کر ہنس رہے ہیں

جو رشتوں کا تحفظ ہیں وہ جذبے
مسائل بن کے گھر گھر ہنس رہے ہیں

دُکھوں کی دُھند رستے میں بچھی ہے
مگر مِیلوں کے پتھر ہنس رہے ہیں

منظور ندیم (مجلگاؤں)

کب ہے ممکن تیر سے، تلوار سے
جیتئے دل، نرمیٔ گفتار سے

باریابی کو کھڑی ہیں منزلیں
لگ کے بیٹھا ہوں تری دیوار سے

شہر ہے محدود وحشت بیکراں
''لا دے اک جنگل مجھے بازار سے''

ہوٹلوں میں خونِ انساں کی پھوار
راستے بھی اب لگیں گلزار سے

میری کشتی میں کئی سوراخ ہیں
مت صدا دے،جھیل کے اُس پار سے

فیض ہے یہ اپنی غزلوں کا ندیؔم
پیار اُن کو ہو گیا اغیار سے

جمیل الرحمٰن (انگلینڈ)

میں جس رات سونے سے ڈرتا رہا
اندھیرا بہت شور کرتا رہا

پرندوں نے پہلے اڑائی خبر
شجر بعد میں رنگ بھرتا رہا

اگر ہر طرف پیاس ہی پیاس ہے
تو پانی کہاں سے گذرتا رہا

اُسے اُس کے اندر کوئی کھا گیا
وہ لوگوں پر الزام دھرتا رہا

کیا راکھ پل میں کسی آگ نے
مگر دیر تک میں بکھرتا رہا

میں تیرے لئے جاں سے کیا جاؤں گا
اگر عشق پر ناز کرتا رہا

جمیل اپنی ناؤ بندھی رہ گئی
سمندر میں دریا اترتا رہا

رشید ندیم (کینیڈا)

چھوڑ دی ہے اذیت زدہ سی
دوستی اک عداوت زدہ سی

میں نے بڑھ کر گلے سے لگا لی
آج اک شام فرقت زدہ سی

دیکھ کر اس کی دیوانگی کو
عقل ہے سب کی حیرت زدہ سی

اس طرح کی طبیعت ہے اس کی
جیسے بستی ہو آفت زدہ سی

ایک شاعر اکڑتا ہے لکھ کر
چار غزلیں یبوست زدہ سی

معذرت دوستوں سے اگر ہے
یہ غزل کچھ ملامت زدہ سی

رؤف خیر (حیدرآباد)

بے عیب اب کسی کی غزل تو نہیں کوئی
میری غزل بھی تاج محل تو نہیں کوئی

نیت میں کھوٹ،سر میں خلل تو نہیں کوئی
وہ حیلہ جوئے جنگ و جدل تو نہیں کوئی

دنیا تمام یوں تو بڑی مہربان ہے
تیری عنایتوں کا بدل تو نہیں کوئی

میری گزر بسر ہے دلیل و جواز پر
اس رہ گزر میں لیت و لعل تو نہیں کوئی

اوروں کو مارنے کے لیے مر رہا ہے وہ
اس کے دماغ کا یہ خلل تو نہیں کوئی

تونے تو زیر کرنے ہیں دریا،پہاڑ،دشت
اب چیونٹی غریب مسل تو نہیں کوئی

کیسی عمارتیں تھیں جو ڈھانچے میں ڈھل گئیں
کردار اس میں نذرِ اجل تو نہیں کوئی

مظلوم ہو رہے ہیں تو ہوتے رہیں شہید
یہ دیکھنا ہے ردِ عمل تو نہیں کوئی
اہلِ قلم ہیں خیرؔ سے نایاب آج بھی
ہوگا رؤف خیر سا کل تو کوئی نہیں

رؤف خیر

وہ سر افراز ہووے اور کرکے سرفراز آوے
ولی جو اولیائے حرف و معنی کو نواز آوے

ہمارے منہ بھلا کیا خاک مجروحؔ و مجازؔ آوے
ظفرؔ،ناصرؔ،جلالیؔ ہی نہ مشتاقؔ و فرازؔ آوے

تیمّم زاد منہ پر چوکھٹوں کی خاک ملتا ہے
وضو کرنا لہو سے آوے تو طرزِ نماز آوے

میں کب سے راہ تکتا گوش برآواز بیٹھا ہوں نہ جانے
کب وہ یارِ خوش خرام و دل نواز آوے

سمندر ہو کہ قطرہ ہو،رہے اوقات میں اپنی
سمندر ہو کہ قطرہ ہو،اچھل جانے سے باز آوے

ہمیں شہ مات کیا دیتا،وہ سب مہرے گنوا بیٹھا
وہ شاطر ہی سہی اب آخری بازی سے باز آوے

نہ کوئی رازداں اس کا،نہ کوئی رازداں اپنا
زبانِ چشم و ابرو کے حوالے سے جو راز آوے

ہمیں آتا ہے بے غرقاب دریا پار کرنا بھی
مگر ہے شرط استقبال کو وہ پاکباز آوے
یہی ہونا تھا ہم تو خیرؔ کب کے ہو چکے اس کے
وہ ہم پر ناز فرمائے،کبھی بہر نیاز آوے

علی زبیر (کراچی)

گزر گیا ہے یہ دل یا ستارہ گزرا ہے
سبیلِ جاں سے کوئی بے سہارا گزرا ہے

وہ بازگشتِ مہ و سال ہی کے جیسا تھا
جو شخص آج یہاں سے دوبارہ گزرا ہے

سنو! کہ بس ہے یہی رنگِ داستانِ وصال
تمھاری دھوپ سے سایا ہمارا گزرا ہے

سے سمجھ رہے ہیں جس سبک خرام کو لوگ
وہ راہِ سود و زیاں سے خسارہ گزرا ہے

خیال اس کی نگاہوں کا دل سے یوں گزرا
کہ جیسے خشک ندی سے کنارہ گزرا ہے

علی زبیرؔ ہمیں دیکھتا تو رک جاتا
ابھی ابھی جو یہاں سے نظارہ گزرا ہے

علی زبیر

اگر وہ شخص کسی سے وفا نہیں کرتا
تو میں بھی رسم تکلف ادا نہیں کرتا

عجیب شہر ہے یہ مصلحت کا مارا ہوا
یہاں پہ کوئی کسی کا بھلا نہیں کرتا

ترا مزاج سمجھتا ہے تیرا دیوانہ
'گلی میں آتا ہے لیکن صدا نہیں کرتا'

سنو چراغ بجھاتا چلا ہی جاتا ہے
ہوا کا جھونکا کسی کی سنا نہیں کرتا

میں اپنے دھیان میں ہوں اور گزرتا جاتا
ہوں
سوال مجھ سے کوئی راستہ نہیں کرتا

بہت عزیز ہے مجھ کو یہ میری تنہائی
میں اِس لیے بھی تجھے ہم نوا نہیں کرتا

اڑا دیے ہیں مری زندگی نے ہوش مرے
علی زبیرؔ میں کوئی نشہ نہیں کرتا

منور احمد (ہزارہ)

مگر کسی میں نہیں ہے وفا کسی کے لیے
وفا کسی کے لیے ہے جفا کسی کے لیے

کسی کے واسطے جھونکے وفا کی خوشبو کے
بنی سموم ہے آب و ہوا کسی کے لیے

نبھا رہا ہے وہ تقدیر جان کر اپنی
مقام یہ بھی نہ لائے خدا کسی کے لیے

کبھی نہ بجھنے دیا ہم نے درد کی لَو کو
جلائے رکھا ہے دل کا دیا کسی کے لیے

دلوں کے بھید تو بہتر خدا ہی جانتا ہے
کہ سوچتا ہے بھلا کون کیا کسی کے لیے

ہوائے درد چلی تو پلٹ کے آ بھی گیا
جو مجھ کو چھوڑ کے تھا جا چکا کسی کے لیے

یہ زندگی تو منور گزر گئی یوں ہی
سنا کسی کے لیے اور کہا کسی کے لیے

جانِ عالم (مانسہرہ)

ہر کوئی ہے جس طرح بندھا ہوا
میں نہیں جناب کا بندھا ہوا

صبح و شام ،رات دن ، یہ زندگی
سلسلہ ہے اک لگا بندھا ہوا

اک ہَوا میں ہیں سبھی یہاں وہاں
اک سماں ہے ہر جگہ بندھا ہوا

وہ تیرا ہے یہ میرا ہے راستہ
جا نہیں ہے تُو مرا بندھا ہوا

آسماں ہی آسماں تاھ ہر جگہ
میں کھلی زمیں پہ تھا بندھا ہوا

شکر ہے میں تیری یاد سے گیا
شکر ہے میں کھل گیا بندھا ہوا

سرور عالم راز (امریکہ)

مرے جب بھی قریب آئی بہت ہے
یہ دُنیا میں‌نے ٹھکرائی بہت ہے
میں سمجھوتہ تو کرلوں زندگی سے
مگر ظالم یہ ہرجائی بہت ہے!
تمھیں سرشاریٔ منزل مبارک
ہمیں یہ آبلہ پائی بہت ہے
کہاں میں اور کہاں تیری تمنا ؟
مگر یہ دل! کہ سودائی بہت ہے
بلا سے گر نہیں سُنتا ہے کوئی
مجال و تابِ گویائی بہت ہے
مری رِندی بہ رنگِ پارسائی
حریفِ خوفِ رُسوائی بہت ہے
میں حسرت آشنائے آرزو ہوں
مری غم سے شناسائی بہت ہے
نہ آئی یاد تو برسوں نہ آئی
مگر جب آئی تو آئی بہت ہے
میں خود کو ڈھونڈتا ہوں انجمن میں
مجھے احساس تنہائی بہت ہے!
زمانے کو شکایت ہے یہ سرورؔ
کہ تجھ میں بوئے خود رائی بہت ہے

سرور عالم راز

سجدۂ کفر سرِ کوئے انا تھا کہ نہ تھا؟
دل میں سرورؔ ترے کچھ خوف خدا تھا کہ نہ تھا؟
ہم غریبانِ وفا تھے،سو وَفا دار رَہے
اِس کو وہ جانے اُسے پاسِ وَفا تھا کہ نہ تھا!:
حیف ڈھونڈا کیا تو راہِ طلب میں اُس کو
یہ بتا دل مرے! کچھ اپنا پتا تھا کہ نہ تھا؟
ایک سایہ تھا، گذرگاہِ نظر تھی، میں تھا
کیا خبر مجھ کو کہ وہ کون تھا،کیا تھا،کہ نہ تھا!
زحمتِ زیست،غم آرزو، فکرِ دَوراں
ہر گھڑی ایک نہ اِک کھٹکا لگا تھا کہ نہ تھا؟
عشق تسبیحِ ازل، عشق ہی تسبیح ابد
عشق ہی حاصلِ صد صبح ومسا تھا کہ نہ تھا؟
ہر طرف لالہ وگل، بوئے بہاراں ہر سُو
کوئی بتلائے کہ وہ جلوہ نما تھا کہ نہ تھا؟
ہاں وہی چھیڑ گیا جو یہ رُبابِ ہستی
جانِ جاں، جانِ غزل، جانِ وفا تھا کہ نہ تھا؟
یک بیک رُک گئی سرورؔ جو یہ نبضِ ہستی
سچ بتا، تونے اُسے یاد کیا تھا کہ نہ تھا؟

طاہر عدیم

ایک ہم ہی نہیں مٹتے ہوئے آثار میں گُم
لوگ کتنے ہی ہوئے وقت کی رفتار میں گُم

گر یہ بیٹھی رہی یونہی مری گُفتار میں گُم
ہو نہ جائے کہیں محفل مرے کردار میں گُم

سانس لیتے ہوئے نکلیں گے جو ڈالو گے نظر
کتنے شہکار صنم اب بھی ہیں کُہسار میں گُم

تخت پایا ہے تو پھر عزم کا پرچم بھی اُٹھا
وہ بھی سر کیا ہے کہ ہو جائے جو دستار میں گُم

بیچ بازار میں مجھ پر نہ پڑی کوئی نظر
اے خدا!! کوئی نہ ہو یوں بھرے بازار میں گُم

حسنِ جاناں میں پروتے ہیں سخن کے موتی
لوگ کچھ آج بھی ہیں کوششِ بیکار میں گُم

اب تو ڈھونڈے سے بھی میں خود کونہیں ملتا ہوں
مرا ہونا ہے مرے فرض کی دیوار میں گُم

ایسے اُترا تھا کسی ماتمِ مژگاں پہ شباب
لوگ جو بھی تھے رہے چشمِ عزادار میں گُم

مقبروں پر جو کبوتر ہیں ، بتائیں گے تمہیں
کتنی کلیوں کی ہوئیں سسکیاں دربار میں گُم

چاندنی بن کے وہ پھیلا ہے مرے آنگن میں
ہے ہُنر جستجوئے قوتِ اظہار میں گُم

ڈھونڈنا چاہے تو ڈھونڈے کہ ہے جس کو بھی دماغ
مرے ادوار ہوئے ہیں مرے اشعار میں گُم

سَر کچھ اِس شان سے گردن پہ سجا ہے طاہرؔ
عزم قاتل کا ہے گرتی ہوئی تلوار میں گُم

طاہر عدیم

آ گرا ہے زمیں پر کھڑا تھا جو گھر ، جاں نکلتی نہیں
میرے اوپر پڑے ہیں مرے بام و در ، جاں نکلتی نہیں

اے مرے چارہ گر!! کیا ہوا وہ ہُنر جاں نکلتی نہیں
رکھے زانو پہ سر ہو گئی ہے سحر ، جاں نکلتی نہیں

جو بھی رستہ مجھے تھا بتایا گیا آزمایا گیا
ہر طرف میں گیا ہوں میرے راہبر جاں نکلتی نہیں

جان لینے کے نشے میں تُو چُور تھا کتنا مشہور تھا
کیا ہُوا تیرا جادو مرے جادوگر جاں نکلتی نہیں

اس سے بڑھ کر مرے ہاتھ میں کچھ نہیں اے مرے ہم نشیں
شام ہونے سے پہلے میں جاتا ہوں مَر جاں نکلتی نہیں

رُوٹھ جانے پہ کیوں دل یہ تھمتا نہیں ، سانس رُکتا نہیں
کیوں جدائی کے ڈر سے مرے ہمسفر جاں نکلتی نہیں

ڈھونڈ لاؤ کہیں سے ہواؤ اُسے یہ دکھاؤ اُسے
اُس کے تیروں سے چھلنی ہیں قلب وجگر جاں نکلتی نہیں

یہ زباں کاٹ لینے سے ڈرتے نہیں ، لفظ مرتے نہیں
طائرِ فکر کے کاٹ دینے سے پَر جاں نکلتی نہیں

اس وصیت کے پڑھنے میں کیا حرج ہے ، اس میں کیا درج ہے
اب بھی بے چین ہے کس قدر وہ نظر جاں نکلتی نہیں

بعد میرے کچھ ایسے بکھر جائے گی تُو بھی مَر جائے گی
اے میری جانِ جاں بس یہی سوچ کر جاں نکلتی نہیں

کچھ مناجات لے کر میں سجدے میں ہوں تیرے رستے میں ہوں
خالی دامن ہے مولا اسی کا ہے ڈر ، جاں نکلتی نہیں

مجھ کو طاہرؔ وہ کب تک یوں تڑپائے گا وہ پلٹ آئے گا
دل میں جب تک ہے امید کا یہ شرر ، جاں نکلتی نہیں

سعید خان (سڈنی، آسٹریلیا)

ایک جنوں کی خاطر ساری دنیا چھوڑ کے آئے ہیں
تُو کیا جانے تیرے لئے ہم کیا کیا چھوڑ کے آئے ہیں

ہم یاروں کے یار ، وہ جن کے دم سے شہر کی رونق تھی
اِک تیری محفل کی خاطر میلہ چھوڑ کے آئے ہیں

سارے خواب سراب کرے یا اب ہم کو سیراب کرے
ہم تیرے صحرا کے لئے سو دریا چھوڑ کے آئے ہیں

ہم سے زیادہ جانِ غزالاں قدر ہے کس کو وحشت کی
تیرے لئے ہم خود کو اکثر تنہا چھوڑ کے آئے ہیں

تُو بھی آوازوں کے کتنے مقتل کاٹ کے آئی ہے
ہم بھی رسوائی کا میلہ برپا چھوڑ کے آئے ہیں

کون لکیروں کے جنگل میں عمر گنوائے یار سعیدؔ
دل کی راہ پہ آنے والے رستہ چھوڑ کے آئے ہیں

نذر عباس (اسلام آباد)

اُدھر قدم جو بڑھائے دل نے
عجیب منظر دکھائے دل نے

ہمیں بھروسہ بلا کا اُن پر
تو شک انہیں کے کمائے دل نے

کسی کو دیوار میں چنا تو
کسی کو صحرا پھرائے دل نے

ہوا کے لہجے میں تلخیاں تھیں
لہو سے دیپک جلائے دل نے

نذر جو معراجِ عشق آئی
تو سر ، بسجدہ کٹائے دل نے

مسرت انجم (دہلی)

جو رشتے ٹوٹ چکے ہیں بحال کر جائے
وہ اپنے عشق کو پھر لازوال کر جائے

اُسے بھی چھوڑ کے جائے کوئی محبت میں
کوئی تو اُسکی وفا پر سوال کر جائے

ابھی تو عشق میں بدلی نہیں تری چاہت
بڑھے جنون تو پیدا مثال کر جائے

ہو میرے چہرے پہ کچھ تو کمی اداسی کی
کسی کا غم سے ابھرنا کمال کر جائے

وہ ڈال دے مری جھولی میں اپنی چاہت کو
مری خوشی کا ذرا سا خیال کر جائے

مسرت انجم

اندھیری رات کا پہلا ستارہ کون دیکھے گا
جو چمکے گا اندھیرے میں وہ چہرہ کون دیکھے گا

تمہارے واسطے تاریکیوں کی رات کاٹی ہے
نہ ہوگے تم تو پھر اِتنا اجالا کون دیکھے گا

مری یہ سوچ مجھکو دُور تک جانے نہیں دیتی
کہ اُسکے لوٹ آنے کا نظارہ کون دیکھے گا

یہاں تو لوگ اک لمحے میں چہرہ بھول جاتے ہیں
مری شہرت کا جب چمکے گا سکّہ کون دیکھے گا

چلی تو جاؤں میں کوچے سے اُسکے زندگی لیکن
نہ جانے بعد میرے اُسکا رستہ کون دیکھے گا

شبانہ یوسف (انگلینڈ)

وہ نظم و ضبط کا اس طرح َ دھیان رکھے گا
کہیں پہ تیر کہیں پر کمان رکھے گا
وہ چھین کر مری ہر اک خوشی کہے مجھ سے
کہ میرے پاؤں میں سارا جہان رکھے گا
تعلقات میں خود بھی رہے گا مشکل میں
سدا عذاب میں میری بھی جان رکھے گا
مجھے بھروسہ ہے اپنے جمال پر لیکن
لگن کو اپنی وہ کب تک جوان رکھے گا
چلا گیا تو مٹا دے گا نقشِ پائے خیال
ہر ایک راستہ وہ بے نشان رکھے گا
فصیلِ ہجر وہ خود ہی نہیں گرائے گا
یہ تشنگی تو مرا مہربان رکھے گا
حصارِ ارض و سما سے نکل نہیں سکتا
وہ چاہے کتنی بھی اونچی اُڑان رکھے گا
ہزار فاصلوں سے بھی وہ زخم دے گا مجھے
کوئی تو رابطہ وہ درمیان رکھے گا
کبھی تو مجھ کو شبانہ پکارے گا آخر
وہ کچھ تو میرے تعلق کا مان رکھے گا

شبانہ یوسف

کسی کے واسطے اس طرح گھر لکھا میں نے
کہ خود تو دھوپ رہی اور شجر لکھا میں نے

میں کیسے روکتی بڑھتے ہوئے قدم اپنے
مرے نصیب میں تھا یہ سفر لکھا میں نے

یہ شاعری تو مرے دل کی اک بغاوت ہے
مجھے ہر ایک نے روکا مگر لکھا میں نے

کسی طرف بھی کنارا نظر نہیں آیا
جدائیوں کو سمندر ، اگر لکھا میں نے

بھٹک رہی ہوں نجانے تلاش میں کس کی
نہیں خبر کسے شام و سحر لکھا میں نے

اسے مٹایا کئی بار خوفِ دنیا سے
کبھی جو نام ترا ہاتھ پر لکھا میں نے

مرا یہ جرم، زمانے کے ساتھ چل نہ سکی
کہ پتھروں کی فصیلوں پہ در لکھا میں نے

شبانہ اس پہ بھی جھپٹے عقاب دنیا کے
جو کاغذوں کے کبوتر پہ پَر لکھا میں نے

شبانہ یوسف

ہر اک بات پر یونہی اُلجھوں، لڑوں میں
کسی کو ترے ساتھ کب تک سہوں میں

ہُوا ہے کٹھن روکنا آنسوؤں کو
بہانہ کوئی تو ملے ،رو سکوں مَیں

اگر وہ مرا ہے تو پھر کیوں کسی سے
وہ منسوب ہو ،اور اُسے قرض لوں مَیں

گھنے پیڑ سے لپٹی ہوں بیل جیسی
ہوا سانس بھی لے تو لرزوں ،ڈروں میں

کسی دسترس میں ہوں گڑیا کی مانند
کہے تو چلوں، وہ کہے تو رکوں میں

بدن کی گلی میں ہے اتنی خموشی
صدا ٹوٹتے پتّے کی بھی سنوں میں

وہ دریا نہیں ہے تو پھر کیوں شبآنہ
ندی کی طرح اُس کی جانب بہوں میں

شبانہ یوسف

حصارِ ذات میں سارا جہان ہونا تھا
قریب ایسے تجھے میری جان ہونا تھا

تری جبیں پہ شکن کیوں وصال لمحے میں
محبتوں کا یہاں تو نشان ہونا تھا

تمھارے چھو نے سے کچھ روشنی بدن کو ملی
وگرنہ اس کو فقط راکھدان ہونا تھا

بہت ہی تھوڑی تھی دل میں تمھارے عمر مری
تھی خواب زاد مجھے داستان ہونا تھا

کسی کی نفرتوں نے مٹی میں ملا ڈالا
جو خواب تارا سا پلکوں کی شان ہونا تھا

بچھڑ گیا تو شبآنہ ملال کیا کرنا
اُسے بچھڑنا تھا وہم و گمان ہونا تھا

شبانہ یوسف

ہم اگر سچ کے انھیں قصے سنانے لگ جائیں
لوگ تو پھر ہمیں محفل سے اُٹھانے لگ جائیں

یاد بھی آج نہیں ٹھیک طرح سے جو شخص
ہم اُسے' بھولنا چاہیں تو زمانے لگ جائیں'

شام ہوتے ہی کوئی خوشبو دریچہ کھولے
اور پھر بیتے ہوئے لمحے ستانے لگ جائیں

خود چراغوں کو اندھیروں کی ضرورت ہے بہت
روشنی ہو تو انھیں لوگ بجھانے لگ جائیں

اک یہی سوچ بچھڑنے نہیں دیتی تجھ سے
ہم تجھے بعد میں پھر یاد نہ آنے لگ جائیں

ایک مدت سے یہ تنہائی میں جاگے ہوئے لوگ
خواب دیکھیں تو نیا شہر بسانے لگ جائیں

شبانہ یوسف

اسی کے قرب میں رہ کر ہری بھری ہوئی ہے
سہارے پیڑ کے یہ بیل جو کھڑی ہوئی ہے

ابھی سے چھوٹی ہوئی جارہی ہیں دیواریں
ابھی تو بیٹی زرا سی، مری بڑی ہوئی ہے

بنا کے گھونسلہ چڑیا شجر کی بانہوں میں
نجانے کس لیے آندھی سے اب ڈری ہوئی ہے

ابھی تو پہلے سفر کی تھکن ہے پاؤں میں
کہ پھر سے جوتی پہ جوتی مری پڑی ہوئی ہے

نئی رتوں کے مقدّس بلاوے تو ہیں مگر
صلیب وعدوں کی جو دل میں اک گڑی ہوئی ہے

میں ہاتھ باندھے ہوئے لوٹ آئی ہوں گھر میں
کہ مرے پرس میں اک آرزو مری ہوئی ہے

اگر بچھڑنے کا اس سے کوئی ملال نہیں
شبآنہ اشک سے پھر آنکھ کیوں بھری ہوئی ہے

ارشاد عرشی ملک (اسلام آباد)

آنکھ میں بہتی ہوئی لاشوں کے منظر رہ گئے
ذہن پر طاری گئے سیلاب کے ڈر رہ گئے

اک قیامت ڈھا گئیں اب کے برس بھی بارشیں
ان گنت افراد اب کے بھی کھلے سر رہ گئے

دندناتا خوف گلیوں میں پھرا خنجر بکف
مصلحت اندیش تھے جو گھر کے اندر رہ گئے

راہ کی دُشواریاں مشکوک سی لگنے لگیں
کارواں مر کھپ گئے ہیں صرف راہبر رہ گئے

شور کے آہٹ کے ہنگامے کے طالب ہیں سبھی
سب کی آنکھوں میں شرر ہاتھوں میں پتھر رہ گئے

وہ بھی کیا دن تھے کہ چہرے پر دھنک کے رنگ تھے
یہ بھی کیا دن ہیں کہ آنکھوں میں سمندر رہ گئے

اس کھنکتے اعتماد اور حوصلے کی خیر ہو
پتھروں کے شہر میں شیشے کے پیکر رہ گئے

تھا تعاقب تتلیوں کا جو ہمیں مہنگا پڑا
ہم عزیزوں اور پیاروں سے بچھڑ کر رہ گئے

پھول بھی مرجھا گئے اور رنگ بھی پھیکے ہوئے
آج ان ہاتھوں میں عرشی صرف پتھر رہ گئے

ارشاد عرشی ملک

باہر کی چُپ ٹوٹے عرشی اندر بول اٹھے
جس منظر میں وہ در آئے منظر بول اٹھے

مجھ میں پوشیدہ صورت کو آج رہائی دے
سنگ تراش کے ہاتھ میں آ کر پتھر بول اٹھے

آج چلو اک دوجے کو اصلی صورت میں دیکھیں
جو بھی جس کے جی میں آئے کھل کر بول اٹھے

اس سے جو کچھ طے کرنا ہے اس جیون میں کر لو
ایسا نہ ہو کل وہ روزِ محشر بول اٹھے

میرے گھر کا سونا پن پل میں رخصت ہو جائے
جب وہ گھر میں داخل ہو سارا گھر بول اٹھے

جسم و جاں کی ساری تلخی ہونٹوں پر آٹھہری
چپُ رہنے کی جی میں ٹھانی تھی پر بول اٹھے

اب محرومی آخری حد پر لوگوں کو لے آئی
کچھ دن میں تم دیکھو گے کہ اکثر بول اٹھے

میری اپنی جنگ مجھی کو تنہا لڑنی ہے
کون ہے جو اس شہر میں میری خاطر بول اٹھے

تیرا اپنا بوجھ بنے گا سب زخموں کا باعث
ننگے پیروں کے نیچے سب کنکر بول اٹھے

آج کھلا یہ راز کہ عافیت تقلید میں ہے
پیر اٹھایا مرضی سے تو رہبر بول اٹھے

اُس نے کچھ نہ کہہ کر بھی عرشی اپنی منوائی
آج بھی وہ نہ بولا اس کے تیور بول اٹھے

ارشاد عرشی ملک

جلتے صحراؤں میں چشمہ دیکھ لیا
دور دیس میں کوئی اپنا دیکھ لیا

سُونے دل پر سپنوں کی یلغار ہوئی
اس کی آنکھ میں اپنا چہرہ دیکھ لیا

سولہ کا سن اور دمکتا مکھڑا اس کا
اوپر سے اس نے آئنہ دیکھ لیا

ساری بھیڑ کو چیر کے میری سمت بڑھا
اس نے مجھ کو خود سا تنہا دیکھ لیا

جانے اب اس سپنے کی تعبیر ہو کیا
آنچل کو کانٹوں سے الجھا دیکھ لیا

سات برس کی عمر میں چہرہ پختہ ہے
جانے اُن آنکھوں نے کیا کیا دیکھ لیا

گھر کے اندر الجھا الجھا رہتا ہے
بچے نے باہر کا رستہ دیکھ لیا

میرا اس کا ساتھ ہے عرشی برسوں کا
اُس نے مجھ میں آج نیا کیا دیکھ لیا

ارشاد عرشی ملک

مجھ کو اپنی ذات سے نا آشنا رکھتا ہے وہ
اپنے میرے درمیاں کچھ فاصلہ رکھتا ہے وہ

کشتیاں ساری جلا بیٹھا ہے میرے سامنے
لوٹ کر جانے کا لیکن حوصلہ رکھتا ہے وہ

سب نئے موسم نئے دکھ سکھ لبھاتے ہیں اسے
ہر نئی رُت کا زباں پر ذائقہ رکھتا ہے وہ

زندگی کرنا بھی گویا کانچ پر چلنا ہوا
جسم میں دل کی جگہ اک آئینہ رکھتا ہے وہ

اس نے خود مجھ کو تراشا ہے مگر پوجا نہیں
توڑ دینے کا جبھی تو حوصلہ رکھتا ہے وہ

میرے چاروں اور دیواریں مرے قد سے بڑی
اور اپنے واسطے رستہ کھلا رکھتا ہے وہ

قتل کرنے کی دلیری اس کے ہر تیور میں ہے
اپنے بٹوے میں ہمیشہ خوں بہا رکھتا ہے وہ

عادتاً خاموش ہی رہتا ہے وہ عرشی مگر
بات پر جب بھی کرے لہجہ نیا رکھتا ہے وہ

حیدر قریشی

ترا مقصود ہو کر رہ گیا ہے
یہ دل محدود ہو کر رہ گیا ہے
جو ناموجودیت میں بیکراں تھا
وہ بس موجود ہو کر رہ گیا ہے
جہاں ملنے تھے اپنے دل،وہ رستہ
بہت مسدود ہو کر رہ گیا ہے
زیاں کے شوق میں نکلے تھے لیکن
زیاں بھی سود ہو کر رہ گیا ہے
بڑی ’’مقبولیت‘‘ حاصل تھی اس کو
بڑا مردود ہو کر رہ گیا ہے
کسی پر آگ ٹھنڈی ہو گئی ہے
کوئی نمرود ہو کر رہ گیا ہے
سدا انکار تھی پہچان جس کی
سراپا جُود ہو کر رہ گیا ہے
بہت ہی پیار وہ کرتا ہے مجھ سے
وہ کب معبود ہو کر رہ گیا ہے
کبھی شعلۂ جوّالہ تھا، حیدرؔ
یہ دل اب دُود ہو کر رہ گیا ہے

☆☆☆

حیدر قریشی

اظہار کی اِس دل نے اس بار تو حد کر دی
ہر بات مگر اُس نے اِس بار بھی رد کر دی
جو کام نہ ہونا تھا،وہ ہو ہی گیا آخر
کچھ ہم نے بھی ہمت کی،کچھ اس نے مدد کر دی
اس درد سمندر میں اک جزر تھا مدّت سے
اس درد سمندر میں کیوں آپ نے مد کر دی
اعداد ہوئے غالب تو آج کی دنیا نے
ہر حرف کی حرمت ہی اب زیرِ عدد کر دی
جو مانتے ہیں دل سے وہ کھل کے نہیں کہتے
یاروں کے رویے نے توثیقِ حسد کر دی
وا گود رکھی اس نے،بیداری رہی جب تک
جب نیند کا وقت آیا ،گود اس نے لحد کر دی
نکلے تھے ازل سے جواک لہر میں،سو ان کی
قسمت نے مسافت بھی تاحدِ ابد کر دی
تھے زیر و زبر دونوں،اک زیر ہوا آخر
پھر آخری لمحے میں اس زیر نے شد کر دی
شدت کا رویہ ہی عادت سی رہی اس کی
نفرت بھی بلا کی تھی،چاہت بھی اشد کر دی
جب عشق کیا حیدرؔ معیار بنا ڈالا
اور ایسی محبت کی،دنیا میں سند کر دی

حیدر قریشی

نہ جانے کیوں تمناؤں کی طغیانی میں رکھا ہے
ابھی تک دل نے خود کو عہدِ نادانی میں رکھا ہے
یہ کیسا آئنہ رُو اب کے میرے روبرو آیا
مجھے جس نے مسلسل ایک حیرانی میں رکھا ہے
کوئی خواہش ہو،اب کہتے ہی فوراً مان لیتا ہے
ستم گر نے مجھے اب بھی پریشانی میں رکھا ہے
عنایت میں بھی اک طرزِ ستم محسوس ہوتا ہے
نہ لاؤں تاب جس کی ایسی تابانی میں رکھا ہے
دکھائی شانِ فقر اپنی تمہاری بادشاہی میں
فقیری عجز اپنے عہدِ سلطانی میں رکھا ہے
ہے میری روح میرے جسم کے ہر ذرّہ میں پنہاں
تو اپنے جسم کو اک شہرِ روحانی میں رکھا ہے
دیارِ حُسن میں خیرات کی خواہش نہیں رہتی
بخیلوں نے بخیلی کو فراوانی میں رکھا ہے
بہت سی بے نیازی اور اک یادوں بھری گٹھڑی
بڑا سامان اپنی خستہ سامانی میں رکھا ہے
یہاں سے رونقیں دکھ درد کی جاتی نہیں حیدرؔ
دکھوں کا ایسا میلہ اپنی ویرانی میں رکھا ہے

☆☆☆

حیدر قریشی

افلاک کی لگن میں زمیں کے نہیں رہے
یارانِ تیز گام کہیں کے نہیں رہے

دنیا سمیٹنے میں ہی دنیا سے کٹ گئے
جب دین کو سمجھ گئے دیں کے نہیں رہے

دل کی زمیں کو چاند ستاروں سے بھر لیا
ہم صرف ایک ماہ جبیں کے نہیں رہے

حُسنِ ازل کی چاہ میں بھٹکے ہیں جابجا
ویسے تو ہم کسی بھی حسیں کے نہیں رہے

دو گز کی ایک قبر بھی قسمت کی دین سے
باقی مکاں کسی بھی مکیں کے نہیں رہے

صحراؤں میں بھی رونقیں شہروں کی آگئیں
ہم بادیہ نشیں تو کہیں کے نہیں رہے

قدموں سے حیدرؔ اُن کے لپٹتے ہیں اس طرح
جیسے یہ سجدے میری جبیں کے نہیں رہے

جوگندر پال (دہلی)

بھرم

نصف شب ہونے کو آ رہی تھی لیکن وہ گھٹنوں میں سر دیئے جوں کی توں منتظر بیٹھی تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے گنجان سیاہ بالوں کو دیکھ کر رات کے گاڑھے ہوتے چلے جانے کا خیال آتا تھا، کبھی کبھی کھٹکا سن کر وہ اپنی آنکھیں گھٹنوں سے نکال کے دروازے کی طرف دیکھنے لگتی اور اس کی ان بھڑکتی شمعوں سے بجلی کی سوئی سوئی مدھم روشنی ہڑبڑا سی جاتی... شاید وہ آ گیا... لیکن دروازے کا میلا میلا خلا آگے بڑھ کر اسے سمجھانے لگتا، کیوں ناحق اپنی جان کی بیری بنی ہوئی ہو؟ اٹھو، کھانا کھا لو۔

''نہیں... نہیں... نہیں'' اس کی آواز سے سسکیاں امنڈ رہی تھیں۔ اس کی ساس دوڑتی ہوئی کمرے میں آ گئی۔

''روؤ نہیں بیٹی۔'' وہ اس کے پاس ہی بیٹھ کر شفقت سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ''رو کیوں رہی ہو؟''

''میری قسمت میں تو رونا ہی لکھا ہے ماں۔ جاؤ، تم سو جاؤ۔''

''سو کیسے جاؤں؟ پہلے تم کھانا کھا لو، پھر میں بھی کھاٹ پر جا پڑوں گی۔''

''نہیں جب تک وہ نہیں آئے گا میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔''

''کھاؤ گی نہیں تو کل اٹھو گی کیسے؟ آؤ۔'' اس کی ساس نے اس کے بازو کے نیچے ہاتھ دے کر اسے اٹھانا چاہا۔

''جاؤ ماں، کئی بار کہہ چکی ہوں، وہ آئے گا تو اس کے ساتھ کھا لوں گی۔'' روتے روتے وہ اپنی ساس کو ڈانٹنے لگی۔ ''میں کہتی ہوں جاؤ۔''

اس کی ساس نے بڑبڑاتے ہوئے اپنے پلو سے آنکھیں پونچھیں اور اٹھ کر باہر جانے کے لئے مڑ گئی۔

اس نے پھر اپنا چہرہ گھٹنوں میں لے لیا، رات پھر گاڑھی ہونے لگی۔

اس کا شوہر رات دیر سے گھر لوٹتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ دفتر سے چھٹی ہوتے ہی سیدھا یار دوستوں کے کسی اڈے کی طرف ہو لیتا اور وہیں بیٹھے بیٹھے رات کر دیتا۔

''سارے دن کی کھچ کھچ کے بعد یوں ہی ذرا پتے کھیلنے کے لئے اکٹھے ہو جاتے ہیں شوبھا، تم اپنا من میلا نہ کیا کرو۔''

شادی کے بعد چند روز تک تو وہ دفتر سے سیدھا گھر آتا رہا مگر پھر جو یہ سلسلہ شروع ہوا تو اٹوٹ ہو گیا۔ وہ اس سے بہت لڑی بھڑی، منت وسماجت بھی کی مگر اس کے شوہر کا کلیجہ تو پتھر کا تھا۔ جسے جتنا بھی توڑیں، کنکر ہی کنکر نکلیں گے۔

''تمہیں خیال نہیں آتا کہ میں یہاں ایک ایک پل تمہارے انتظار میں بتا رہی ہوتی ہوں۔''

''سب ہی پرانے یار غار ہیں شوبھا، باتوں اور پتوں میں پٹتے پٹاتے رات سر پر آ جاتی ہے۔''

''سر پر نہیں آ جاتی، آ کے رخصت ہو رہی ہوتی ہے۔''

گزشتہ اتوار کو تو اس کے شوہر نے واقعی حد کر دی۔ ساری ساری رات گھر سے باہر رہا۔ اس نے اسی طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں رات بتائی، تلملاتی رہی اور سوچتی رہی کہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے وہ؟ اسے میری پروا نہیں تو میں بھی اس کی پروا کیوں کروں؟

''بیٹی وہ تو کہتا تھا، آج اتوار ہے، دن بھر وہاں بیٹھے گا اور رات ہونے سے پہلے لوٹ آئے گا۔''

''نہیں لوٹا تو میں کیا کروں، ماں؟''

''نہیں بیٹی آخر وہ ابھی تک آیا کیوں نہیں؟''

''آئے گا تو اسی سے پوچھ لینا، مجھے کیا پتا؟''

اس نے وہ ساری رات بھی کھَول کھَول کر گزار دی تھی... ہاں مجھے معلوم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کہیں شراب وراب پی کے پڑ گیا ہو گا... ایک بار اسے اپنے شوہر کے منہ سے شراب کی بو بھی آئی تھی مگر وہ بات ٹالنے کے لئے بول گیا تھا کہ میری شراب تو تم ہو شوبھا...

''اسی لئے تو اپنی رنگ رلیوں کی خاطر مجھے پی پی کر ختم کئے جا رہے ہو... ایک اتوار ہی تو سارے ہفتے میں مل بیٹھنے کو ملتا ہے۔'' اس نے اپنے شوہر کے آگے ہاتھ جوڑ دئے تھے۔ ''آج چھٹی کا دن ہے، دوستوں سے دن بھر ملتے رہو مگر اندھیرا ہونے سے پہلے لوٹ آؤ...''

سو قسمیں کھا کر گیا تھا، اسے کیا پتا تھا کہ دوسرے دن تک غائب رہے گا۔ ایک تو وہ ساری رات اندھیرے کے پہاڑ پر اکیلی بھٹکتی پھری، دوسرے، اس سرگردانی میں اسے اپنے شوہر کی بوڑھی ماں کو بھی تھامے رہنا تھا۔

''بیٹی شہر کی سڑکوں پر گاڑیاں بلاؤں کی طرح دوڑتی پھرتی ہیں، کہیں... کہیں کسی گاڑی کے...''

''اپنی گاڑی کے نیچے تو تمہارے بیٹے نے مجھے لیا ہوا ہے ماں۔''

''اسے ڈھونڈو بیٹی اتنی دیر تک وہ باہر کبھی نہیں رہا۔''

''ماں میں اسے ڈھونڈتے ہی ڈھونڈتے تمہارے گھر آ پہنچی تھی۔ اب یہاں سے کہیں اور نکل گئی تو وہ مجھے ڈھونڈتا پھرے گا اور میں اسے ہاتھ نہ آؤں گی۔''

''آؤ بیٹی اب کھانا کھا لو رات نکلی جا رہی ہے۔ کب تک بھوکی پڑی رہو گی؟''

''مجھے زہر لا دو ماں میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔''

دوسرے دن گجردم مندر کی گھنٹیاں بج رہی تھیں کہ دروازے پر ایک مجرمانہ کھٹکھٹاہٹ ہوئی۔اس نے بے اختیار دروازے کی طرف دوڑنا چاہا۔مگر پتھر کی پتھر پڑی رہی... جہاں رات گزاری ہے وہیں سے دفتر کیوں نہیں ہولیا؟ دفتر سے بھی سیدھے وہیں چلا جایا کرے۔ یہاں اس کا ہے ہی کون؟...اس کی ساس نے جا کے دروازہ کھولا۔

''شکر ہے بیٹا تم آ گئے۔میرے دل میں طرح طرح کے برے خیالات آ رہے تھے۔''

''تم خواہ مخواہ گھبرائی ہو ماں، میں کوئی بچہ تھوڑا ہی ہوں۔''

پتھر کا جی چاہا کہ اڑ کر اپنے آپ کو اس کے ماتھے پر پٹخ دے۔

''بچے ہوتے تو میں تو بچی رہتی۔''

''ارے بھئی بلا وجہ کیوں سر ہونے لگی ہو، پہلے پوری سن تو لو۔''

''نہیں مجھے کچھ نہیں سننا ہے۔''

''آج سے پہلے کبھی ساری رات باہر رہا ہوں؟ وہ تو یوں رہا کہ پتے کھیلتے کھیلتے...''

''پتے کھیلتے کھیلتے مجھے بھی داؤ پر لگا کر ہار آنا تھا۔میرا روز روز کا انتظار ختم ہو جاتا۔''

''شوبھا''

''اسے ڈانٹو نہیں بیٹا، رات بھر سے اسی طرح تمہارے انتظار میں بیٹھی ہے، سوئی ہے نہ کھایا پیا ہے۔''

اس کے شوہر کا من پسیج گیا۔لا ابالی تھا مگر دل کا اچھا تھا۔دونوں کانوں کو پکڑ کر اس کے سامنے توبہ کرنے لگا کہ آئندہ کبھی دیر سے نہ آؤں گا۔

''نہیں، میں تمہیں معافی مانگنے کو تھوڑا ہی کہتی ہوں۔ مجھے تو یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ ایسا نہ ہو، کسی دن کبھی نہ لوٹنے کا فیصلہ کر لو اور میں زندگی بھر تمہارے گھر میں یوں ہی تمہارے انتظار میں پڑی رہوں۔''

''اری اب بھول کیوں نہیں جاتیں؟ چلو کھانا گرم کرو، میں منہ ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔''

بدستور گھٹنوں میں سر دیے آنکھیں موند کر وہ گویا اس دن سے اب تک اپنے شوہر کے ساتھ بیٹھی کھانا ہی کھائے جا رہی تھی۔من دکھ سے کتنا ہی بھرا ہوا کیوں نہ ہو، بھوک نہیں مرتی۔

''باہر کا دروازہ بند کر دوں بیٹی؟''

اپنی ساس کی آواز سن کر اس نے پھر اپنا سر گھٹنوں میں سے اٹھا لیا تو کمرے کی مدھم روشنی خوف وہراس سے ہڑبڑاتے ہوئے فرش سے چھت کی طرف طرف چڑھنے لگی۔

''اب تو سمے آدھی رات سے بھی بہت اوپر ہو لیا ہے۔دروازہ بند کر آتی ہوں۔''

''نہیں ماں۔''

''کیوں نہیں؟''

اس کی بوڑھی ساس کا لرزاں سایہ اس کے آگے لمبا ہو کر اس کے پاس جا پہنچا۔

''تمہیں معلوم نہیں ماں تمہارا نیک بیٹا آدھی رات کے بعد ہی گھر لوٹتا ہے۔''

''مگر بیٹی...''

''نہیں ماں دروازہ کھلا رہنے دو۔اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ کچھ بھی ہو، اب وہ ساری رات باہر نہیں رہے گا۔''

بات کرتے کرتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''تم اپنے بیٹے کو اتنا بھی نہیں سمجھا سکتیں کہ وقت پر گھر آ جایا کرے۔''

اس کی ساس بھی اس کے پاس ہی بستر پر بیٹھ کر رونے لگی۔تھوڑی دیر دونوں روتی رہیں اور پھر ایک دوسرے کو چپ کرانے کی کوشش میں چپ ہو گئیں اور پھر اس کی ساس کہنے لگی۔

''چلو اٹھو اب کھانا کھا لو۔''

''تم جانتی ہو ماں، اس کے بغیر میں کھانا نہیں کھاؤں گی...جاؤ تم سو جاؤ۔''

بڑھیا نے بڑا گہرا اور ٹھنڈا سانس لیا اور بے بسی سے سر جھلا جھلا کر اٹھی اور اپنے آپ کو گھسیٹنے کے سے انداز میں چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

اپنی ساس کی پشت سے نظر ہٹا کر وہ سوچنے لگی کہ آج وہ لوٹ آئے گا تو وہ ذرا بھی شکایت نہیں کرے گی، بڑے پیار سے اس کے ہاتھ دھلائے گی پھر وہ دونوں کھانے پر بیٹھ جائیں گے۔

اپنے شوہر کے ساتھ ایک ہی تھالی میں کھانا کھاتے ہوئے وہ ہمیشہ اپنی ساری شکایتیں بھول جاتی، کئی بار تو محبت سے اس کا لقمہ بھرا ہاتھ اپنے منہ کی طرف جانے کی بجائے اس کے منہ کی طرف اٹھ جاتا اور اس کا شوہر کھانا بھول کر اس کی طرف اچھل آتا...نہیں پہلے جی بھر کر کھا پی لو، پھر جی بھر کر پیار کریں گے...اسے اپنے چہرے پر ایک اداس سی شادمانی کی آہٹ ہوئی...وہ عورتیں کیسی ہوتی ہوں گی جو مردوں کے گھر لوٹتے ہی انھیں خالی پیٹ پیار کا ناچ نچوانا شروع کر دیتی ہیں۔

بے چارے زیادہ سے زیادہ، دو چار بار ناچ لیں گے۔ساری عمر کا پیار بنائے رکھنا ہو تو جب تک ان کے پیٹ بھر نہ جائیں انھیں موقع ہی نہ دینا چاہئے کہ دل کی بات منہ تک لائیں...میرا مرد بے پروا ضرور ہے مگر پروا کرنے پر آتا ہے تو میرے سوا اسے کچھ سوجھتا ہی نہیں...

شوبھا تم وہ ہرے رنگ کی ساڑی پسند کر آئی تھی نا، آؤ آج جا کر اسے خرید لاتے ہیں...

مگر تمہارے جوتے...؟

...جوتوں کو چھوڑو۔میرے کیچڑ پیروں کا ڈھنپنا ضروری ہے یا تمہارے بدن کی پھبن؟...آؤ...

میں میکے چلی جاتی ہوں تو کسی بات میں اس کا دل نہیں لگتا۔ میرے جانے سے پیشتر تو بڑے مزے سے کہہ دیتا ہے، جاؤ..مگر چلی جاتی ہوں تو حواس کھو بیٹھتا ہے...بیٹی،...اس کی ساس اس کی واپسی پر بتاتی...میں لاکھ کہا کرئی کہ جی بہلانے کے لئے ادھر ادھر ہو آؤ پر تمہارا یہ آدمی دفتر سے سیدھا گھر آجاتا اور رونی شکل بنائے چارپائی پر پڑا رہتا۔

''کیوں جی کیا سن رہی ہوں؟ میں چلی جاتی ہوں تو تم سیدھے گھر آجاتے ہو؟''

''ہاں''

''تو پھر میں سدا اپنے میکے ہی کیوں نہ رہوں؟''

''بات یہ ہے شوبھا کہ جی بہلا بہلا ہو تو آدمی اسے اور بہلاتا ہے، لیکن تم یہاں نہیں ہوتیں تو میرا کسی سے ملنے ملانے کو جی نہیں چاہتا۔''

اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ آج وہ اپنے شوہر سے ذرا بھی نہیں جھگڑے گی...وہ سنے، نہ سنے، اسے بڑے پیار سے سمجھاؤ گی..تمہارے سوا میرا کون ہے رے؟ جب تک تم گھر نہیں لوٹ آتے مجھے اپنے ہونے کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ آجاتے ہو تو مری مری اچانک جی اٹھتی ہوں۔ اچھا ذرا سوچو، تمہاری غیر موجودگی میں مری مری میں سچ مچ مرگئی تو کیا کرو گے؟ تمہارے رونے دھونے سے میں واپس تو نہ آجاؤں گی۔ اوپر والے کا گھر میرا کوئی میکہ نہیں کہ جب چاہوں، لوٹ آؤں، وہاں تمہارے بغیر ہر دم روتی رہوں گی پر میرا لوٹنا نہ ہوگا...وقت پر گھر لوٹ آیا کرو...میری قسم کھاؤ، لوٹ آیا کرو گے۔ ہاں آؤ اب سو جائیں..نہیں، اس وقت ہاتھا پائی مت کرو۔ دیکھو ڈھائی بجنے کو آرہے ہیں۔ اب شریفوں کی طرح چپ کے سے سو جاؤ...آؤ میں تمہیں تھپک تھپک کر سلاتی ہوں۔

بیٹھے بیٹھے بے خیالی میں وہ اپنا سر تھپکانے لگی تھی مگر اس کی بند آنکھیں چاروں پٹ کھلی تھیں۔ بھوک کی شدت محسوس کرتے ہوئے اس نے اپنے آپ سے کہا کہ تھوڑا سا کھا لو..نہیں، ابھی نہیں، اب وہ آیا ہی چاہتا ہے۔

''میں دروازہ بند کر آؤں شوبھا بیٹی؟''

''نہیں''اس نے چیخ کر جواب دیا۔''کیسی ماں ہو ماں؟ جس کا بیٹا ابھی گھر نہ لوٹا ہو، اسے بار بار دروازہ بند کرنے کی کیسے سوجھ سکتی ہے...؟''

اپنے غصے کو دبا کر وہ ملائم لہجے میں بولی۔''میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، بیٹی؟''

''تمہاری ساری دولت تو گھر سے باہر ہے ماں، تمہیں کسی چور وور کا کیا ڈر؟...جاؤ، سو جاؤ۔''

اسے خیال آیا کہ چولہا کہیں بجھ نہ گیا ہو۔ کھانا ٹھنڈا پڑ چکا ہوگا۔ اس کے لوٹنے سے پہلے اسے گرم کر دوں...وہ اپنے آپ ہی چوری چوری یہ بھی سوچ رہی تھی کہ گرم کرتے ہوئے اسے تھوڑا سا چکھ لوں گی تو بھوک ٹل رہے گی..نہیں،

کھانے پر تو اسی وقت بیٹھوں گی جب وہ آجائے گا...وہ رسوئی خانے کی طرف جانے کے لئے اٹھی تو اسے چکر سا آگیا، شاید بھوک اور پیاس اور تھکن سے...اور عین اسی وقت کسی کے باہری دروازے سے آنے کا کھٹکا ہوا...

ہاں، وہی...وہ آگیا ہے؟ اسی کے پیروں کی چاپ ہے...میں نہ کہتی تھی اب آنے ہی والا ہے...اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے وہ کمرے سے باہر آگئی۔

''آگئے۔ دروازہ بند کر کے آؤ، ہاں اندر چلو، جلدی سے منہ ہاتھ دھولو، میں تھالی پروس کر ابھی لاتی ہوں..نہیں، میں نے بھی ابھی نہیں کھایا... ہاں، بابا، بھوک سے مر رہی ہوں پر تمہارے بغیر کیسے کھالیتی؟...ہاں، اندر چلو، ابھی آتی ہوں۔''

وہ رسوئی خانے میں واپس چلی آئی۔ چولہے میں آگ ابھی باقی تھی۔ وہ جلدی جلدی روٹیاں گرم کرنے بیٹھی۔ ٹھنڈے توے کو گرم چولہے پر رکھا اور جونہی چولہے میں تھوڑا اور ایندھن ڈالا، آگ چمکنے لگی اور توا گرم ہونے لگا اور ہوتے ہوتے کافی گرم ہو گیا تو ٹھنڈی روٹیاں بھی باری باری دم پکڑنے لگیں۔

وہ تھالی پروس کر کمرے میں آئی تو اپنے شوہر کو انتظار میں پا کر اس کے پاس آبیٹھی۔

''ارے پانی تو میں بھول آئی۔ جاؤ تم لے آؤ۔''

اس کا شوہر پانی لانے کے لئے اٹھا اور وہ کھانے کی تھالی کا جائزہ لینے لگی۔ بھوک سے اس کا دم الٹ رہا تھا لیکن وہ مسکراتے ہوئے اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کرتی رہی۔

''آؤ بیٹھ جاؤ۔''اپنے شوہر کو پانی کا گلاس لاتے دیکھ کر اس نے کہا۔

اس کا شوہر اس کے ساتھ ہی چوکی پر بیٹھ گیا اور پھر دونوں نے کھانا شروع کرنے کے لئے تھالی کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

''کل تمہاری تنخواہ کا دن ہے نا؟...''

تنخواہ کے دن اس کا شوہر سیدھا گھر آجاتا تھا۔

''تمہارے آنے پر میں تیار ہی بیٹھی ہوں گی۔ ساری چیزوں کی لسٹ بنا کر تیار رکھوں گی تاکہ تمہارے پہنچتے ہی شاپنگ کے لئے نکل جائیں۔ اب کے تمہارے جوتے بھی لے آئیں گے...آہستہ آہستہ کیوں کھا رہے ہو؟...کچھ کھا کے آئے ہو...میری تو جان نکل رہی ہے بھوک سے...لاؤ، وہ نوالہ اپنے ہاتھ سے میرے منہ میں ڈال دو...ہہ ہاہہ..تمہارے ہاتھ سے کھا کے مزہ آجاتا ہے...ہہ ہہ...ہا...''

دروازے پر اس کی بوڑھی ساس حیرت سے گم سم ہو کر اپنی بے خبر بہو کو بھیگی بھیگی آنکھوں سے گھورے جا رہی تھی۔

ہوا یہ تھا کہ آج ہی دوپہر کو ان کے گھر سے اس کے شوہر کی ارتھی اٹھی تھی۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

آ گہی کا سفر

اس عجیب وغریب اشتہار کو میں عرصۂ دراز سے پڑھتی آئی تھی لیکن اس مرتبہ وہ میرے ذہن کے اس گو شے میں اتر پڑا جہاں سے آدمی کو عمل کی ترغیب ملتی ہے اور میں حرکت میں آ گئی۔ اشتہار کے الفاظ میں نیچے درج کئے دیتی ہوں۔ اس تحریر کی ضرورت یوں پیش آئی کہ اشتہار ایک سفر سے متعلق تھا۔ میں نے سوچا مجھ سے قبل قدیم زمانے سے سفر پر نکلنے والوں میں سے اکثریت نے روز نامچے، یادداشتیں ڈائریاں اور سفرنامے قلم بند کئے تھے جن میں سے بعض کی افادیت بعد میں کھل کر سامنے بھی آئی لہٰذا مجھے بھی ایک روز نامچہ تیّار کرنا چاہئے۔ شاید اس کا لکھنا بھی ایک مثبت اقدام ثابت ہو۔ سو یہ ہے میری تحریر کا شانِ نزول۔ پہلے متذکرہ اشتہار جو الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا پر ساری دنیا میں دکھایا جا رہا تھا۔

''آ گہی کے سفر پر جانے کے خواہشمند مسافروں سے درخواست ہے کہ اپنی قریب ترین بندرگاہ یا طیارہ گاہ پر دن اور رات کسی بھی وقت پہنچ جائیں، اپنے لباس پر کسی بھی نمایاں جگہ پر ''آ گہی'' کا لفظ لکھ دیں اور کچھ دیر انتظار فرمائیں ہمارے عملے کے سارے لوگ آپ کے سفر کا سارا انتظام خود ہی انجام دیں گے۔ لفظ ''آ گہی'' کسی بھی زبان میں تحریر کیا جا سکتا ہے۔ اخراجاتِ سفر ہمارے ذمّے۔ اسباب کی ضرورت نہیں۔ دستاویزاتِ سفر آپ کا مسئلہ نہیں۔ آپ کی حفاظت، جملہ ضروریات، کھانا، دیکھ بھال، دوائیاں، ہیلتھ کیئر ہمارے ذمّے۔

منجانب نگراں ''آ گہی'' سفر

میں نے اشتہار کے الفاظ من وعن مطابقِ متن درج کر دیئے ہیں۔ دنیا بھر میں اور شاید دنیا کی ہر زبان میں اس اشتہار کا مضمون یکساں ہے اب آپ یہ نہ پوچھنے بیٹھ جائیں کہ میں نے اس اشتہار کی کوئی تصدیق وغیرہ بھی کی یا نہیں؟ ظاہر ہے مجھ جیسی عورت جس کو ایک دنیا فرنٹ لائن رائٹر کے طور پر جانتی ہے جس نے دنیا کی اعلیٰ ترین جامعات سے اعلیٰ ترین امتحانات، اعلیٰ ترین اعزازات کے ساتھ پاس کئے ہوں اتنی سادہ لوح نہیں ہو سکتی کہ اس اشتہار پر یقین کر لیتی۔ میں نے پہلے پہل اس اشتہار کو دیوانے کی بڑ قرار دے کر اپنے ذہن کی کھڑکی سے باہر

پھینک دیا تھا۔ اس کا سبب صاف تھا دنیا کے کسی بھی ادارے نے اس اشتہار کی اشاعت کی ذمّہ داری قبول نہیں کی تھی۔ میں نے دنیا کے بڑے بڑے معتبر اخباروں کے مدیروں سے لے کر مالکوں تک کو بھی کھڑ کھڑا لیا تھا۔ خود بھی انٹرنیٹ پر اور چند ایک ماہرین انٹرنیٹ کے تعاون سے بھی ''آ گہی'' کے سفر اور اس کے کرتا دھرتا لوگوں کا پتہ چلانے کی کوشش کی تھی مگر بے سود۔ میں نے دنیا کے طاقتور ترین ممالک کے اطلاعاتی وتحقیقاتی اداروں سے بھی رجوع کیا مگر بے نتیجہ۔ اس معاملے کو قومی اور بین الاقوامی سیکیورٹی کا معاملہ بنانے کے بھی ممکنہ جتن کر ڈالے لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔۔۔۔ میں نے یہ سوال بھی اٹھایا کہ اس اشتہار کے مشتہرین پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالا جا رہا ہے۔۔۔؟ اس کے لئے مالی ادائیگیاں کرنے والوں سے پوچھ گچھ کیوں نہیں کی جا رہی ہے۔۔؟ میرے ان آخری سوالات کا جو جواب ملا اس نے مجھے حیران، پریشان، چوکنّا اور لا جواب کر دیا۔

وہ جواب یہ تھا کہ مذکورہ اشتہار آپ ہی آپ نشر ہو رہا ہے اور طبع ہو رہا ہے۔ اس کو روکنے کی بھی ساری تدبیریں بے کار گئی ہیں۔ اس جواب کے ملنے کے بعد میں نے اس اشتہار کے بارے میں سوچنا قطعی چھوڑ دیا۔ اپنے ذہن کو اس خیال سے بہلا دیا تھا کہ اس کے عقب میں کسی عالمی بڑی طاقت کا ہاتھ ہے ورنہ یہ سب ٹیکنالوجی کے طور پر اتنا اعلیٰ، اتنا جدید، اور ظاہری طور پر اتنا حیران کن اور نا قابلِ فہم نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک زمانے میں اُڑن تشتریوں کا مسئلہ سامنے آیا تھا جو بغیر حل ہوئے دب گیا تھا۔ برمودا ٹرائینگل، (برمودا کے مثلث) کا معاملہ بھی زور وشور سے اٹھا اور ڈوب گیا۔ کسی بڑی طاقت کے قبضے میں ایلین کی موجودگی کی افواہوں کا بھی کچھ ایسا ہی حشر ہوا۔ میری طرح اور بھی لوگ ہونگے جو اس اشتہار کو اس مرحلے تک پہنچا کر عاجز آ گئے ہونگے۔ میں بھی عاجز آ چکی تھی، ہار چکی تھی اور بالآخر اس کو بھلا چکی تھی تا آنکہ وہ خود میرے ذہن میں اتر پڑا۔ مجھ کو متحرک کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجوزہ سفر کے لئے آپ ہی آپ میں تیار ہو گئی۔ میری ہر حرکت بلا ارادہ سرزد ہوتی گئی۔ میں نے کسی بھی دوست یا رشتے دار کو اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ میں جانتی تھی سب اپنی اپنی زندگیوں میں مگن مطلبی لوگ تھے جو کسی ذاتی غرض کی بناء پر مجھ سے رجوع ہوتے اور غرض کے پورے ہوتے ہی مجھ میں یا میرے کسی کام میں کیڑے نکال کر مجھ سے کٹ جاتے۔ میں شادی کرنے کی کوشش میں بھی نا کام رہی تھی۔ میں شاید مردوں کی نظر میں ضرورت سے زیادہ پڑھی لکھی اور لکھنے والی کے طور پر غیر معمولی مشہور ومعروف سلیبریٹی تھی اور مردوں کی اکثریت کی نظروں میں سلیبریٹی عورت ''گھر نہیں بنا سکتی۔'' میرا کوئی بوائے فرینڈ بھی نہیں تھا۔ کیونکہ جن دنوں میں ''گرل'' تھی کسی لڑکے کی گرل فرینڈ نہ بن سکی تھی۔ کسی لڑکے کی مجال نہیں ہوئی کہ مجھے اپنی آئس کریم چاٹنے کے لئے پیش کرے۔ رہا کافی یا چائے کی رفاقت تو کوئی لڑکا مجھے اسکی دعوت دینے حماقت کر بیٹھتا تو اس کے دماغ کے سارے طبق روشن ہو جاتے جب وہ دنیا کے کسی بھی موضوع پر میرے آگے زبان کھولتا۔ جب میں گھر سے نکلنے کو تھی تو میرا بہت دل چاہ رہا تھا کہ میرا کوئی ہوتا جس کے نام پیغام چھوڑتی۔ تاہم رسم پوری کرنے کے لئے میں

نے میز پر رکھے ہوئے کیلینڈر کے ایک گوشے پر لکھا۔ ''ہیلو ڈیئر۔۔۔میں آ گہی کے سفر پر جا رہی ہوں، مجھے اچھے سفر کے لئے ''وش'' کرو۔تمہاری جو بھی تم سمجھو۔۔'' اپنے جیکٹ کے کالر پر'' آ گہی'' کا ٹیگ لگایا اور ایک چھوٹے سے ہینڈ کیری کو گھسیٹتی ہوئی باہر نکل پڑی۔قریبی ایئر پورٹ پر گاڑی پارک کی اور انتظار گاہ میں داخل ہو گئی۔میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب میں نے دیکھا کہ ادھر میں انتظار گاہ میں داخل ہوئی اُدھر ایک سرو قد ایئر ہوسٹس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا،مسکرائی اور'' آ گہی'' کا ٹیگ میرے کالر سے جدا کیا اور ایک نیلے رنگ کی فائل میں ڈال دیا۔اپنے ساتھ آنے کا ہلکا سا اشارہ کیا۔میرے ساتھ اس ہینڈ کیری کے علاوہ کوئی اور اسباب نہیں تھا جس کو پارک کرنے کے وقت گاڑی سے باہر نکال لیا تھا۔ایئر پورٹ پر مختلف مقامات پر الگ الگ جانے والی ایئر لائنوں کے مسافروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ مذکورہ ایئر ہوسٹس کے عقب میں قطاروں سے بے نیاز میں آگے بڑھتی گئی۔ وہ ایک دروازے کے سامنے جا کر ادب سے ایک طرف ہو کر کھڑی ہوئی۔میں نے پہلی بار اس کے چہرے پر کھل کر نظر ڈالی یا شاید اس نے مجھے ایسا کرنے دیا۔اس کا چہرہ روشنی سے بنا تھا اس سے آنکھیں ملانے کی مجھے ہمت نہیں ہوئی۔اس کی آواز جو مجھے بے حد دلکش اور پُر اعتماد لگی میرے کانوں میں اتری۔وہ کہنے لگی'' آگے کا دروازہ کھولو، جہاز کا زینہ چڑھو،ایک انتہائی اہم اور دلچسپ سفر تمہارا منتظر ہے۔۔یہ رہا تمہارا بورڈنگ کارڈ۔''ایئر ہوسٹس کے ہاتھ نے میری جانب کارڈ بڑھایا۔میں نے کارڈ تھاما، دروازہ کھولا اور ہینڈ کیری گھسیٹتی ہوئی اندر چلی گئی۔بائی بائی۔۔ایئر ہوسٹس کی آواز مجھے باہر سے اندر آتی ہوئی معلوم ہوئی۔میں نے سوچا یہ عجیب سفر ہے نہ قطاریں لگیں، نہ کلیئرنس کروایا بس جہاز کے اندر ہو گئے۔یہ کیسی فضائی کمپنی تھی کہ انتظار گاہ میں داخل ہوتے ہی فضائی میزبان خدمت میں حاضر۔ایسا تو صرف وی۔وی آئی۔پی (بہت زیادہ اہم) کے ساتھ ہوتا ہوگا۔

جہاز کے اندر سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا ہوا کرتا ہے۔ایک انتہائی خوبصورت فضائی میزبان نے مجھ سے بورڈنگ کارڈ طلب کیا۔نصف حصہ خود رکھا اور نصف مجھے لوٹا دیا۔اور انتہائی خوش اخلاقی سے، مجھ سے آگے چلتے ہوئے میری نشست کی نشاندہی کی۔میری ہینڈ کیری کو میری نشست کے نیچے رکھا۔اور اس سے پہلے کہ میں اپنی نشست پر اپنے آپ کو جماتی وہ جہاز کی فضا میں تحلیل ہو گئی۔بیٹھنے کے ساتھ ہی میں نے اپنے پڑوس میں بیٹھے ہوئے مسافر پر ایک چور نظر ڈالی مبادا وہ میرے اس تجسس کو ناشائستگی سے تعبیر کرے لیکن نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا میرے ساتھ کی نشست پر بیٹھا ہوا مسافر جو ادھیڑ عمر کا ایشیائی دکھائی دے رہا تھا۔وہاں موجود ہونے کے باوجود غیر موجود تھا میں نے اس کو 'ہائی ، ہیلو' کہنا چاہا تا کہ اس کو پتہ چلے کہ اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھنے والی عورت کوئی مہذب خاتون ہے۔لیکن یہ کیا میری زبان پر دو حرفی اور چار حرفی لفظ بھی نہ آ سکے۔میں نے بار بار منہ کھولا، ہونٹوں کو حرکت دی، حلق کے عضلات کو تکلمی جنبشیں دیں، زبان کو اٹھایا، بٹھایا، گھمایا، دائیں بائیں ہر طرح کی حرکت دی، پھیلایا، سکیڑا، سمیٹا، گولائی میں لپیٹا، آواز کے خنجرے (ساؤنڈ بکس) پر پوری توانائی صرف

کر دی۔لیکن میرے حلقوم سے کوئی آواز بر آمد نہیں ہوئی اتنی ساری کوششوں میں ناکامی کے باوجود میری ہیلو، ہائی میرے بازو والے آدمی تک پہنچ بھی گئی۔اور اس شریف آدمی کے چہرے پر اس کی رسید اور جواب صاف طور پر تحریر ہو گیا۔خود میرے اندر اس کی جوابی ہیلو، ہائی بھی نازل ہو چکی تھی۔اس شریف آدمی نے محسوس کیا ہو یا نہ کیا ہو، میں نے یہ حیرت ناک حقیقت محسوس کر لی۔اس فضائی میزبان نے مجھ سے جس طرح کلام کیا جس نے ایئر پورٹ سے جہاز کے گیٹ وے تک میری رہبری کی۔اور اب دونوں مسافروں نے جس طرح ہیلو، ہائی کیا۔اس سے مجھ پر واضح ہو گیا۔یا میرے مولا۔! یہ بغیر الفاظ کے بات چیت کا انوکھا طریقہ تھا۔اس سے آپ فارسی کی اس شاعرانہ کہاوت کی طرف ذہن کو نہ لے جائیں ؎ خموشی معانی دارد کے در گفتن نمی آید۔کیونکہ یہاں معاملہ بالکل مختلف تھا''اس کو بغیر الفاظ کے بات چیت کہنا درست ہوگا یا اس کے لئے کوئی نئی اصطلاح اختراع کرنا پڑے گی۔۔'' میں نے سوچا''دوسرے آدمی کے خیالات میرے ذہن کے اندر اور میرے خیالات دوسرے آدمی کے ذہن کے اندر ابلاغ یا ترسیل ہو رہے تھے۔الفاظ کی صورت اختیار کئے بنا۔۔'' میں نے اپنے آپ کو باور کرانے کی کوشش کی۔تھوڑی دیر کے لئے سفر کو بھول کر شاید اس الجھن کو سلجھانے میں لگ گئی لیکن جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا۔میں مسافر تھی اور مسافر لمحۂ موجود سے غافل نہیں رہ سکتا۔لمحۂ موجود کے مطابق میں جہاز کے اندر تھی۔ جہاز کا اندرون بظاہر تو عام جہازوں جیسا تھا لیکن مجھے بدلا بدلا سا لگا۔مثال کے طور پر اس احساس کو کیا کروں مجھے فضائی میزبان نظر نہیں آئی لیکن یہ کیا ادھر میں نے سوچا اور اُدھر فضائی میزبان ایک ٹرالی دھکیلتے ہوئے میرے عین داہنے بازو آ موجود ہوئی اور بولی''جوس، سافٹ ڈرنک، پانی''۔

''کافی ملے گی۔۔؟''میں نے اس سے سوال کیا۔

''ایک لحظہ انتظار کیجئے براہِ کرم''اس نے انتہائی ادب سے کہا اور آگے بڑھ گئی۔پلک جھپکتے ہی ایک اور میزبان (اس دفعہ مرد) کافی، چائے، اور دیگر گرم مشروبات کی ٹرالی کے ساتھ حاضر ہو گیا۔میں نے کالی کافی طلب کی جو مجھ دے دی گئی۔میرے ساتھ بیٹھے ہوئے مسافر نے کسی نا معلوم زبان میں کوئی عجیب سا گرم شروب مانگ لیا جس کے بخارات سے میری اپنی ایک پسندیدہ خوشبو''شرارت''(Mischief) کی مہک آ رہی تھی۔مجھے بے حد اچھا لگا۔ اچانک سب کچھ معمول کے مطابق ہونے لگا کپتان کی جانب سے بھی کچھ نشر ہوا۔فضائی میزبانوں نے کچھ ہدایات دیں۔ٹی وی اسکرین بھی روشن ہوئے اور مسافروں نے اپنے من پسند پروگرام سننے کے لئے کانوں پر ہیڈ فون چڑھا لئے لیکن جہاں تک ابلاغ کا معاملہ ہے اس کا کوئی ثبوت نہ ملا۔یا تو خیالات بغیر الفاظ کا جامہ پہنے ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں منتقل ہو رہے تھے یا پھر لفظ اگر تھے تو ان کی نوعیت بدلی ہوئی تھی۔بے جسم لفظ۔مجرّد لفظ۔

''کیا واقعی میں آ گہی کا سفر کر رہی ہوں''۔میں نے اس سے پہلے نہ تو اس طرح سوچا تھا اور نہ ہی اپنے

آپ کو سمجھایا تھا۔ میرا ذہن روشن ہو رہا تھا۔ میری فکر کے تاریک گوشوں پر روشنی کی کرنیں سی پڑنے لگی تھیں۔ جہاز پر ابلاغ کی صورت جو مشاہدے میں آ رہی تھی اس نے مجھے اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس عقیدے کو یقین اور ایمان کی حد تک سمجھنے کے قابل بنا دیا کہ ''اللہ جو سوچتا ہے وہ ہو جاتا ہے''۔ وہ اشبدھ ہے اسے لفظوں کی احتیاج نہیں۔ لفظ وقت کے ساتھ بدلتے ہیں۔ وقت کے زیرِ اثر ہیں۔ اللہ وقت کے زیرِ اثر نہیں۔ اس سے قبل میری سوچ فقرے پر رکی ہوئی تھی۔ ''سب سے پہلے لفظ تھا'' (Before every thing, there was word) اس طرح سوچتے سوچتے میں اپنی سوچوں کے لئے بھٹکتی پھری۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ جہاز پر کھانا دیا بھی گیا کہ نہیں۔ دھندلی دھندلی یاد میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کھانے کی ٹرالی والی سے ازراہِ مذاق ایسی ڈش مانگی جو ہوائی جہازوں میں مہیا نہیں کی جاتی لیکن اس نے مہیا کر دی اور میں دل ہی دل میں جھینپ کر رہ گئی۔ آخر کار کپتان کی جانب سے یہ اعلان القا ہوا کہ ''ہمارا جہاز اپنی منزلِ مقصود ''آ گہی'' کی طیران گاہ پر اترنے والا ہے۔ مبارک ہو'' چند لحظوں کے بعد جہاز نے ٹیکسی کی اور میں دوسرے مسافروں کے ساتھ اپنی ہینڈ کیری گھسیٹتی ہوئی زینے کے قریب کھڑے ہوئے جہاز کے کپتان اور عملے والوں کی مسکراہٹوں کے جواب میں اپنے دانت دکھاتے ہوئے جہاز کے زینے سے نیچے اتر گئی چند قدم کے فاصلے پر ایک لابی (غلام گردش) دکھائی دے رہی تھی۔ ہم سب اس پر پہنچ گئے ہم نے دیکھا کہ دوسری جانب ایک انتہائی خوبصورت اور خاصی لمبی گاڑی کھڑی تھی۔ ہم مسافر اس گاڑی میں سوار ہوئے۔ ایسی گاڑی کسی نے کہاں دیکھی ہوگی۔ مسافروں نے جہاز میں تو ایک دوسرے سے بات کرنے سے پرہیز کیا تھا شاید ہر کوئی اس عجیب و غریب مہم کے زیرِ اثر گنگ ہو گیا ہوگا لیکن اس گاڑی کے اندرون کو دیکھ کر سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور سب ہی ستائشی کلمات کے تبادلے میں لگ گئے۔ یہ بتانا اب شاید غیر ضروری ہو گیا ہوگا کہ بظاہر بات چیت ہو رہی تھی لیکن حقیقت میں غیر لفظی ابلاغ سے کام لیا جا رہا تھا ''یہ بھی تو ممکن ہے ہمارا کھانا، پینا، جہاز، ایئر پورٹ، بس، فضائی میزبان، کپتان، عملہ، سفر، ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ اور ہو'' کسی برقی جھماکے کے طور پر سوچ کا یہ رخ میرے ذہن میں اچانک وارد ہو گیا جس کو جھٹک کر باہر نکال پھینکنا مجھے بہت مشکل ہوا تا آنکہ ہم ''آ گہی'' کے مرکزی دفتر ''Base'' پر اتار دیئے گئے۔

مرکزی دفتر یا 'بیس' کی عمارت نہ تو سنگ و خشت سے تعمیر شدہ تھی اور نہ ہی چوبی تھی۔ یہ قیاس کرنا ممکن نہیں کہ اس بیضوی عمارت اور اس کے پہلو میں بنا ہوا ٹاور، لاٹ یا مینار کسی تعمیری مواد سے تشکیل دیا گیا تھا۔ یوں بھی وہ بڑا سا خوبصورت انڈا اور مینار تعمیر شدہ نہیں لگتے تھے۔ صاف طور پر ظاہر ہوتا تھا کہ ان میں سے کچھ بھی تعمیر شدہ نہ تھا۔ بلکہ تخلیق شدہ تھا۔ اس علاقے میں جہاں میں پہنچائی گئی تھی جو کچھ تھا محض خیال تھا۔ احساس تھا یا خیال اور احساس کا آمیزہ۔ جو سوچا گیا اور سوچ سے خلق ہو گیا، عین اسی طرح جس طرح زمین، چاند، ثوابت و سیار اور نظامِ شمسی خلق ہوئے سوچ سے۔ سوچ چودھویں کی طرح ہے اور تسلسل کے ساتھ ایک کے بعد ایک

کہکشاؤں کے سلسلے خلق کرتی جا رہی ہے۔

''آ گہی'' کے مرکز اور مینار کی درمیانی جگہ ایک چھوٹے سے لان کی صورت میں تھی جس کے کنارے پھولوں کے قطعات تھے۔ لان میں جو گھاس کا فرش تھا وہ حقیقی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایک دبیز قالین تھا جس نے میرے پورے وجود کو اپنے آغوش میں سمیٹ لیا۔ کنارے پھولوں پر نظر پڑی تو جسم، ذہن، دل اور روح، خوشبو اور رنگ میں نہا گئے۔ ''آ گہی'' کے داخلی دروازے پر چمکدار حرفوں سے لکھا ہوا ایک بورڈ آویزاں تھا۔

''بابِ آ گہی میں داخل ہونے والوں کی واپسی کی ضمانت نہیں دی جائیگی۔ واپسی کا معاملہ انتظامیہ کے حتمی فیصلے سے مشروط ہوگا جن مسافروں کو داخل ہونا منظور نہ ہو وہ مینار کے نیچے والی لابی میں تشریف لے جا سکتے ہیں۔ ان کی واپسی کا انتظام فوری طور پر ممکن ہے۔'' مسافر اس تحریر کو پڑھ کر حیران ہو رہے تھے۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ بورڈ ایک ہی تھا لیکن اس کی تحریر ہر پڑھنے والے کو اس کی اپنی زبان میں لکھی نظر آ رہی تھی۔ مسافر تحریر پڑھ رہے تھے ۔۔۔سوچ رہے تھے ۔۔۔دو دلے ہو رہے تھے ۔۔۔کسی فیصلے پر پہنچنا کسی بھی مسافر کے لئے آسان نہ تھا۔ مسافروں میں ہر مسافر اپنے انداز میں ردِ عمل کا اظہار بھی کر رہا تھا۔ زیادہ لوگ بے چین بے چین ٹہل رہے تھے ۔کچھ لان پر سر پکڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ کچھ وقت اس طرح گزرا پھر فیصلے سامنے آنے لگے۔ بیشتر مسافروں نے مینار کا رخ کیا اور بہت کم باب آ گہی کے نیچے جمع ہوئے۔ اور ایک ایک کر کے اس کے اندر داخل ہو گئے۔ ان داخل ہونے والوں میں سب سے آخری مسافر میں تھی جس نے سب سے آخر میں یہ فیصلہ کیا۔۔۔ میں نے سوچا۔ ''آ گاہ ہو کر واپس نہ بھی ہوئی تو کون سا فرق پڑ جائیگا۔ دنیا تو اب بھی چل رہی ہے تب بھی چلتی رہے گی۔''

جوگندر پال کا افسانچہ

جیون کھیل تماشہ

''میں سپنوں میں بہتر دِکھتا ہوں۔''

''مگر اس وقت تو آپ ہو بہو میرے سامنے موجود ہیں۔''

''کیا سپنے میں بھی سب کچھ ہو بہو نہیں ہوتا؟''

''مگر پھر آنکھ کھلتے ہی سب کچھ ایک دَم مٹی کیسے ہو جاتا ہے؟''

''ہاں بابا، جیسے آنکھ لگتے ہی ہم۔۔۔''

انور زاہدی (اسلام آباد)

علم غیب

ٹی روم میں چائے پینے کے دوران ایک بحث چل پڑی تھی۔۔۔۔۔۔کچھ ڈاکٹر علم غیب کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ اپنے دلائل پیش کر رہے تھے۔۔۔ڈاکٹر شاہد کا کہنا تھا کہ اُن کے تجربے میں ایسے کئی لوگ آئے ہیں جنہوں نے مستقبل میں ہونے والے واقعات کے بارے میں بہت پہلے جو کچھ کبھی کہا۔۔۔وہ سو فیصد ویسا ہی نکلا۔ ''اور جن لوگوں کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ کوئی پیشہ ور نجومی یا ایسے کسی قبیل سے نہیں تھے۔۔۔''

ٹی روم کے کونے سے کسی نوجوان ڈاکٹر نے نعرہ لگایا۔۔۔

''یعنی شوقیہ فنکار تھے۔۔۔''

اس پر ٹی روم میں جیسے قہقہوں کے گرینیڈ پھٹ پڑے۔۔۔

جس پر فوراً ہی۔۔۔ڈاکٹر شاہد نے اپنی بات کا دفاع کرتے ہوئے جذباتی انداز میں کہا۔۔۔

''برخوردار۔۔۔ابھی تو آپ نے عملی دنیا میں قدم رکھا ہے۔۔ذرا وقت گزرنے دیجئے۔خود معلوم ہو جائے گا۔۔۔فن کاری اور شوقیہ فن کار میں کیا فرق ہوتا ہے''

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے۔۔ذہنی امراض کے ماہر ڈاکٹر جمال کہنے لگے

''مثلاً میرے تجربے میں کئی مریض ایسے آئے ہیں۔۔۔جن کے ہاں مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔۔''

''ڈاکٹر صاحب آپ کے مریضوں کے ہاں تو۔۔۔''ڈاکٹر فاروق مزید کچھ کہنا ہی چاہتے تھے۔ کہ ڈاکٹر جمال نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے۔۔ڈاکٹر فاروق کی بات کو کاٹ کر کہا۔۔۔

''کہہ دیں کہ ہم اور ہمارے مریض ہوتے ہی پاگل ہیں۔۔۔۔''

اس پر ڈاکٹر احمد نے نے شعبہ میڈیسن کے ڈاکٹر فاروق کو یہ کہہ کر چپ کرا دیا۔۔۔۔

''ڈاکٹر فاروق۔۔۔آپ بحث ضرور کریں لیکن اپنے سینیرز کا خیال بھی رکھیں۔۔۔۔۔بحث میں عزت وتکریم کے دامن پہ آنچ نہیں آنی چاہیئے۔۔۔''

کچھ ڈاکٹر جن میں سینیر اور جونیئر سب ہی شامل تھے ڈاکٹر جمال کی اس بات سے اتفاق کرتے تھے۔۔۔کہ وہ

واقعی صحیح کہہ رہے ہیں۔۔۔جبکہ کچھ نوجوان ڈاکٹروں کا ٹولہ جیسے ادھار کھائے بیٹھا تھا کہ اُنہوں نے کسی کی بات کو نہیں ماننا۔۔۔ ۔

ڈاکٹر جمال نے ٹی روم سے نکلتے ہوئے قدرے مدھم لہجے میں اپنی بات کے دفاع میں ایک بار پھر کہا۔۔۔

''سائنس جس مضمون کا نام ہے۔۔۔اس کا مطلب ہے کہ ہم طبعی اور فطری دنیا میں رونما ہونے والے تمام مظاہر کا تجربے اور مشاہدے سے مطالعہ کریں۔۔۔اور اس کے نتیجے میں برآمد ہونے والے حقائق کو اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر تسلیم کریں۔۔۔یہی سائنس ہے۔۔۔لیکن جسے آج ہم سائنس کہتے ہیں۔۔۔کسی زمانے میں ایسی باتیں کرنے والوں کو کلیسا نے جادوگر قرار دے کر مار ڈالا تھا۔۔۔یعنی جو آج سائنس ہے اُسے ماضی میں محض جادو اور علم غیب سمجھا جاتا تھا۔۔۔کوپرنیکس مرتے دم تک اپنے نظریات کا برملا اظہار نہ کر سکا ۔۔۔ گلیلیو کو اپنے نظریات کے اظہار پر عمر قید میں رہنا پڑا اور ان سے قبل نجانے کتنے ہی سائنس دانوں کو اپنے نظریات کے حق میں زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے ہونگے۔۔۔میری دانست میں آج کے نو واردان بساط۔۔۔میری مراد آپ ینگ ڈاکٹروں سے ہے۔۔۔آپ کا رویہ بھی عہد ماضی کے کلیسا کے پادریوں سے کسی طور کم نہیں۔۔۔''۔۔۔ڈاکٹر جمال یہ کہتے ہوئے ٹی روم سے باہر چلے گئے۔۔۔میڈیکل سپرنٹنڈنٹ نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے نوجوان ڈاکٹروں کو صبر اور تحمل کی تلقین کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔

''دیکھیں ہم ٹی روم میں محض چائے پینے نہیں آتے۔۔۔یہ تو ہم سب اپنے اپنے دفتروں میں بھی پی سکتے ہیں۔ یہاں آنے کا بڑا مقصد ایک دوسرے سے ملنا۔۔۔۔ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنا اور خوش وقت ہونا ہوتا ہے۔۔۔۔۔جسے انگریزی زبان میں سوشلائز کرنا کہتے ہیں۔۔۔گر آپ کسی کے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے تو کیا یہ ضروری ہے کہ اُسے یہ جتایا بھی جائے۔۔۔جبکہ آپ کسی کی رائے سے اتفاق نہ کرنے کا اظہار محض خاموش رہ کر بھی کر سکتے ہیں۔۔۔۔اور یاد رکھیئے کہ جب آپ شدومد سے کسی کی بات کی نفی کرتے ہیں تو آپ کا رویہ اُس وقت رجعت پسندانہ ہو جاتا ہے۔۔۔۔ترقی تو آگے بڑھنے کا نام ہے۔۔۔۔۔۔کسی ایک بات پر رُکے رہنے کو ترقی کا نام ہرگز نہیں دیا جا سکتا ۔۔۔۔''

میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر وارثی کے بات ختم کرنے پر ٹی روم میں سناٹے کا عالم طاری تھا۔۔۔بس ائیر کنڈیشنر کی آواز گونج رہی تھی۔۔۔ڈاکٹر فاروق جو کچھ دیر پہلے بحث کے دوران ہائی بلڈ پریشر کے مریض نظر آتے تھے۔۔شرمندگی کے باعث پیلے پڑے ہوئے تھے۔۔ٹی روم آج سے پہلے سگرٹوں کے دھوئیں کے باوجود شاید اتنا کثیف اور بوجھل محسوس نہ ہوا تھا جتنا آج اس بحث میں شامل ہونے والی کدورت کے باعث لگ رہا تھا۔

میں بھی خاموشی سے اُٹھ کر او پی ڈی چلا گیا اور کچھ دیر بعد وہاں سے اُٹھ کر ڈاکٹر جمال کے دفتر میں جا پہنچا۔۔۔ڈاکٹر جمال بے حد مرنجا مرنج قسم کے انسان تھے میرے پرانے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ میڈیکل کالج کے زمانے ساتھی بھی تھے۔۔۔۔مجھے دیکھ کر مسکرائے۔۔۔۔وہ اس وقت کسی فائل کو پڑھ رہے تھے۔۔۔

''آئیں ڈاکٹر شاکر۔۔۔۔دیکھا آپ نے آج کے میدان کارزار کو۔۔۔''

''ڈاکٹر جمال ۔۔۔نفسیات تو آپ کا میدان ہے اور آپ جانتے ہی ہیں ۔۔۔نوجوانی کی عمر کے اپنے کمپلیکس ہوتے ہیں۔ویسے آپ کے ٹی روم سے جانے کے بعد ایم ایس ڈاکٹر وارثی نے اس سارے سلسلے پر خاصے افسوس کا اظہار کیا تھا۔لگتا ہے جیسے ڈاکٹر فارق کو اس بات کا احساس ہے اور وہ اپنے کئے پر خاصے شرمندہ ہیں۔۔۔''

''نہیں بھئی اس میں نہ شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت ہے۔۔۔اور نہ اس شدومد سے بحث کرنے کا کوئی تک تھا۔۔۔اس سے پہلے تو ڈاکٹر فاروق نے کبھی ایسے رویئے کا اظہار نہیں کیا تھا۔۔۔۔اب کسے معلوم ہے۔۔۔کہ اُن کے ساتھ اس سے پہلے کیا واقعہ ہو چکا ہے۔۔۔؟۔میں تو چاہتا ہوں کہ اُن سے مل کر بات کو ختم کیا جائے۔۔۔''ڈاکٹر جمال نے میری بات کے جواب میں کہا۔

''ڈاکٹر جمال میں سمجھتا ہوں کہ لوگوں میں ایک دوسرے کے لئے برداشت کا مادہ کم ہوتا جا رہا ہے۔اور لوگ باگ اب اپنے خیالات میں پہلے سے کہیں زیادہ متشدد رویوں کا اظہار کرنے پر کسی قسم کا افسوس کرنے کے بجائے فخر محسوس کرتے ہیں۔۔۔''

''ڈاکٹر شاکر اسے آپ ہمارے ہاں گزشتہ برسوں کے نتیجے میں ہونے والی آمرانہ سیاست کی دین سمجھیں۔میں خود ڈاکٹر فاروق کے بارے میں حیران ہوں کہ اُنہوں نے کیوں اس قدر جذباتیت کا اظہار کیا۔''

ابھی ہم یہیں تک بات کر پائے تھے کہ ڈاکٹر جمال کے دفتر کا دروازہ کھلا اور ڈاکٹر فاروق کمرے میں داخل ہوئے۔ میں نے اور ڈاکٹر جمال نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ادھر ڈاکٹر فاروق نے ڈاکٹر جمال کی طرف پہنچتے ہوئے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھا کر کہا:''ڈاکٹر جمال! میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔مجھے افسوس ہے کہ آپ کو میری وجہ سے تکلیف پہنچی۔۔۔''

ڈاکٹر جمال ڈاکٹر فاروق سے ہاتھ ملاتے ہوئے کھڑے ہو گئے اور اُن سے بغل گیر ہو کر کہنے لگے۔

''مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے کہ آپ آ گئے۔۔۔ہم دونوں ابھی یہی بات کر رہے تھے کہ کس طرح اس معاملے کو ٹھیک کیا جائے۔۔۔''

''ڈاکٹر جمال۔۔۔دراصل میری بات تو ابھی پوری بھی نہ ہونے پائی تھی۔۔۔کہ آپ نے اُس کا مطلب کچھ اور نکال لیا۔۔۔جبکہ درحقیقت میں تو خود گزشتہ ایک ماہ سے اسی علم غیب کے مسلئے کا شکار ہوں۔۔۔''

ڈاکٹر فاروق نے جواب میں کہا۔۔۔

ڈاکٹر جمال نے ایک بار پھر میری جانب دیکھتے ہوئے ڈاکٹر فاروق سے سوال کیا۔۔۔۔

''میں کچھ سمجھا نہیں حالانکہ آپ نے اُس وقت تو یہی کہا تھا کہ آپ کے مریضوں کے ہاں تو۔۔۔''

''جی بالکل میں بس یہی کہہ پایا تھا۔۔۔حالانکہ میرا مطلب یہی تھا کہ آپ کے ہاں تو اس وضع کے تجربات آئے دن رونما ہوتے ہونگے۔۔۔میرا مطلب آپ کے ہاں آنے والے مریضوں سے تھا۔۔۔ڈاکٹر جمال آپ واقعی اس قسم کے واقعات کے بارے میں کچھ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ کس حد تک درست ہیں۔۔۔؟

اور کیا علم غیب۔۔درحقیقت آج کی سائنسی دنیا میں کوئی جواز رکھتا ہے۔۔۔؟ یا اسے ہم پرانے مخفی علوم کی دنیا سے متعلق سمجھیں۔۔۔؟''

''دیکھیں۔۔ڈاکٹر فاروق ہم سب ڈاکٹر ہوتے ہوئے سائنس کی دنیا سے متعلق ہیں۔۔۔اور جو کچھ بھی ہم روزمرہ دیکھتے ہیں۔۔۔میرا مطلب اپنے مریضوں کی دنیا سے ہے۔۔۔چاہے وہ نفسیاتی مریض ہوں یا ذہنی امراض میں گرفتار۔۔اور یا پھر سیدھے سادھے میڈیسن یا سرجری کی دنیا سے متعلق روزمرہ کی عام بیماریوں کے شکار۔۔۔کیا اُن مریضوں میں سے ہسپتال آنے والے کسی بھی مریض کے بارے میں آپ پوری قطعیت کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کون سا مریض مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے گا۔۔۔؟ اور کس مریض کا قطعی پروگنوسس کیا ہوگا۔۔۔؟ کیا آپ کے تجربات میں ایسا نہیں ہوا کہ آپ جس مریض کے بارے میں مطمئن تھے کہ یہ صحت یاب ہو جائے گا۔۔۔وہ اچانک ایک دن کے قیام ہسپتال کے بعد گھر جانے کے بجائے راہی ملک عدم ہوا۔۔۔۔جبکہ ایک اور مریض جس کے لواحقین تک سے کنسلٹنٹ یہ کہہ چکے تھے کہ اب آپ انہیں گھر لے جائیں۔۔کہ آخری ایام میں ایسے مریض کو اپنے عزیزوں میں رہنے سے سکون ملتا ہے۔۔۔۔ وہی مریض اگلے ہی دن سے بہتر ہونا شروع ہو گیا اور چند روز بعد وارڈ میں مٹھائی تقسیم کرتا ہوا ہنسی خوشی اپنے گھر چلا گیا۔۔۔اب یہ کہ اُس مریض نے کتنی عمر پائی۔۔۔یہ ایک الگ بات ہے لیکن ایسا ہوتا ہے اور ہوا ہے۔۔۔ہم باوجود سائنسی شواہد کے بہت سی باتوں کے بارے میں اب بھی خاموش ہیں۔۔۔آپ خود کئی مریضوں کے چارٹ پر۔۔۔''پی۔یو۔او''۔۔یعنی۔۔۔۔''پائی ریکسیا آف ان نون اورجین''۔۔تحریر کرتے ہیں جس کا مطلب ہوتا ہے کہ مریض کے بخار میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ معلوم نہیں۔۔۔اور یہ سب ہم مریض کے تمام ضروری معائنوں کے بعد لکھتے ہیں۔۔۔ مجھے بتائیں کیا ایسا نہیں ہے۔۔۔۔؟۔۔۔ڈاکٹر جمال نے اپنی بات کو ختم کرتے ہوئے گہرا سانس لیا اور اپنی کرسی میں ریلیکس کرنے لگے۔۔۔۔۔میں دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''ڈاکٹر جمال۔۔آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔۔۔لیکن وہ جو علم غیب ہے اُس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔۔۔؟''

ڈاکٹر فاروق نے جیسے تھک ہار کے اپنا سوال پھر دہرا دیا۔۔۔

''ڈاکٹر فاروق جہاں تک غیب کے بارے میں علم رکھنے کی بات ہے۔۔۔تو غیب کا علم تو بیشک خدا کی ذات کو ہوتا ہے۔۔۔لیکن ہاں جیسے آپ ڈاکٹر ہونے کی حیثیت سے کسی بھی مریض کا علاج کرتے ہوئے اُس کی بہتری کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔۔۔جبکہ شفا من جانب اللہ ہی ہوتی ہے۔بس ایسے ہی کچھ لوگوں کو قدرت یہ صلاحیت بھی دیتی ہے کہ وہ مستقبل کے بارے میں پیش بینی کر سکیں۔۔۔ جسے ہم پریمونیشن [Premonition] بھی کہتے ہیں۔۔۔۔خیال رہے کہ اس پریمونیشن کی کوئی منطقی بنیاد نہیں ہوتی۔۔''

جیسے میں اپنی بات کے حوالے سے آج ٹی روم میں کہنا چاہ رہا تھا کہ بہت سے نفسیاتی مریضوں کے ہاں خواب میں مستقبل کے بارے میں اشارے ملتے ہیں۔۔۔جو بہت سی حالتوں میں کم و بیش درست ثابت ہوتے ہیں

۔۔۔شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے۔۔ جولیئس سیزر میں یہی پریمونیشن جولیئس سیزر کی بیوی کو خواب کی صورت میں نظر آتی ہے اور وہ پریشان ہو کر اپنے شوہر یعنی روم کے مطلق العنان حکمران جولیئس سیزر سے کہتی ہے کہ وہ آج سینیٹ میں نہ جائے۔۔اُس نے ایک بہت برا خواب دیکھا ہے۔۔۔لیکن جولیئس سیزر اپنی بیوی کی بات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا اور اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق سینیٹ میں پہنچ جاتا ہے۔۔۔اور اُسی دن جولیئس سیزر کو سینیٹ میں قتل کر دیا جاتا ہے۔۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ڈاکٹر شاہد کی بات کی تصدیق کر رہے ہیں۔۔''ڈاکٹر فاروق نے کہا

''میں تصدیق نہیں کر رہا۔۔۔بلکہ آپ کو اپنے تجربات کی بنا پہ یہ بتا رہا ہوں کہ درحقیقت کچھ لوگوں کے ہاں یہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔۔۔کہ وہ آپ کے مستقبل کے بارے میں یا آنے والے کل کو کیا ہونے والا ہے کچھ باتیں بتا سکیں۔۔۔ایک واقعہ میرے سامنے کا ہے جسے آج بھی دہراتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں۔۔۔دس برس پہلے کی بات ہے۔۔۔میں کراچی میں اپنے ایک عزیز کے ہاں گیا ہوا تھا۔ایک دن اُن کے لان میں ہم سب بیٹھے ہوئے شام کی چائے پی رہے تھے۔۔وہیں ایک صاحب بیٹھے تھے جن کے بارے میں بعد میں پتہ چلا کہ وہ دست شناسی کے ماہر ہیں۔۔۔جن سے اُس وقت کچھ علم فلکیات اور دست شناسی کے بارے میں اسی قسم کی گفتگو ہو رہی تھی۔۔۔وہ سگرٹ پیتے ہوئے اپنے تجربات ہمیں سنا رہے تھے۔۔۔اور ہم سب ہمہ تن گوش اُن کی باتوں کو شوق سے سُن رہے تھے۔۔۔کہ اتنے میں ایک گیند باہر سے لان میں آ کر گری۔۔۔کچھ دیر بعد۔۔۔ایک سات آٹھ برس کا بچہ بھاگتا ہوا اندر آیا اور کہنے لگا۔۔''

''انکل میری بال اندر آ گئی ہے۔۔۔''

''ہاں بیٹے یہ لو۔۔۔یہی ہے نا تمہاری بال۔۔۔ماہر دست شناس نے گیند کو بچے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔۔۔''

اور جیسے ہی بچے نے اپنی بال لینے کو اپنا ہاتھ بڑھایا۔۔۔اُنہوں نے اُس بچے کو اس کی گیند تھما دی۔۔۔۔بچہ گیند لے کر تھینک یو انکل کہتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا لیکن ماہر دست شناس کی حالت دیدنی تھی۔۔۔اُن کے چہرے کا رنگ ایسا فق تھا۔۔جیسے اچانک اُنہوں نے کوئی بھیانک خواب دیکھ لیا ہو۔۔۔

میرے عزیز فوراً اپنے دوست کی طرف لپکے۔۔۔میں نے آگے بڑھ کر اُن کی نبض دیکھی اور اُنہیں پانی کا گلاس دیتے ہوئے پینے کا مشورہ دیا

''بیگ صاحب۔۔۔خیریت ہے آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔۔۔؟''

اُن کے مُنہ سے بس یہ نکلا۔۔۔''یہ بچہ کس کا ہے۔۔۔؟''

''بیگ صاحب۔۔میں نے اسے پہلے یہاں نہیں دیکھا۔۔ممکن ہے سامنے کسی گھر میں آئے ہوئے مہمانوں میں سے ہو۔۔کیوں کیا بات ہے۔۔؟''

''رؤف صاحب۔۔۔اس بچے کے ہاتھ میں لائف لائن نہیں تھی۔۔۔''

''جی کیا مطلب آپ کا۔۔۔میں سمجھا نہیں۔۔۔۔؟''

''جب میں نے بچے کو اُس کی گیند تھمائی اور اُس نے گیند لینے کے لئے اپنا ہاتھ کھولا۔۔۔تو میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ اُس کے ہاتھ میں زندگی کی لکیر نہیں تھی۔۔۔''

ہم سب ہی یہ سن کر ایک عجیب سی کیفیت کا شکار تھے۔۔۔جیسے ہمارے سامنے موجود راستہ کہیں دھند میں کھو گیا تھا اور خود بیگ صاحب اس بات کے بعد پریشانی کے عالم میں اُٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔اندھیرا ہو رہا تھا۔۔ہم سب لان سے اٹھ کر اندر لاؤنج میں چلے گئے۔مغرب کا وقت تھا کہ باہر سڑک پر کسی تیز رفتار گاڑی کی بریکیں لگنے کی چیختی ہوئی آواز آئی۔خدا خیر!۔میں اور میرے عزیز رؤف دونوں ہی بھاگتے ہوئے باہر سڑک پر پہنچے وہاں ایک ہجوم جمع تھا۔کوئی بچہ گاڑی تلے آ گیا تھا۔وہی کار بچے اور اُس کے لواحقین کو لے کر ہسپتال کی طرف چلی گئی جس کے پیچھے کچھ اور لوگ بھی اپنی اپنی گاڑیوں میں اُس کار کے پیچھے روانہ ہو گئے۔رات کے گیارہ بجے یہ خبر ملی کہ ہسپتال پہنچنے کے باوجود بچے کی جان نہ بچائی جا سکی۔بعد میں معلوم ہوا کہ یہ وہی بدنصیب بچہ تھا۔جس کے بارے میں اُس شام چند گھنٹے پہلے بیگ صاحب ہم سب کو یہ بتا کر حیران پریشان کر گئے تھے کہ اس بچے کے ہاتھ میں لائف لائن نہیں تھی۔''

اس بچے کی موت ایک المناک سانحہ تھا۔۔۔۔اور ہم سب اس لئے بھی اس کی موت سے اداس تھے کہ بیگ صاحب کی وساطت سے ہم محض چند گھنٹے قبل یہ جان چکے تھے کہ اُس بچے کے ہاتھ میں لائف لائن نہیں ہے۔۔۔ہمارے علاقے میں ہر گھر اُس بچے کی ناگہانی موت پہ سوگوار تھا۔۔۔ اگلے ہی دن مجھے وہاں سے واپس آنا تھا۔۔ بہت دنوں تک اس واقعے کے پس منظر کے بارے میں سوچتا رہا۔۔۔بیگ صاحب سے پھر دوبارہ ملاقات نہ ہو سکی۔۔۔آج بھی جب کبھی یہ حادثہ یاد آتا ہے تو دماغ سوچ سوچ کر شل ہو جاتا ہے۔۔۔لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔اب آپ بتائیں اسے ہم کیا کہیں گے۔۔۔۔؟۔۔محض ایک اتفاق۔۔یا درحقیقت علم غیب سے کوئی تعلق۔۔۔۔؟''

ڈاکٹر فاروق جواب تک بڑے غور سے ڈاکٹر جمال کو سنے جا رہے تھے ۔۔۔یکدم بول پڑے

''بس کچھ اس سے ملتی جُلتی کیفیت سے آج کل میں گزر رہا ہوں۔۔۔آپ تو جانتے ہیں میری مسز ناہید یہاں گرلز کالج میں ہسٹری کی لیکچرر ہیں۔۔۔ہم دونوں نے مل جل کر ایک چھوٹی سی کار خریدی ہے جس سے میرا ناہید اور دونوں بچوں کے آنے جانے کا مسلئہ حل ہو گیا ہے۔۔۔ہم دونوں اس وجہ سے خاصے مطمئن تھے۔۔۔پہلے میں بچوں کو اُن کے اسکول اتار دیتا ۔۔پھر ناہید کو اُس کے کالج ڈراپ کر کے یہاں ہسپتال آ جاتا تھا۔زندگی پہلے کے مقابلے میں قدرے آسان ہو گئی تھی۔۔۔ورنہ بچوں کے لئے صبح کو پک اپ والے کا انتظار۔۔۔کبھی وقت پر آیا کبھی دیر ہو گئی اور بچوں کو سکول میں دیر سے پہنچنے پر مصیبت الگ۔۔۔اور پھر سکول انتظامیہ کی جانب سے ہماری یعنی والدین سے وضاحتیں الگ۔۔۔۔پھر سکول سے واپسی پر جب تک بچے گھر واپس نہیں آ جاتے یہ تمام عرصہ ایک پریشانی اور بے قراری میں گزرتا تھا۔۔۔''

‘‘تو اب کیا ہو گیا ۔۔۔؟’’ ۔۔۔۔میں نے بیچ ہی میں ڈاکٹر فاروق کی بات کو کاٹتے ہوئے اُن سے پوچھ لیا اور ڈاکٹر فاروق مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے ۔۔۔

‘‘ڈاکٹر شاکر ۔۔بس ہم اس سہولت کو بمشکل کوئی دو ماہ ہی بھر پائے ہونگے کہ جیسے قدرت کو یہ بات اچھی نہیں لگی ۔۔۔ایک روز جب میں نے ناہید کو اُس کے کالج سے لیا تو وہ روز کی طرح خوش خوش آنے کے بجائے کچھ پریشان حال کار میں بیٹھی ۔۔۔میں نے اُس کے میگرین کی تکلیف کو پیش نظر رکھتے ہوئے خیریت معلوم کی ۔۔تو وہ بجھے ہوئے لہجے میں کہنے لگی میگرین نہیں ہے ۔۔۔بہت پوچھا لیکن اُس نے کچھ نہ بتایا ۔۔۔بچوں کو لے کر گھر پہنچے ۔۔۔میں خاصا پریشان تھا کیونکہ یہ ناہید کا انداز نہ تھا ۔۔کھانے کے بعد کئی بار کے پوچھنے پر وہ مجھ سے کہنے لگی ۔۔۔کہ مجھے کار بیچ دینی چاہیئے ۔۔۔میرے بہت پوچھنے پر اُس نے بتایا ۔۔۔

‘‘ہمارے ہاں ایک پروفیسر ہیں جو پڑھاتی انگریزی ادب ہیں لیکن اُن شہرت ایک دست شناس کی ہے ۔۔۔نجانے کیوں کل میں بھی اُن کے پاس اپنا ہاتھ دکھانے پہنچ گئی تھی ۔۔۔میرے ہاتھ کو دیکھ کر وہ اک دم چپ سی ہو گئیں ۔۔۔پھر کہنے لگیں ۔۔۔آپ نے کار خریدی ہے ۔۔۔؟ یہ آپ کی فیملی کو سوٹ نہیں کرے گی بلکہ آپ کے شوہر کی جان کو اس سے خطرے کا امکان ہو سکتا ہے ۔۔۔میرا مشورہ ہے آپ یہ کار فوراََ بیچ دیں ۔’’

‘‘اپنی بیوی کی اس بات کو سُن کر میں ہنسا اور کہنے لگا کہ ظاہر ہے اُنہوں نے تمہیں اپنی نئی کار میں سے اترتے بیٹھتے کئی مرتبہ دیکھا ہوگا ۔۔۔لہٰذا یہ تو اُن کے علم میں ہے ۔۔۔رہ گئی بات کہ یہ ہمیں یا ہماری فیملی کو سوٹ نہیں کرتی ۔۔۔تو تم خود ہی دیکھ لو کہ اس کے آنے سے ہماری مشترکہ مشکلات کس قدر کم ہو گئی ہیں ۔۔۔باقی تم میری طرف سے فکر نہ کرو ۔۔نہ میں تیز رفتار ڈرائیور ہوں نہ اتنا نوجوان کہ کار دیکھ بھال کے نہ چلاؤں ۔۔۔اور ویسے بھی میں دست شناسی اور ستاروں کے علم کو کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتا ۔۔۔اگر تمہیں یاد ہو تو شاید کسی ایسے ہی موقع کے لئے علامہ فرما گئے ہیں ۔

ستارہ کیا میری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں

لیکن میرے بے حد سمجھانے کے باوجود ناہید نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا ۔کئی روز سے کالج نہیں گئی ۔کھانے پینے میں بھی دلچسپی نہیں لے رہی ۔آجکل اُس کی رات کی نیند ڈسٹرب ہے ۔بچے الگ پریشان ہیں اور میری حالت تو آج آپ نے دیکھ ہی لی ہے ۔میں دراصل اسی حوالے سے آپ سے بات کر رہا تھا جب کہ آپ یہ سمجھے کہ میں شاید آپ سے اختلاف کر رہا ہوں ، حالانکہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں میری مدد کریں ۔۔۔’’

ڈاکٹر فاروق کی کہانی سُننے کے بعد ہم تینوں ایسے چپ ہو گئے تھے ۔۔۔جیسے ہم سب کو یہ خوف ہو کہ کہیں باہر کھڑے ہوئے لوگ ہماری بات چیت نہ سن لیں ۔۔۔جبکہ صحیح معنوں میں ڈاکٹر جمال موجودہ صورت حال کے بعد خاصے سنجیدہ ہو گئے تھے ۔۔۔کہ میں بیچ میں بول پڑا

‘‘کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ بھابی کو آپ یہاں ڈاکٹر جمال کے پاس لے آئیں ۔۔۔اور یہ باقاعدہ

طور پر اُن کا نفسیاتی علاج کریں ۔۔۔’’

‘‘میں خود بھی یہی چاہتا ہوں ۔۔۔’’ ڈاکٹر فاروق نے میری تائید کرتے ہوئے کہا

لیکن ڈاکٹر جمال کچھ توقف کے بعد بولے ۔۔۔۔۔

‘‘میرے خیال میں بہتر یہ رہے گا کہ میں اور ڈاکٹر شاکر آج یا کل کسی وقت آپ سے طے کر کے ۔۔آپ کے ہاں ایسے ہی ملنے آ جاتے ہیں ۔۔۔وہاں چائے پیتے ہوئے آپ بھابی کے سامنے یہ ذکر مجھے سنانے کو چھیڑ دیجیئے گا ۔۔باقی میں نمٹ لوں گا ۔۔۔’’

ڈاکٹر فاروق اس مشورے پر خاصے مطمئن نظر آئے ۔۔۔صبح کے واقعے کے بعد سے پہلی بار میں نے اُن کے چہرے کو کسی حد تک پر سکون دیکھا ۔۔۔

اگلے روز ہم ڈاکٹر فاروق سے طے شدہ وقت کے مطابق اُن کے ہاں سوا پانچ بجے پہنچ گئے ۔۔۔اُن کے ڈرائنگ روم میں ہمیں بیٹھے بمشکل پندرہ بیس منٹ ہوئے ہونگے کہ مسز فاروق چائے کے لوازمات ٹرالی میں سجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں ۔۔۔وہ ہمارے لئے چائے بنا رہی تھیں ۔۔۔ادھر میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ دیکھیں اب ڈاکٹر جمال کس طرح اس صورت حال سے نمٹتے ہیں ۔۔۔کہ ڈاکٹر جمال نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے ماہر نفسیات کے انداز میں مسز فاروق کو پہلے تو نئی کار کی مبارک باد دی اور ساتھ ہی اُن کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولے ۔۔۔۔۔

‘‘مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کئی راتوں سے مکمل نیند نہیں لے سکی ہیں ۔۔۔۔’’

ادھر مسز فاروق بس جیسے اسی موقع کی منتظر تھیں ۔۔۔یکدم روتے ہوئے کہنے لگیں ۔۔۔

‘‘بھائی صاحب ! آپ ہی انہیں سمجھائیں ۔میں تو کہہ کہہ کر تھک گئی ہوں کہ یہ اپنی کار بیچ دیں ۔’’

‘‘لیکن ہم تو آج آپ کو دراصل نئی کار کی مبارکباد دینے آئے تھے ۔۔۔اور آپ اسے بیچنے کا کہہ رہی ہیں ۔۔۔خیریت تو ہے ۔۔۔؟’’

‘‘انہوں نے تو آپ کو نہیں بتایا ہوگا ۔۔۔میں بتاتی ہوں ۔۔۔دراصل ہمارے کالج میں ایک پروفیسر سعیدہ ہیں جن کی شہرت دست شناس کی ہے ۔۔

دور و نزدیک کے شہروں سے بھی لوگ اُنہیں اپنا ہاتھ دکھانے آتے ہیں ۔وہ کسی سے اس کا معاوضہ نہیں لیتیں ۔بس اُس دن نجانے میں کیوں اپنا ہاتھ دکھانے اُن کے پاس چلی گئی

‘‘تو اُنہوں نے آپ کے ہاتھ کو دیکھ کر کیا کہہ دیا ۔۔۔؟’’

ڈاکٹر جمال نے انتہائی پر سکون انداز میں چائے پیتے ہوئے مسز فاروق سے پوچھا جیسے وہ اس معاملے کے بارے میں بالکل بے خبر ہوں ۔

‘‘پروفیسر سعیدہ نے میرے ہاتھ کو دیکھ کر کہا تھا ۔۔۔کہ آپ کو نئی کار سوٹ نہیں کرے گی ۔۔۔بلکہ اس سے آپ کے شوہر کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے ۔۔۔’’

یہ کہتے ہوئے وہ ایسے بلک بلک کر رونے لگیں جیسے کوئی چھوٹی سی بچی ہوں۔ڈاکٹر جمال نے اُنہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''گھبرائیے نہیں مجھے بس یہ بتائیں کہ آپ کا ہاتھ دیکھنے والی ذرا قد کی لمبی سانولے رنگ کی گولڈن فریم کی عینک لگائے ہوئے انگریزی کی پروفیسر تو نہیں۔۔۔اگر میں غلط نہیں اور یہ وہی ہیں تو وہ تو میرے علاج میں رہ چکی ہیں۔سنا ہے اچھی استاد ہیں لیکن جب وہ میرے زیرِ علاج تھیں تو اُن کی شخصیت کا یہ جوہر مجھ پر نہیں کھلا تھا۔بہرحال آپ مطمئن رہیں۔جیسا آپ چاہیں گی ویسا ہی ہوجائے گا لیکن کیا آپ مجھے اپنا ہاتھ دکھانا پسند کریں گی؟کسی حد تک دست شناسی سے میں بھی واقف ہوں۔''

ڈاکٹر جمال کی باتوں نے جیسے مسز فاروق پر جادو کر دیا تھا۔وہ اپنا ہاتھ پھیلا کر ڈاکٹر جمال کے پاس بیٹھ گئیں۔ادھر میں اور ڈاکٹر فاروق بھی ڈاکٹر جمال کو غور سے دیکھے جا رہے تھے اور میں مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ دیکھیں اب پردہ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔؟ تب ڈاکٹر جمال نے مسز فاروق کے ہاتھ کو دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے بولنا شروع کیا۔

''مسز فاروق۔۔۔آپ اپنے طالب علموں میں خاصی مقبول ہیں۔۔۔اور ایک اچھے استاد کی شہرت رکھتی ہیں۔۔۔مجھے نہیں معلوم کہ آپ کون سا مضمون پڑھاتی ہیں لیکن پرانے وقتوں کی داستانوں اور واقعات پر آپ کو خاصا عبور حاصل ہے بلکہ شاید تاریخ کے مضمون سے آپ کو خاصی دلچسپی ہے۔۔۔۔یہ کہنا عجیب ہوگا لیکن آپ کا ہاتھ بتا رہا ہے کہ آپ اپنے شوہر کے لئے بہت پزیسو ہیں۔۔۔جبکہ میرے خیال میں ہمارے ہاں ہر محبت کرنے والی بیوی ایسی ہی ہوتی ہے۔۔۔یعنی اس معاملے میں آپ اپنی کار کو بھی اپنے اور اپنے شوہر کے مابین ایک حد فاصل سمجھنے لگی ہیں۔مجھے آپ کے ہاتھ میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آ رہی کہ میں آپ کو کار فروخت کرنے کا مشورہ دوں بلکہ میں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ آج کے بعد ڈاکٹر فاروق کے بجائے کار آپ کے تصرف میں رہے گی۔یعنی آپ فاروق کو ہسپتال چھوڑیں گی اور پھر واپسی میں انہیں اور اپنے بچوں کو پک اپ کرنے کی ذمے داری بھی آپ کی ہوگی یعنی آپ کی کار بھی آپ کے پاس رہے گی اور جس خطرے کی باعث آپ آجکل پریشان ہیں وہ بھی نہیں رہے گا۔۔کہیئے اب آپ کا کیا خیال ہے؟''

لگتا تھا جیسے ڈاکٹر جمال نے منزل مار لی تھی۔مسز فاروق بھی اپنے چہرے سے خاصی پرسکون نظر آ رہی تھیں۔فاروق بھی مطمئن دکھائی دیتے تھے اور مسز فاروق نے جیسے ڈاکٹر جمال کی باتوں سے اتفاق کر لیا تھا۔اس کے بعد ہم کچھ دیر اور ڈاکٹر فاروق کے ہاں بیٹھے اور چائے پینے کے بعد دونوں میاں بیوی کو ایک حد تک آسودہ چھوڑ کر چلے آئے۔

کئی ماہ گزر گئے۔۔اس دوران جب بھی ڈاکٹر فاروق سے ملاقات ہوئی۔۔۔وہ پہلے سے کہیں زیادہ مطمئن نظر آئے۔۔۔ایک دن راستے میں مجھے ملے تو میں نے مسکراتے ہوئے اُن سے خیریت دریافت کی۔۔۔۔اور اُن کی کار کے بارے میں بھی پوچھ بیٹھا۔۔جس پر وہ کہنے لگے۔۔۔

''ڈاکٹر شاکر۔۔ڈاکٹر جمال نے تو میرا معاملہ ہی آسان کر دیا ہے۔۔۔نہ اب مجھے پہلے کی طرح کار ڈرائیو کرنے کی ٹینشن رہی۔۔۔نہ کوئی اور غم۔۔اور پھر ناہید بھی اب کار کی فکر سے بے نیاز ہوگئی ہیں۔۔۔اب وہ خود کار چلاتی ہیں بچوں کو اور مجھے ڈراپ کرتی ہیں۔۔۔اسی طرح واپسی میں مجھے ہسپتال سے لیتے ہوئے بچوں کو اُن کے اسکول سے پک اپ کر کے گھر لے جاتی ہیں۔۔اور بس خوش ہیں۔۔۔۔

''چلیں اس سے بہتر اور کیا بات ہوگی۔۔۔ہم خرمہ و ہم ثواب۔۔۔''میں نے کہا۔۔۔

ٹی روم گئے ہوئے ایک عرصہ ہوگیا تھا۔۔۔ادھر کئی دنوں سے ڈاکٹر جمال سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی کہ وہ ذہنی امراض کے کسی سیمینار میں شرکت کرنے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔۔۔اُس دن جب ٹی روم پہنچا تو وہاں ہمیشہ کی طرح ایک بحث زوروں پر تھی لیکن آج بحث کا موضوع سیاسی نوعیت کا تھا۔ڈاکٹر شاہد میرے سامنے بیٹھے ہوئے خاموشی سے چائے پی رہے تھے۔۔۔ڈاکٹر فاروق ٹی روم میں دکھائی نہ دیئے۔

ٹی روم ایک طرح سے دیکھا جائے تو وقت گزاری کا وسیلہ ہی نہیں بحث کرنے والوں کے لئے ایک قسم کا اکھاڑہ سمجھیں۔۔۔جہاں پہلوانوں کی طرح جسم کا زور دکھانے کے برعکس زبان کا زور دکھانے والوں کا اجتماع رہتا ہے۔۔۔وہ حضرات جنہیں بحث کئے بغیر روٹی ہضم نہیں ہوتی۔۔۔اُنہیں ٹی روم میں چائے بیشک نہ ملے۔۔لیکن وہ ٹی روم جانا نہیں چھوڑ سکتے۔۔۔

گھر پہنچنے پر علم ہوا کہ بیگم کہیں گئی ہوئی ہیں۔بچے اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔۔۔تنہائی میں کھانا کھا کر اپنی عادت کے مطابق میں کچھ دیر کے لئے لیٹ گیا لیکن طبیعت پہ ایک بوجھ کے باعث آنکھ نہ لگی۔اُدھر بیگم بھی واپس نہیں آئی تھیں۔میں اسی انتظار میں تھا کہ وہ آئیں تو واک کیلئے نکلوں کہ فون کی گھنٹی بجنی شروع ہوگئی۔ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے ہسپتال کی ایکسچینج کا آپریٹر بول رہا تھا۔۔۔

''ڈاکٹر صاحب!میں جاوید بول رہا ہوں۔آج کوئی تین بجے ڈاکٹر فاروق کی کار کا ایکسیڈینٹ ہوگیا تھا۔جس میں کار میں پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دو بچے اور کوئی بزرگ خاتون زخمی ہوئے تھے جو ہسپتال میں داخل ہیں۔ڈاکٹر فاروق اور اُن کی بیگم موقع پر ہی ہلاک ہوگئے۔''

میں ایک سکتے کے عالم میں تھا۔۔۔ادھر آپریٹر مجھ سے بار بار پوچھے جا رہا تھا۔

''ہیلو۔۔ہیلو۔۔۔ڈاکٹر صاحب آپ سن رہے ہیں؟۔ایم ایس صاحب نے سب ڈاکٹروں کو اطلاع دینے کیلئے کہا تھا۔''

ریسیور میرے ہاتھ میں تھا۔۔۔چند روز پہلے ڈاکٹر فاروق سے ہونے والی ملاقات مجھے یاد آ رہی تھی۔ذہن میں ڈاکٹر شاہد کا پیشین گوئی کا تصور اور۔۔ڈاکٹر جمال کی پریمونیشن تھیوری آپس میں خلط ملط تھیں۔۔۔اس کنفیوژن میں بس ایک خیال طلوع ہو رہا تھا۔۔۔کیا دست شناس پروفیسر سعیدہ کی پیش بینی کا اس بات سے کوئی ربط تھا۔۔؟

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

سیٹھ

وہ موبائل فون کی دکان کے شیشے سے ٹیک لگائے اخبار کے ٹکڑے میں رکھی ہوئی بریانی کو جو اس کی ماں اس کو دے کر گئی تھی، ایک ہاتھ میں پکڑے، اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر دوسرے ہاتھ سے کھانے میں مصروف تھی۔ پیشانی اور چہرے پر پسینے کی بوندیں جیسے گلاب کے پھول پر شبنم کے قطرے۔ چہرے پر سرخی شاید بریانی میں مرچیں تیز ہو جانے کی وجہ سے تھی۔ فٹ پاتھ سے گزرتا ہوا ہر شخص اس پر نظر ڈالے بغیر نہیں گزر رہا تھا۔ وہ میلے کچیلے کپڑوں میں بھی بے حد حسین دکھائی دے رہی تھی۔ دکان کے دروازے کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھا ہوا محافظ، بندوق ہاتھ میں تھامے دکان کی حفاظت کے ساتھ شاید لڑکی کی بھی حفاظت پر مامور دکھائی دیتا تھا۔

بریانی ختم کرنے کے بعد وہ اٹھی اخبار کے ٹکڑے کا گولہ بنا کر ایک طرف پھینکا، ڈوپٹے کے پلو سے ہاتھ صاف کئے، ایک ہاتھ میں تولیوں کا گٹھا اٹھایا، دوسرے ہاتھ میں تولئے کے چند ٹکڑے پکڑے، اور آگے بڑھ کر سگنل بند ہونے کے انتظار میں کھڑی ہو گئی۔ اس کے پاس ہی دو، آٹھ یا نو سال کے لڑکے، پھٹے، میلے، کچیلے کپڑوں میں فٹ پاتھ پر اکڑو بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے، سڑک کے دوسری جانب ایک عورت، میلا کچیلا برقعہ پہنے نقاب کھولے کھمبے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے نزدیک ہی دوسری عورت چھوٹی سی بچی کو سینے سے چمٹائے دودھ پلانے میں مصروف تھی۔

سگنل بند ہوتے ہی وہ دونوں لڑکے ٹریفک کی طرف بھاگے'' بھوک لگی ہے کھانا کھلا دو، ثواب ملے گا۔'' اپنے بچوں کا صدقہ دے دو''۔ اللہ بھلا کرے غریب کی مدد کر دو۔'' کی صدائیں لگاتے ہوئے بھیک مانگنے لگے۔ برقعے والی عورت نے اپنا تولئے کا گٹھا اٹھایا، چند تولئے کے ٹکڑے دوسرے ہاتھ میں پکڑے اور بیچنے کے لئے سواریوں کی طرف دوڑی۔ بچی کو دودھ پلانے والی عورت نے ایک جھٹکے سے بچی کا دودھ چھڑایا، اسے ایک ہاتھ میں دبوچا، اس کے رونے کی پروا کئے بغیر، دوسرے ہاتھ میں کٹورا پکڑا اور ایک ایک سواری کے سامنے کٹورا پھیلا پھیلا کر بھیک مانگنے لگی۔ تولئے والی لڑکی جو سگنل بند ہونے کے انتظار میں کھڑی تھی، آگے بڑھی، سامنے رکشہ رکا ہوا تھا، اپنا تولئے والا ہاتھ بڑھا کر بولی'' پانچ روپئے کے دس۔'' رکشے والے نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، پھر اس کی نظریں پھسلتی ہوئی اس کے سراپا کو گھورنے لگیں۔ وہ اپنے پیلے پیلے دانت نکالتے ہوئے بولا۔

'' چل بیٹھ جا رکشے میں تجھے سیر کراؤنگا۔''

وہ وہاں سے ہٹ گئی اور ایک کے بعد ایک گاڑی، رکشہ، ٹیکسی، موٹر سائیکل سوار کے آگے تولئے والا ہاتھ بڑھا بڑھا کر بولتی رہی۔'' پانچ روپے کے دس لے لو۔''

کسی نے تولئے خریدے، کسی نے آنکھوں کی پیاس بجھائی۔ سگنل کھل جاتا تو سب ایک طرف بیٹھ جاتے۔ اور سگنل بند ہوتے ہی ٹریفک کی طرف دوڑتے۔ روز کا یہی معمول تھا۔ یہ سارا نظام صرف ایک آدمی چلا رہا تھا۔ دن بھر یہ غریب بھاگ بھاگ کر، بھیک مانگ کر، تولئے کے ٹکڑے بیچ کر پیسے کماتے مگر ان کے حصّے میں چند پیسوں کے علاوہ کچھ نہ آتا۔

'' امّاں تو مجھے گھر چھوڑ دیا کر۔ مجھے اچّھا نہیں لگتا اپنا آپ دکھانا۔''

'' تجھے گھر چھوڑ دوں تو سیٹھ کو پیسے کون دے گا۔؟'' ماں غصّے سے بولی

'' امّاں عارف اور ذکّو بھی تو کام کرتے ہیں۔ پھر تو مجھے کیوں بھیجتی ہے۔''

اس کی ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ماں کے نزدیک گئی اور تھوڑا سا شرما کر بولی۔

'' امّاں وہ کالی گاڑی والا آج پھر روڈ سے گزرا تھا۔ اس نے سارے تولئے خرید لئے۔ آج بھی مجھ سے کہہ رہا تھا:

'' چل میرے ساتھ تجھ سے شادی کرونگا۔''

'' اس کا تو میں دماغ صحیح کرونگی۔ اب کی مرتبہ تو مجھے اشارہ کر دینا۔ میں تیرے آس پاس ہی تو ہوتی ہوں۔ اور ہاں تو کیوں جاتی ہے اس کی گاڑی کے نزدیک، مت جایا کر، مت بیچا کر اسے تولئے۔ چل تو روٹی ڈال تیرا باپ آتا ہوگا

'' لالی کے چہرے سے غصّہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ گلابو آٹا گوندھ کر روٹی ڈالنے لگی۔

'' امّاں وہ فضلو ہے نا سیٹھ کا آدمی، آج میں کھانا کھا رہی تھی تو میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ پہلے مجھے گھورتا رہا پھر بولا تو رمضان کی بیٹی ہے نا۔'' میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھوڑی دیر کھڑا رہا پھر چلا گیا۔ یہ سنتے ہی لالی کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ جیسے کسی نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

'' تو اب سیٹھ کے آدمیوں کی نظر گلابو پر بھی پڑ گئی ۔'' لالی نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اپنی حالت کا اندازہ گلابو کو نہیں ہونے دیا۔ اسے یاد آیا ابھی کچھ دن پہلے ہی اس کی بھابی نے اس سے کہا تھا۔

'' لالی گلابو کو باہر زیادہ نہ نکالا کر، ترنت اس کے ہاتھ پیلے کر دے۔ سیٹھ کے آدمیوں کی نظروں میں آ گئی تو مشکل ہو جائیگی۔''

رات کافی ہو چکی تھی رمضان کھانا کھا رہا تھا۔ دروازے کی کنڈی بجی۔

'' اتنی رات کو کون آیا ہے۔۔۔؟'' رمضان کھانا چھوڑ کر یہ کہتا ہوا دروازے پر گیا۔

فضلو۔۔۔سیٹھ کا آدمی کھڑا تھا۔'' تجھے جمعہ کے دن سیٹھ نے بلایا ہے۔۔۔شام پانچ بجے۔''

'' کیا کام ہے۔۔۔؟ میں نے تو سارے پیسے انور صاحب کو دیدیئے ہیں۔''

'' تو خود سیٹھ سے پوچھ لینا۔'' فضلو نے پان کی پیک کی پچکاری گھر کی چوکھٹ پر ماری، گردن پر پڑے رومال کو باندھا۔'' شام پانچ بجے'' کہتا ہوا چلا گیا۔

''کون آیا تھا۔۔۔؟'' لالی نے پوچھا۔
''فضلو۔۔۔۔'' رمضان نے کہا
لالی کی آواز جیسے حلق میں بند ہوگئی۔ بڑی مشکل سے بولی۔
''اتنی رات کو کیوں آیا تھا۔۔؟''
''سیٹھ نے بلایا ہے جمعہ کے دن شام پانچ بجے۔'' رمضان دوبارہ کھانے کے لئے بیٹھتے ہوئے بولا۔

رمضان نہیں سمجھ سکا لیکن لالی سمجھ گئی۔۔۔۔۔سیٹھ نے کیوں بلایا ہے۔ وہ جانتی تھی کوئی بھی لڑکی ان کی برادری میں جو خوبصورت ہو، اگر سیٹھ یا اسکے آدمیوں کی نظر میں آ گئی، سیٹھ فوراً اس سے شادی کر لیتا ہے۔ لڑکی کے عوض تھوڑی سی رقم ماں باپ کو دے دیتا ہے۔ پھر ساری زندگی لڑکی کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔

تین سال پہلے کی بات ہے عرفان کی بیٹی شمو کو مانگا تھا۔ عرفان نے انکار کیا تو سیٹھ کے غنڈے لڑکی کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ اور عرفان کو اتنا مارا کہ وہ پلنگ سے لگ گیا اور چھ مہینے میں ختم ہوگیا۔ شمو کا آج تک کوئی پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں ہے۔۔۔؟ کیسی ہے۔۔۔؟

برادری کے سب لوگ واقف تھے۔ لیکن کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ سیٹھ کے آگے اپنی زبان کھول سکے۔

دوسرے دن صبح جب سب لوگ اپنے اپنے اڈوں کی طرف جانے کے لئے نکلے تو لالی نے عارف اور ذکو کو بھی بھیج دیا۔ یہ دونوں بچے سگنل پر بھیک مانگتے تھے۔ رمضان سو رہا تھا۔ وہ تو نشہ کر کے سویا تھا۔ تین چار بجے اٹھے گا، کھانا کھائے گا اور دوستوں کے ساتھ محفل جما کر بیٹھ جائے گا۔ اور جب سب اپنی اپنی کمائی لا کر اس کو دیں گے تو وہ یہ ساری رقم سیٹھ کے خزانچی انور کے ہاتھ پر لے جا کر رکھ دے گا۔ انور رمضان کو ان پیسوں میں سے تھوڑی سی رقم دے کر رخصت کر دے گا۔ اور جو پیسے کم ملے تو انور اس کو سیٹھ کی دھمکی دے گا۔۔ لالی یہ سب سوچتے ہوئے گلابو کو اندر کوٹھڑی میں لے گئی اور آہستہ سے بولی ''اب اگر وہ گاڑی والا کہے چل میرے ساتھ تو چلی جانا''۔ گلابو ماں کو حیرت سے دیکھنے لگی۔ الالی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس نے اپنی چارپائی کے نیچے سے ایک لوہے کا بکس نکالا۔ اپنے ڈوپٹے کے پلو سے بندھی ہوئی چابی سے بکس کا تالا کھولا، اس میں سے ایک گلابی رنگ کا جوڑا نکال کر گلابو کو دیتے ہوئے کہا۔

''یہ پہن لے۔'' اور سونے کی ایک چوڑی اس کے ہاتھ میں پہناتے ہوئے بولی ''یہ چوڑی تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے تیرے لئے بنوائی تھی۔ تیرے باپ سے چھپا کر رکھی تھی ، اگر اس کو پتہ چل جاتا تو اب تک بیچ کر نشہ کر چکا ہوتا۔''

ماں کو روتا دیکھ کر گلابو بھی رونے لگی۔ لالی نے اس کے آنسو پونچھے، اسے لپٹا لیا اور اپنی ممتا کی ساری محبت اس کے وجود میں انڈیل دی۔ گلابو نے کپڑے تبدیل کیئے۔ گلابی رنگ نے اس کے حسن کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ اس نے اپنی کلائی میں پڑی چوڑی کو دیکھا۔ پہلی مرتبہ اس نے کوئی سونے کی چیز پہنی تھی اور وہ بھی چوڑی۔ وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔

لالی نے گلابو کو دیکھا۔ پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ اس کی بیٹی گلابو بہت خوبصورت ہے۔ اس نے اس کے جوان حسن کی دل ہی دل میں بلائیں لیں، ایک بار پھر اسے لپٹا لیا اور اپنی طرف سے اسے وداع کر دیا۔ لالی نے ماں کی ہدایت کے مطابق چوڑی اپنی آستین میں چھپا لی۔ اور ماں بیٹی دونوں اڈے کی طرف چل دیں۔
لالی گھر لوٹی تو گلابو پہلے سے موجود تھی۔
''کیا وہ نہیں آیا۔۔۔؟'' لالی نے پوچھا۔
'' نہیں'' گلابو نے آہستہ سے کہا۔

دوسرے دن بھی وہ نہیں آیا۔ لالی کا خوف سے برا حال تھا۔ وہ جانتی تھی گلابو اگر سیٹھ کے مانگنے کے بعد غائب ہوئی تو سیٹھ پورے خاندان کو تہس نہس کر دے گا۔ اور گلابو کو پاتال سے بھی نکلوا لے گا۔۔۔۔کل جمعہ ہے۔ کل پانچ بجے رمضان کو سیٹھ کے پاس جانا ہے۔ اسے یقین تھا سیٹھ گلابو ہی کی بات کرے گا۔ تھوڑی سی رقم گلابو کے بدلے دے دے گا۔ بظاہر اس سے نکاح کرے گا۔ اس کے بعد گلابو کا کچھ پتہ نشان نہیں ملے گا۔ رمضان رقم لے لے گا اور پھر سارے پیسے جوئے میں اڑا دے گا۔ بس آج کا دن۔۔۔۔ایک ہی دن اور ہے۔۔۔۔۔اگر وہ گاڑی والا آج بھی نہیں آیا تو۔۔۔۔۔؟ لالی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی۔

رات سب لوگ اپنے اپنے اڈوں سے واپس آ چکے تھے۔ لالی زور زور سے رو رہی تھی سر اور سینہ پیٹ رہی تھی۔ گلابو گھر نہیں لوٹی تھی۔ ساری برادری جمع ہوگئی تھی۔ کچھ لوگوں نے گلابو کی تلاش میں دوڑ لگا دی۔

سیٹھ کو جب یہ اطلاع ملی تو اس نے رمضان کے پورے گھر والوں کو بلوا بھیجا۔۔۔۔بچوں تک کو۔۔۔ بڑی پوچھ گچھ کی۔۔۔ دھمکیاں بھی بہت دیں۔۔۔ اور بولا۔۔۔'' گلابو کو تو میں نکلوا ہی لونگا چاہے وہ کہیں بھی ہو'' اپنے آدمیوں کو تاکید کی کہ گلابو کے گھر کے تمام افراد پر کڑی نظر رکھیں۔۔۔

وہ گاڑی میں پیچھے بیٹھی تھی۔ خوف، گھبراہٹ اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ۔ اسے اپنے ماں، باپ، بہن، بھائی، سہیلیاں اپنا گھر سب ہی کچھ جو وہ پیچھے چھوڑ کر جا رہی تھی بہت یاد آ رہے تھے۔ تمام راستہ وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ وہ اسے شہر سے بہت دور کہیں لے جا رہا تھا۔ پارکنگ ایریا میں گاڑی پارک کر کے وہ ایلیویٹر کی طرف چلا۔ گلابو اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ چوتھی منزل پر پہنچ کر دونوں ایک ساتھ باہر آئے۔ اس نے فلیٹ کا تالا کھولا اور دونوں اندر چلے گئے۔ فلیٹ میں اور اس کے آس پاس مکمل سناٹا تھا۔ لگتا تھا جیسے بہت کم فلیٹ آباد ہوں۔

''تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں، اور ہاں کھڑکیوں کی طرف ہرگز مت جانا، اگر کوئی بیل بجائے تو دروازہ نہیں کھولنا بس چپ سادھے رہنا۔'' اس نے گلابو کو تاکید کی۔

پہلی بار اس اجنبی نے گلابو سے بات کی۔ اور گلابو کا جواب سنے بغیر دروازہ لاک کر کے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی گلابو نے فلیٹ کا جائزہ لیا۔ دو بڑے بیڈ روم، بڑا سا ٹی وی لاؤنج، کچن بھی اچھا بڑا تھا۔ پورا فلیٹ فرنیچر سے آراستہ اور خوبصورتی سے سجایا ہوا تھا۔ اسے ہر چیز بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔۔۔۔ اس نے واش روم کا دروازہ

کھولا اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔۔۔اتنا بڑا اور اتنا صاف ستھرا۔۔۔اندر جا کر وہ آئینے کے سامنے کھڑی ہوگئی۔۔۔اس نے اپنا سراپا دیکھا۔۔۔ وہ خود ہی شرما گئی۔۔۔

پورے فلیٹ کا چکر لگانے کے بعد وہ ٹی وی لانج میں صوفے پر آکر بیٹھ گئی۔اسے بہت زور سے بھوک لگ رہی تھی۔۔۔دروازہ کھلنے کی آواز آئی، وہ اجنبی اندر آیا اس کے ہاتھ میں تھیلیاں تھیں۔اس نے تھیلیاں میز پر رکھیں اور بولا۔''بھوک لگی ہے۔۔۔؟'' گلابو نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے میز پر کھانا لگایا اور بولا''تمہارا نام کیا ہے۔۔۔؟''

''گلابو۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''گلابو آؤ کھانا کھالو۔'' وہ میز پر کھانا لگا چکا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے بچا ہوا کھانا سلیقے سے فرج میں رکھ کر کہا۔''جب بھی بھوک لگے اس میں سے نکال کر گرم کرکے کھا لینا۔'' جاتے جاتے ایک مرتبہ پھر اس نے تاکید کی''کھڑکیوں کے نزدیک مت جانا اور چاہے کوئی کتنی بیل بجائے ، دروازہ کھٹکھٹائے ہر گز مت کھولنا۔ میں کام سے جا رہا ہوں ۔ پتہ نہیں کتنے دن میں لوٹوں گا۔۔۔اور ڈرنا بالکل نہیں یہ جگہ بہت محفوظ ہے۔ ''

جب وہ جانے لگا تو گلابو نے پوچھا''تمہارا نام کیا ہے۔''

''آصف۔'' یہ کہہ کر وہ دروازہ لاک کرکے چلا گیا۔

''آصف ۔''اس نے دوہرایا ،اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔

شام رات میں تبدیل ہوگئی، چاروں اور سے ایک سنّاٹا اسے گھیرے میں لینے کے لئے آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اس پر ایک خوف سا مسلط ہوتا چلا جا رہا تھا۔وہ صوفے پر ٹانگیں اوپر کرکے بیٹھ گئی۔اس کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ ٹی وی چلائے لیکن آصف نے منع کیا تھا ٹی وی چلانے کے لئے۔اسے گھر کی بھی بہت یاد آرہی تھی۔''یہ سب کیا ہو رہا ہے۔'' وہ بیٹھی نجانے کیا کیا سوچتی رہی جب اسے بہت نیند آنے لگی تو اس نے کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی لگائی اور منہ تک چادر لپیٹ کر سوگئی۔

جب آنکھ کھلی تو صبح کی نرم دھوپ کھڑکی کے پردوں کے درزوں سے چھن چھن کر اندر کمرے میں آرہی تھی۔ایک لمحے کے لئے وہ حیران ہوئی کہ وہ کہاں ہے۔۔۔؟ لیکن دوسرے لمحے ہی اسے سب کچھ یاد آگیا۔تین دن ہوگئے آصف نہیں آیا۔اسے اب ڈر تو نہیں لگ رہا تھا لیکن وہ پریشان ضرور تھی کہ وہ اسے قید کرکے کہاں غائب ہوگیا ہے۔ چوتھے دن وہ آیا کھانے کی کچھ چیزیں دے کر کہنے لگا۔''یہ کچھ کھانے کی چیزیں ہیں سنبھالو اور یہ کپڑے ہیں تمہارے لئے نہا کر بدل لینا۔۔ مجھے کچھ ضروری کام ہے میں پھر آؤں گا'' یہ کہہ کر وہ کھڑے کھڑے ہی واپس چلا گیا۔''اس نے مجھے چھوا بھی نہیں۔'' گلابو نے حیرانی سے سوچا۔ساتھ ہی وہ کسی انجانے خوف سے کانپ اٹھی۔

سب لوگ گلابو کو تلاش کرکے تھک گئے۔سیٹھ کے آدمیوں نے بھی بہت ڈھونڈیا مچائی۔گلابو کا کوئی پتہ نہ چلا

۔لالی بظاہر رونا پٹنا مچائے ہوئے تھی۔لیکن وہ مطمئن تھی۔اس نے جیسا چاہا ویسا کر دیا۔''

گلابو کو وہاں رہتے ہوئے پورا ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔اسی دن شام میں آصف آیا کہنے لگا چلو ہمیں کہیں اور چلنا ہے۔وہ آصف کے ساتھ گاڑی میں پیچھے کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔گاڑی ایک اور آدمی چلا رہا تھا۔تھوڑی دور جانے کے بعد آصف نے گاڑی رکوائی اور گلابو سے بولا''تم ان کے ساتھ جاؤ میں وہیں پہنچ جاؤنگا۔''

یوں وہ اس بازار کا ایک حصّہ بن گئی۔شروع میں بہت روئی دھوئی۔وہاں سے نکلنے کی بھی بہت کوشش کی۔ بالآخر اسے وہاں کے طور طریقوں کو اپنانا پڑا۔اس پر آصف کی حقیقت کھل چکی تھی۔اسکے دل میں آصف کے لئے جو جذبات تھے اب ان کی جگہ کراہیئت نے لے لی تھی۔''کیا مرد سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔؟'' وہ اکثر سوچتی۔۔۔۔

کنول جان کو سب آپا کہتے تھے۔ادھیڑ عمر کی یہ خاتون اب بھی بے حد حسین تھیں۔اس بازار پر ان ہی کی حکمرانی چلتی تھی۔لیکن ایک عجیب بات گلابو نے یہ دیکھی کہ وہاں کی سب لڑکیاں کنول جان سے بہت محبت کرتی تھیں ۔شاید کنول جان یہ بھول نہیں سکی تھیں کہ ایک دن ان کو بھی ان لڑکیوں کی طرح اس بازار میں زبردستی لایا گیا تھا۔ ان کے رویے میں ایک چھپی ہوئی مادرانہ شفقت کا احساس ہوتا تھا۔

''آپا! وہ جو کل آیا تھا۔۔گلابی (گلابو جو اس بازار میں پہنچ کر گلابی بن گئی تھی) ڈرتے ڈرتے کنول جان سے بولی''

''ہاں ہاں وہ۔۔۔۔وہ جو مہینے ایک ہی بار آتا ہے۔جب اسے پگھار ملتی ہے۔کنول جان ہنستے ہوئے بولیں۔''

'' آپا وہ مجھے ہاتھ بھی نہیں لگاتا ہے۔مجھ سے باتیں کرتا رہتا ہے۔اور جب مجھے نیند لگ جاتی ہے تو وہ پیسے میرے سرہانے رکھ کر چلا جاتا ہے۔کل وہ کہنے لگا وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' گلابی ایک ہی سانس میں ہمت جٹا کر بول گئی۔

کنول جان نے ایک قہقہہ لگایا اور بولیں''بولتے تو سب ہیں لیکن کوئی بھی کوٹھے کی 'رانی' کو اپنے گھر کی 'ملکہ' نہیں بناتا۔۔۔۔''

''نہیں آپا وہ سب کی طرح نہیں ہے۔وہ سچے دل سے کہہ رہا تھا''۔گلابی اس کی حمایت میں بولی۔

کنول جان سنجیدہ ہوگئیں۔انہوں نے گلابی کو غور سے دیکھا۔گلابی نگاہیں نیچی کئے بیٹھی تھی۔کنول جان نے گلابی کو سمجھایا۔''یہ لوگ جو رات کے اندھیرے میں یہاں آتے ہیں دن کی روشنی میں ہمیں پہچانتے بھی نہیں ہیں۔ہمیں رسوا اور ذلیل سمجھتے ہیں۔''ایسا کہتے سمے زندگی کی ساری تلخی ان کے لہجے میں سما گئی تھی۔

''آپ اس سے ایک مرتبہ بات کرکے دیکھیں، میں نے اسے کل بلایا ہے۔'' گلابی نے کنول جان کی منت کی اور اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔

گلابی کی ضد پر کنول جان نے اس سے بات کی۔۔۔۔۔کیا باتیں ہوئیں۔۔۔؟ کنول جان نے گلابی کو نہیں بتائیں البتہ دوسرے ہی دن سب سے چھپ کر انہوں نے گلابی کو برقعہ اوڑھایا اور خود بھی برقعہ اوڑھا اور خاموشی سے اس بازار سے نکل گئیں۔کنول جان کی گاڑی بھی موجود تھی، ڈرائیور بھی تھا لیکن کنول جان نے رکشہ پکڑا اور

عاصم کے بتائے ہوئے پتے کی جانب دونوں روانہ ہوگئیں۔
راستے میں وہ گلابی سے بولیں۔ ''اگر ایڈریس غلط بتایا ہو یا گھر میں تالا لگا ہو تو پریشان مت ہونا۔ان مردوں کا کوئی اعتبار نہیں۔۔۔۔۔میں تو تمہاری وجہ سے۔۔۔پھر وہ خاموش ہوگئیں۔''
عاصم ان کے انتظار میں گھر کے باہر کھڑا ہوا تھا۔اس کے ساتھ دونوں اندر چلی گئیں۔اندر عاصم کے کچھ دوست بیٹھے ہوئے تھے۔تھوڑی ہی دیر میں قاضی صاحب آ گئے۔نکاح پڑھایا گیا۔نکاح نامے میں گلابی۔۔۔غزالہ بیگم بنت شیخ رمضان کے طور پر درج ہوئی اور ان کے شوہر کا نام عاصم احمد ولد ناظم احمد لکھا گیا۔نکاح نامے کی ایک نقل کنول جان کو بھی پیش کی گئی۔کنول جان نے گلابی کو سونے کے جھمکے پہنائے، دعائیں دیں اور آنکھوں میں آنسو لئے وہاں سے اکیلی بازار کی جانب لوٹ گئیں۔۔۔آج وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا محسوس کر رہی تھیں۔۔۔جاتے جاتے وہ عاصم کے قریب آئیں اور بولیں ''اگر ممکن ہو تو کسی اور شہر میں۔۔کہیں دور چلے جاؤ اور اس کا بہت خیال رکھنا۔۔'' انہوں نے گلابی کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔
عاصم احمد ولد ناظم احمد بازارِ حسن کی بظاہر سخت اور بباطن نرم نائکہ کنول جان کے مشورے پر عمل درآمد کرتے ہوئے غزالہ بیگم ولد شیخ رمضان کو لے کر غائب ہوگیا۔

بڑی مدت کے بعد رنگین رومال باندھے ہوئے فضلو نے شیخ رمضان کے گھر کے کواڑ بجائے۔جب رمضان باہر آیا تو فضلو نے پان کی پیک بھرے منہ سے ایک پچکاری دروازے کی چوکھٹ پر ماری اور بولا۔
'' آج شام سیٹھ کے گھر کوئی تقریب ہے۔تم سب کا بھی بلاوا ہے۔ ڈھنگ کے کپڑوں میں آ جانا مغرب بعد۔۔۔۔'' جاتے جاتے اس نے چوکھٹ پر ایک پچکاری اور ماری۔۔۔سرخ خون جیسی پیک کی۔

رمضان اور لالی سورج ڈوبتے ہی سیٹھ کی کوٹھی پہنچ گئے۔سیٹھ کی کوٹھی میں برآمدے کے زینے کے نیچے غریب غرباء کا مجمع لگا تھا۔دونوں ان میں شامل ہو کر بیٹھ گئے۔فضلو ان کو تلاش کرتا ہوا اس طرف آ نکلا اور ان دونوں کو اشارے سے بلا کر کہا۔تم دونوں کا اندر انتظار ہے۔اور بولا ''رمضان تو باہر مردوں میں شان سے بیٹھنا اور گھر والی کو اندر بھیج دینا۔'' دونوں اندر گئے۔رمضان مردوں میں وہاں بیٹھ گیا جہاں شریف شرفاء بیٹھے تھے۔لالی سہمی سہمی اندر زنانخانے میں چلی گئی۔وہ ڈر رہی تھی کہ اس سے ضرور بے گار لی جائیگی۔۔۔اور وہ بھی نہ جانے کیا۔ داخل ہونے کے بعد وہ دروازے کے قریب ہی ایک کونے میں کھڑی ہو کر حالات کا جائزہ لینے لگی۔اس سے پہلے کہ وہ ماحول کو اچھی طرح دیکھ پاتی۔اندر۔۔۔بہت اندر سرخ مخمل سے ڈھکے ہوئے ایک تخت پر لڑکیوں کے جھرمٹ میں اس کی گلابو دلہن بنی بیٹھی دکھائی دی۔لالی نے اس کے بعد جو کچھ دیکھا، جو کچھ سنا، اسے اس کا ہوش نہیں رہا۔

قاضی آیا۔نکاح پڑھایا گیا۔۔اس نے یہ بھی نہیں دیکھا، اور دیکھا بھی تو نہیں دیکھا۔۔نکاح نامے میں دلہن کے خانے میں فخر انساء بنت شیخ رمضان لکھوایا گیا۔اس نے یہ بھی نہیں سنا کہ اس کی لاڈلی بیٹی گلابو سے گلابی۔۔ گلابی سے غزالہ بیگم زوجہ عاصم احمد اور پھر۔۔غزالہ بیگم سے فخر النساء زوجہ سیٹھ ارشد ولد کرم دین کیسے بنی؟

ڈاکٹر بلند اقبال (کینیڈا)

چاند پر موت

''۔۔بس تھوڑی ہی دیر کے لیے زمین کا دل کانپا تھا اور پھر اُس کا سینہ چھلنی ہوتا چلا گیا۔
فضاء بے بسی سے زمین کو کٹتے دیکھنے لگی۔آگ اور دھویں کا ایک طوفان تھا جو اُس کے چٹان جیسے سینے سے نکل کر ارد گرد کی فضاء کا دم گھونٹ رہا تھا۔آگ کی لپٹیں زمین کو تہہ در تہہ جلا رہی تھیں۔اُس کی کوکھ جو کھربوں اربوں سالوں سے سکون و آشتی کا سمندر چھپائے بیٹھی تھی لمحے بھر میں ایک اَن دیکھے عذاب کا نشانہ بن گئی اور اب ایک ایسی بانجھ کوکھ کی شکل میں ڈھل گئی تھی جسے جنم جنم سکون کی خواہش میں جلنا تھا۔
''زندگی موت کی بھی تو ہوتی ہے''
روتی ہوئی فضاء نے زمین کو بلکتے دیکھ کر دلاسہ دیا اور پھر ہوا کی شکل میں بکھرنے لگی۔زمین نے پہلی بار وقت کا مزا چکھا اور لا متناہی سے متناہی ہونے لگی، پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے دامن میں صدیاں سمٹنے لگی۔''
یہ کہہ کر دادا نے ایک گہری سانس لی اور بادلوں کو تکنے لگا پھر کچھ ہی لمحوں بعد اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے آسمان پر چاند کو ڈھونڈنے لگا مگر بادل کچھ اس طرح تہہ در تہہ ایک دوسرے پر چڑھے ہوئے تھے جیسے وہ چاند رات نہیں بلکہ اماوس کی رات ہو۔چاند کو نہ پا کر دادا نے مایوسی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ایک بار پھر کھوئے ہوئے منظر سے خود کو جوڑنے کی کوشش کرنے لگا۔چار پائی کے بان بوڑھے دادا کے بوجھ سے پل بھر کے لیے چرچرائے اور اپنی کھوئی ہوئی نیند ڈھونڈنے لگے مگر چار پائی کے بانوں کی آواز سن کر دادا کا پوتا کسمسا سا گیا اور پھر دادا کا دامن کھینچ کر پوچھنے لگا ۔۔
''دادا پھر زمین کا کیا بنا؟''
''۔۔فضاء ہوا میں ڈھلی، پہلے پہل تو بہت ہی بھڑکی اور اپنی آگ میں خوب ہی جلی مگر پھر زمین کے کرب میں اشکبار ہوتی چلی گئی اور بالاخر پانی پانی ہونے لگی۔آگ جو ٹھنڈی ہوئی، زمین کی کوکھ پھر سے ہری ہونے لگی۔ہر طرف سبزہ اُگنے لگا پھر اُس میں مور بھی ناچنے لگے۔چپکے چپکے زمین کا سینہ دودھ سے بھرنے لگا۔ممتا کی ماری اپنا کرب بھول کر سانپوں کو دودھ پلانے لگی۔''بانجھ کوکھ سے، کرب پیدا ہوتا ہے، امن و سکون نہیں'' فضاء نے زمین

کی تنبیہ کی مگر جیسے شکاری کے جال میں کسی بے بس پرندے کی طرح، وہ تخلیق اور ممتا کے درمیان محض پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ دوسری طرف زمین آستینوں کے سانپ پیدا کرنے لگی جو انسانوں کی شکل میں تھے اور اپنے پوٹوں میں زہر چھپائے بیٹھے تھے۔''

یہ سُن کر پوتے نے اپنی دونوں آستینوں سے ہاتھ نکال لیے اور دادا کے دامن کو اپنی مٹھیوں میں بھینچ لیا۔ دادا نے پیار سے پوتے کو سہلایا اور دھیمے سے دلاسا دیا۔۔

''جیسے تم مجھ سے جڑے ہو میرے پوتے، گزرے اور آنے والے وقتوں کی طرح دامن بھی آستیوں سے سلے ہوتے ہیں،۔۔''

ایک لمحے کے لیے امید کی کوئی انجانی کرن پوتے کی خوابیدہ آنکھوں میں چمکی مگر پھر اماوس کے گہرے اندھیرے میں ڈوبتی چلی گئی کیونکہ دادا کی پلکوں کا آنسو جو چاند کی طرح چمک رہا تھا وہ اصل میں چاند نہیں تھا۔ چاند تو واقعی تہہ در تہہ بادلوں تلے چھپا ہوا تھا۔ پوتے نے غمناک آواز میں دادا سے پوچھا۔۔

''اچھا پھر زمین کا کیا بنا؟''

''۔۔۔فضاء زہریلی ہواؤں سے بھرنے لگی۔ زمین کے آستین کے سانپ اُسے ڈسنے لگے اور اُس کی کوکھ کو سانپوں سے بھرنے لگے۔ اُن کے زہر سے فضاء ایسی آلودہ ہوئی کہ خود اُس کے لیے بھی سانس لینا مشکل ہوتا چلا گیا۔ اِن آستین کے سانپوں نے زمین کے جگر کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور پھر وہ ایک دوسرے کے بچوں کو کھانے کے لیے اپنے قد سے بڑے ناگ اور اژدھے بنانے لگے جو اپنے منہ سے ہر رنگ کی آگ پھینکتے تھے اور لمحے بھر میں کھربوں اربوں زندگیوں کو موت سے بدل دیتے تھے۔ زمین کے سینے کو آگ سے بھر دیتے تھے اور اُس کی کوکھ سے وہ نفرت پیدا کرتے کہ زمین بانجھ کوکھ کی خواہش میں رونے لگتی تھی۔''

بوڑھا دادا یہ کہ کر بلک بلک کر رونے لگا اور پھر آسمان کی طرف دیکھ کر سسکیاں بھرنے لگا۔ اچانک پوتے کو لگا جسے دادا کے آنسوؤں میں چاند چمک رہا ہو۔ پوتے نے بیتابی سے دادا کا دامن کھینچا اور کہا۔ ''دادا چاند نکل آیا۔'' بوڑھے دادا نے سر اُٹھا کر چاند کو دیکھا تو اُس کا چہرہ خوف سے فق ہو گیا۔۔ زمین کا ایک ناگ چاند کے سینے کو چیر رہا تھا۔

لمحے بھر کے لیے چاند کا دل کانپا اور پھر اُس کا سینہ بھی چھلنی ہوتا چلا گیا۔

چاند پر کے بادل ایک کے پیچھے ایک چھپ رہے تھے۔ آگ اور دھویں کا ایک طوفان تھا جو اُس کے چٹان جیسے سینے سے نکل کر آس پاس کے بادلوں کا دم گھونٹ رہا تھا۔

آگ کی لپٹیں اُس کو تہہ در تہہ کو جلا رہی تھی۔۔۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

ماجد شاہ (ایبٹ آباد)

صبورہ

اس کہانی کا چودھری تقریباً ایک روائتی چودھری ہے۔ وہ کئی مربعوں کا مالک ہے اس کی زمینوں پر کوئی دوسو سے زیادہ گاؤں آباد ہیں۔ وہ مقدمہ بازی اور شکار کے علاوہ سیاست، عورت اور شراب کا بھی دلدادہ ہے۔ مزارعوں اور کمی کمینوں پر ظلم کرنا اپنی شان سمجھتا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود اسے انصاف کرنے کا بہت شوق ہے۔ اس شوق کے باعث اس وسیع و عریض علاقے میں ملکی اور خدائی ضوابط کی جگہ چودھری کے خودساختہ قوانین رائج ہیں۔ منصفی کے واسطے بظاہر چودھری نے پانچ بزرگوں کی ایک نام نہاد پنچائیت بھی بنا رکھی ہے مگر آخری اور حتمی فیصلہ اسی کا ہوتا ہے اور چونکہ انصاف قائم رکھنے کے لیے جیلوں اور عقوبت خانوں کا ہونا ناگزیر ہے لہذا ہمارے انصاف پسند چودھری نے ان خرافات کے لیے بھی ایک خاصی بڑی جگہ مختص کر رکھ ہے اور ہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ چودھری ہٹ دھرم اور اڑیل بالکل بھی نہیں ہے بلکہ بہت معاملہ فہم آدمی ہے کوئی بھی چیز اصولاً اخلاقاً یا مذہباً کتنی ہی ناگوار کیوں نہ ہو، اگر وہ اسکی جاگیر یا اسکے اختیارات میں اضافے کا باعث ہے۔۔۔ تو وہ فوراًاسے قبول کر لیتا ہے۔۔

ہماری اس کہانی کا چودھری روائتی اس لیے بھی ہے کہ اس نے اپنی دو جوان بہنوں کو گھر بٹھا رکھا ہے۔ ان کے رشتہ نہ ہونے کئی ایک توجیہیں پیش کی جاتی ہیں مثلاً کوئی ٹکر کا رشتہ نہیں ملتا یا لڑکا اچھا نہیں ہے وغیرہ وغیرہ لیکن سب سے بڑی وجہ زمین کے تقسیم ہونے کا ڈر ہے۔ چودھری ہے بہت شاطر، بظاہر بہنوں سے بہت محبت جتاتا ہے۔ انکے کھانے پینے کا کیال رکھتا ہے۔ نئے کپڑے، قیمتی زیور الغرض ہر طرح کی آسائش انہیں دے رکھی ہے۔ لیکن ہے بہت کائیاں آدمی۔ وہ اسی بات سے بخوبی واقف ہے کہ اچھی خوراک اور آسائشوں کے باوجود اسنے ان پر جو قدغن لگا رکھی ہے وہ کہیں بے عزتی کا باعث نہ بنے لہذا اسکی بہنوں کے ساتھ ہر وقت دو تین بڑی بوڑھیاں پہرے داروں کی صورت انکی نگرانی کرتی ہیں لیکن یہ سب اس غیر محسوس طریقے سے ہوتا ہے کہ بہنیں اپنے ویرے سے متنفر نہیں ہیں۔ بلکہ وہ دونوں تو ہر وقت شوخ بھڑکیلے لباس پہنے اور سونے چاندی سے آراستہ اپنے بھائی کے گن گاتی ہیں۔ چودھری کی بہنیں ہی بہت چڑچڑی اور کرخت مزاج چھوٹی چھوٹی باتوں پر کام کرنے والیوں کو ڈانٹنا، معمولی باتوں پر ان پہ تشدد کرنا ہر وقت شور شرابا کرتے رہنا گویا انکی عادت ہے۔

کہانی کا آغاز اسطرح ہوتا ہے کہ تقریباً دوسو کے قریب، غریب مسکین دیہاتی ایک میدان میں زمین پر بیٹھے ہیں۔۔۔ سامنے ایک بڑے سایہ دار درخت کے نیچے سیمنٹ کے ایک چبوترے پر ایک چارپائی اور پانچ کرسیاں رکھی ہیں ایک طرف ملزم کے لیے کٹہرا بنا ہوا ہے۔

چار پائی پر چودھری موچھوں کو تاؤ دیئے اونچا شملہ پہنے براجمان ہے ۔ پیچھے ایک شخص کلاشنکوف اٹھائے کھڑا ہے ۔کرسیوں پر پانچ بزرگ تشریف فرما ہیں ۔انکے کپڑے عام لوگوں کی نسبت زیادہ اجلے ہیں ۔کٹہرے میں ایک شہری عورت کھڑی ہے جسکی عمر کوئی چالیس سال کے لگ بھگ ہے ۔اسکے چہرے پر پریشانی اور غصے کے آثار تو ہیں لیکن شرمندگی کہیں دکھائی نہیں دیتی ۔

عورت بری عمی کی ہونے کے باوجود بہت جاذب نظر دکھائی دیتی ہے ۔اسکی سفید رنگت اور تھوڑا بے فریہ جسم ہلکے گلابی کپڑوں میں خوب نکھر رہا ہے ۔خصوصاً لیئرز میں ترستے بل ،جنہیں گرے ڈائے کیا گیا ہے ۔ہلکی ہلکی ہوا سے اڑ کر قیامت برپا کر رہے ہیں ۔

چودھری اس عورت کو کنکھیوں سے اسطرح دیکھتا ہے ۔جیسے اس نے اسے پہلی بار دیکھا ہو ۔ایک آدمی چبوترے کے سامنے آتا ہے اسکے پاس ایک فائل ہے اور اسکا نام گاما ہے ۔

گاما: چودھری صاحب اس فاحشہ عورت کا قصور آپکو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا ۔۔۔اور آپکے حکم کے مطابق ہم نے اس کو اپنا علاقہ چھوڑنے اور نام نہاد فلاحی ادارہ بند کرنے کے نوٹس بھی دیئے ۔۔۔لیکن اس نے باوجود یہ باز نہ آئی ۔۔۔۔۔۔ جناب لوگ اسکے خون کے پیاسے ہیں ۔۔۔۔۔۔ وہ اسے قتل کر دینا چاہتے ہیں ۔۔۔لیکن قانون کی پابندی کرتے ہوئے کسی نے ابھی تک اسے ہاتھ نہیں لگایا ۔۔۔ جناب میرے پاس یہ فائل موجود ہے جسمیں تمام مکتبہ فکر کی طرف سے اس فاحشہ کو قتل کر دینے کے فتوے موجود ہیں ۔۔۔۔۔۔ یہ فائل میں آپکی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔۔۔۔ چبوترے پر آ کر گاما چودھری کو فائل دیتا ہے اور نیچے اتر جاتا ہے ۔

عورت: چودھری صاحب ۔۔ مجھے اسطرح لوگوں کے سامنے مجرم بنا کر کٹہرے میں کھڑا کرنا ۔۔۔۔قانوناً جرم ہے ۔۔۔۔اور میں آپ جیسے پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے شخص سے اسطرح کی امید نہیں رکھ سکتی کہ آپ قانون کو اپنے ہاتھ میں لیں گے ۔۔۔۔پلیز مجھے یہاں جانے دیا جائے ۔

چودھری فائل چار پائی پر چھوڑ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیتا ہے اور عورت کو اوپر سے نیچے تک گھورتا ہے لیکن ایک لفظ نہیں بولتا ۔۔۔شاید "پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے" جیسے الفاظ اسکی زبان بند کر دیتے ہیں پنچائیت میں سے ایک بزرگ بول پڑتے ہیں ۔

بزرگ نمبر 1: دیکھ لڑکی زیادہ چالاک بننے کی کوشش مت کر ۔۔۔۔اس علاقے کا یہی اصول ہے کہ ہم اپنے فیصلے خود کرتے ہیں ۔۔۔۔۔اور تو یہ اچھی طرح جانتی ہے ۔۔۔۔تمہارے لیئے یہی بہت کہ ہم تمہیں صفائی کا پورا پورا موقع دے رہے ہیں ۔

عورت: دیکھیں آپکی اسطرح کی حرکت سے آپ لوگوں پر ملک سے بغاوت کا مقدمہ بھی چل سکتا ہے ۔

بزرگ نمبر 2: (طنزیہ ہنس کر) ۔۔۔۔تو ہمیں ڈراتی ہے ۔۔۔ہم تو مقدموں کو مرد کا زیور سمجھتے ہیں ۔۔۔۔تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ تم یہاں خاموش کھڑی رہو ۔۔۔ ہمارے ایک اشارے پر یہ لوگ تمہاری تکہ بوٹی کر دیں گے ۔۔۔۔ چودھری صاحب کا شکریہ ادا کرو ۔۔۔۔۔جنکی وجہ وے ابھی تک تمہاری جان

سلامت ہے ۔۔۔اور تمہیں صفائی کا موقع دیا جا رہا ہے ۔۔۔۔۔لہذا تمہاری زبان سے ایک لفظ نہ نکلے ۔۔۔۔۔
(عورت بولنے لگتی ہے مگر غصے سے سر جھٹک کر خاموش ہو جاتی ہے)

بزرگ نمبر 1: گامے تو گواہ پیش کر

گاما: سرکار! یہ عورت عرصہ دو سال سے ہمارے مختلف گاؤں کے چکر لگاتی رہی ،اس نے بیواؤں ،مطلقہ عورتوں اور بڑی عمر کی غیر شادی شدہ عورتوں کی فلاح کا ڈھونگ رچایا ،بظاہر سلائی مشینوں اور امداد کا جھانسہ دیا اور در پردہ انہیں فحاشی کی تعلیم دیتی رہی ۔۔۔۔۔ میرے پاس گواہ تو بہت سارے ہیں لیکن اس وقت آپکے سامنے میں پانچ گواہ پیش کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔اجازت ہے ۔۔۔۔۔

بشیرا: (چودھری کی طرف ہاتھ جوڑ کر) چودھری صاحب کی خیر ہو ۔۔ جناب اس عورت نے میری بیوہ بھابھی کو پہلے ایک سلائی مشین دی ۔پھر اس سے دوستی کر لی ۔۔۔اور پھر وہ بیچاری فحاشی کی راہ پر چل نکلی ۔۔۔۔وہ بہت شریف عورت تھی جی ۔۔۔۔اس نے اسے خراب کیا ہے ۔۔۔اسے نئے اور انوکھے کام پر لگا دیا ہے ۔میری آپ سے یہی اپیل ہے کہ اسے سخت سے سخت سزا دی جائے (بشیرا چلا جاتا ہے ۔)

گاما: چل بئی نذیر تو بھول

نذیرا: (ہاتھ جوڑ کر لیکن غصہ میں) چودھری صاحب کا اقبال بلند ہو ۔۔۔۔جناب اس حرامزادی نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا (عورت غصے میں ہونٹ دانتوں میں چبا کر ناگواری کا اظہار کرتی ہے) چودھری صاحب میری بدقسمت طلاق یافتہ بہن جو سلائی کڑھائی کا کام جانتی تھی ۔۔۔اس کنجری کے ہتھے چڑھ گئی ۔۔۔۔ یہ بازار سے اسے کپڑا دھاگہ لا کر دیتی تھی ۔۔۔وہ کپڑوں پہ کڑھائی کرتی ۔۔۔اور یہ ان کپڑوں کو بازار میں بیچ آتی تھی ۔۔۔۔اسطرح اس نے میری بہن سے دوستی کر لی ۔اسکی سہیلی بن کر اسے فحاشی کی راہ پر لگا دیا ۔۔۔ یہ بری کمینی عورت ہے جی ۔۔۔ پتا نہیں کیا کیا خرافات اسے بازار سے لا کر دیتی تھی ۔۔۔اسے سزائے موت ہونی چاہیے ۔ سزائے موت (عورت غصے سے نذیرے کو گھورتی ہے)

گاما: بس کر نذیرے (نذیرا چلا جاتا ہے) چل بئی شیدے تو آ اور بتا اس کرم جلی کے کرتوت ۔
(چودھری تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنی بھیڑیہ صفت نگاہیں اسکے جسم سے مس کرتا ہے)

شیدا: (ہاتھ جوڑ کر) ۔۔۔۔سرکار کی خیر ہو ۔۔۔۔سرکار یہ دائن ہے ڈائن اس چڑیل نے پہلے میری بڑی بہن کو سلائی مشین دی ۔۔۔۔ پھر اس سے میل ملاقات بڑھائی ۔۔۔۔۔آپکو تو پتا ہے بچپن میں میری بہن کا منہ جل گیا تھا ۔۔۔اسی وجہ سے ابھی تک اسکی شادی نہیں ہو سکی ۔۔۔اس ڈائن نے اس قسمت جلی کو فحاشی کی راہ پر ڈال دیا ہے ۔ (جذباتی ہو کر) چودھری صاحب آپ کے ایک اشارے کی ضرورت ہے میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا ۔۔۔ خدا کا واسطہ ہے آپ مجھے حکم دیں میں اسے کچا چبا جاؤں گا ۔۔۔(عورت غصے سے چہرے پر آئی لٹ کو جھٹکتی ہے)

گاما: (گندھے پر ہاتھ رکھ کر) بس شیدے ۔۔۔۔بس کر اسے ضرور سزا ملے گی ۔۔۔تو بیٹھ (سیدا روتے

ہوئے بیٹھ جاتا ہے۔گاما اگلے گواہ کو پیش کرنے لگتا ہے۔

بزرگ نمبر3: بس گامے بس۔۔۔گواہ تو دو ہی کافی تھے۔(چودھری سے مخاطب ہو کر) چودھری صاحب میرا خیال ہے آپ اسی عورت سے کہیں کے یہ اپنی صفائی پیش کرے۔۔۔۔تا کہ ہم فیصلہ سنا سکیں۔

بزرگ نمبر4: ایک منٹ۔۔۔۔میرا خیال ہے چودھری صاحب۔۔۔گواہی ابھی مکمل نہیں ہوئی (عورت لاتعلق سی ہو کر کھڑی رہتی ہے) اگر آپ اجازت دیں تو میں گواہوں سے کچھ سوال پوچھ سکتا ہوں۔

چودھری: اجازت ہے (بھیڑیا ایک بار پھر شکار کا جائزہ لیتا ہے9

بزرگ نمبر4: تینوں گواہ ذرا سامنے آئیں (سامنے آتے ہیں)۔۔۔دیکھو۔۔۔۔۔۔مسئلہ کسی کی زندگی اور موت کا ہے۔۔۔اور انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ہم بات کھل کر کریں۔۔۔۔گو کہ بات ذرا شرم کی ہے مگر مجھے واضع الفاظ میں اسکا جواب دو کہ کیا تم نے جن عورتوں کا ذکر ابھی کیا ہے۔۔۔۔انہیں تم نے خود یعنی اپنی آنکھوں سے کسی مرد کے ساتھ دیکھا ہے۔

تینوں: نہیں جی!

بزرگ نمبر4: کیا مطلب (باقی بزرگوں کو حیرانی سے دیکھتے ہوئے) یہ سب کیا ہے؟ (بزرگ نمبر 5 جسے سارے معاملے کا پتہ ہے۔بزرگ نمبر 4 کے کان میں ایک طویل سرگوشی کرتا ہے جس سے بزرگ نمبر 4 کے چہرے کا رنگ بالکل متغیر ہو جاتا ہے یہ بزرگ کو دیکھتا ہے اور پھر حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے خاموش ہو جاتا ہے)

بزرگ نمبر5: (لوگوں سے مخاطب ہو کر بزرگ نمبر 4 کی طرف اشارہ کر کے) اصل میں حاجی صاحب کو اس معاملے کی بالکل خبر نہیں تھی۔۔۔۔۔اسلئے انہوں نے ایسا سوال کیا ورنہ ہم سب جانتے ہیں کہ اصل معاملہ کیا ہے اور کس قدر شرمناک ہے۔۔۔۔لہذا۔۔۔چودھری صاحب۔۔۔اب آپ ملزمہ کو صفائی کا موقع دیں۔

چودھری: (اپنا شملہ اتار کر چارپائی پر رکھتے ہوئے، رحم اور ہوس بھری نظروں سے عورت کو دیکھتا ہے) آپ! اپنی صفائی میں کیا کہنا چاہتی ہیں (یہ کہہ کر چودھری بظاہر لوگوں پر نظریں جمالیتا ہے لیکن اسکی آنکھوں میں دائرے اور قوسیں گھومنے لگتی ہیں)

عورت: (بارعب انداز میں) چودھری صاحب۔۔۔۔میرے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے۔۔۔یہ سراسر ناانصافی ہے۔۔۔یہ زبردستی ہے میرے ساتھ۔۔۔۔۔

بزرگ نمبر1: دیکھ لڑکی۔۔۔۔۔تم اسے زبردستی سمجھو یا ظلم یہ تمہارا مسئلہ ہے۔۔۔تم نے ہمارے علاقے کی ناموس سے کھیلنے کی کوشش کی ہے۔۔۔اور اسکی سزا موت ہے۔۔۔۔صرف موت۔۔۔۔۔ہم پہلے بھی تمہیں بتا چکے ہیں کہ۔۔۔ہمارے نزدیک تمہیں صفائی پیش کرنے کا بھی حق نہیں ہونا چاہیئے تھا۔۔۔۔یہ چودھری صاحب کا فیصلہ ہے۔۔۔اس لیے ہم لوگ تمہیں یہ حق دے رہے ہیں۔۔۔۔لہذا تم وقت ضائع نہ کرو۔۔۔۔۔اگر تم نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے تو کہو۔۔۔۔ورنہ ہمارے صبر کا امتحان مت کر۔۔۔۔سمجھیں تم۔۔۔

عورت: (اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کچھ توقف کے بعد) چودھری صاحب۔۔۔۔میرا جی تو نہیں چاہتا کہ

میں ایک لفظ بھی کہوں۔۔۔۔۔۔لیکن ان لوگوں کی ضد پوری کرنے کے لئے۔۔۔اور آپ اس عنایت کی خاطر کے آپ نے مجھے صفائی کا موقع دیا ہے۔۔۔۔۔ میں اپنی صفائی پیش کرتی ہوں۔۔۔۔۔(معمولی سی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ) بہر حال مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ نے اس جنگل میں بھی انصاف قائم کر رکھا ہے (چودھری کے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی ایک لہر نمودار ہوتی ہے) مجھے بولنے کی اجازت ہے؟

چودھری: اجازت ہے (پنچائیت کی طرف مڑ کر) میرے متعلق گواہوں نے جو بیان دیئے ہیں۔۔۔وہ سراسر الزام ہیں اور بہتان طرازی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔۔۔میں نے ہمیشہ عورت کو باعزت اور باوقار زندگی گزارنے کا درس دیا ہے۔میرا تو مقصد ہی یہ ہے کہ عورت اس تنگ نظر معاشرے میں بدچلن اور فاحشہ جیسے الفاظ سے محفوظ رہے۔۔۔۔اسی غرض سے میں انہیں معاشی طور پر مضبوط کرنے کی کوشش کی تا کہ کہیں معاشی بدحالی انہیں غلط رستے پر نہ ڈال دے۔۔۔لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ اس سب کے باوجود الٹا مجھ پر یہ الزام لگایا جا رہا ہے کہ میں عورتوں کو فحاشی کے رستے پر ڈال رہی ہوں۔۔۔جناب چودھری صاحب! اگر میں کوئی ایسا گھناؤنا مقصد لے کر گاؤں کا رخ کرتی تو آپ خود سوچیں کہ کیا میرا نشانہ بیوائیں اور طلاق یافتہ یا غیر شادی شدہ بڑی عمر کی عورتیں ہوتیں یا۔۔۔کمسن۔۔۔کنواریاں

بزرگ نمبر4: منہ سنبھال کر لڑکی۔۔۔(چودھری ہاتھ کے اشارے سے بزرگ کو چپ کروا دیتا ہے۔اب چودھری کی آنکھوں میں وحشت کے ساتھ ساتھ تفکر کی ہلکی سی جھلک دکھائی دے رہی ہے)

عورت: (بات جاری رکھتے ہوئے) چودھری صاحب۔۔۔۔جن عورتوں کی بات ابھی ان گواہوں نے کی ہے۔۔۔وہ صرف مردوں کے سامنے نہیں بلکہ عورتوں کے سامنے بھی اپنا جسم ڈھانپ کے رکھتی ہیں۔۔۔گامے۔۔۔گواہوں کو میرے سامنے پیش کر۔۔۔(گواہ آتے ہیں)۔۔۔۔۔بتا بشیرے تیری بھابھی۔۔۔مردوں کے ساتھ تنہائی میں جاتی ہے۔

بشیرا: (سر جھکا کر) نہیں

عورت: کیا وہ ایسے کپڑے پہنتی ہے جس پر تمہیں یا کسی اور کو یہ اعتراض ہو۔۔کہ اسے دیکھ کر تم لوگوں کی ہوس بھڑکتی ہو۔

بشیرا: نہیں

عورت: کیا تم نے اس کی کوئی ایسی حرکت دیکھی ہے۔۔۔جسکی وجہ سے تم یہ کر سکو کہ اس نے کسی مرد یا عورت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی ہو۔

بشیرا: (گھبراتے ہوئے) نہیں جی

عورت: نذیرے! تجھے ان تینوں باتوں میں سے کوئی شکایت اپنی بہن سے ہے

نذیرا: نہیں

عورت: شیدے تجھے

شیدا: نہیں جی

عورت: (لمبا سانس کے لر) پھر فحاشی کہاں ہے۔۔۔کیا ہے فحاشی۔۔۔کسے آپ لوگ فحاشی کہتے ہو۔۔۔کیا یہ پنچائیت کسی ایسی عیورت کو سزا دینے کا حق رکھتی ہے۔جس پر یہ الزام ہو۔۔۔کہ وہ اپنے غسلخانے میں درزوں یا روشن دان سے چھپ کر دیکھنے سے برہنہ نظر آتی ہے۔۔۔ارے کچھ کو ہاتھ ڈالو۔۔۔۔

اپنے بند ذہنوں کو کھولنے کی کوشش کرو۔۔۔(چودھری حیرت سے اسے دیکھ رہا ہے مجمع پر خاموشی طاری ہے) میرا جرم صرف اتنا ہے۔۔۔میرا قصور صرف یہ ہے کہ میں عورت کو عزت کی زندگی گزارتے دیکھنا چاہتی ہوں۔۔۔ میں یہ ہرگز ہرگز برداشت نہیں کرسکتی۔۔۔۔کہ مرد اور عورت ایک ہی فعل کے مرتکب ہوں۔۔۔۔لیکن مرد کو تو سورما اور ہیرو تصور کیا جائے۔۔۔اور عوت کو ذلیل اور نیچ اور فاحشہ کہا جائے بس اتنی سی بات تھی چودھری صاحب ۔۔۔میں نے ان عورتوں کو صرف یہ تعلیم دی ہے۔۔۔کہ جب تک مرد میں اتنا حوصلہ پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ساتھ تنہائی میں جانے والی کی عزت کرے۔۔۔۔۔اور جب تک تمہار معاشرہ تنگ نظر ہے۔۔۔اس وقت تک تم ۔۔۔اپنے تخیل کے سہارے اپنی تنہائی کو روشن کرلیا کرو۔۔۔۔۔

بزرگ نمبر3: چودھری صاحب کیا آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ عورت حد سے بڑھ جاتی ہے۔

بزرگ نمبر4: چودھری صاحب اسنے نیا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔۔۔ یہ نئی اور انوکھی ریت ڈال رہی ہے۔۔۔۔ ہمیں اسے اتنی کھلی چھٹی نہیں دینی چاہیئے۔

(مجمعے سے بھی آوازیں آنا شروع ہو جاتی ہیں)

عورت: چودھری صاحب آپ نے مجھے بولنے کی اجازت دی تھی۔

چودھری: (پنچائیت کو ہاتھ کے اشارے سے روکر متفکر لہجے میں) تم بولتی جاؤ۔

عورت: (چودھری سے نظریں چار کرکے) شکریہ۔۔۔۔چودھری صاحب میں نے صرف دو باتیں اور کرنی ہیں ایک تو یہ کہ مجھ پر ایک الزام بار بار لگایا جارہا ہے کہ میں نے کوئی انوکھا کام شروع کیا ہے۔۔۔یہ بات بالکل غلط ہے۔۔میں کوئی نئی ریت نہیں ڈال رہی۔۔۔یہ ریت بہت پرانی ہے۔۔۔۔اتنی پرانی۔۔۔۔کہ جتنی انسان کے متمون معاشرے کی تاریخ پرانی ہے۔۔۔۔۔میرے پاس بہت سے تاریخی شواہد بھی موجود ہیں۔اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ جب ہم کسی کام کے متعلق یہ جان لیں کے یہ ہر دور اور ہر جگہ پر ہوتا رہا ہے تو ہم کسی نہ کسی حد تک اسے جائز سمجھنے لگتے ہیں۔۔۔۔لیکن اس ماحول میں (طنزیہ انداز میں) تاریخی حوالے پیش کرنا ۔۔۔مجھے حماقت اور بیوقوفی لگتا ہے۔۔۔کیونکہ۔۔۔۔۔

چودھری: کیونکہ اسوقت تمہارے سامنے ان پڑھ اور جاہل لوگ ہیں؟

عورت: (سر جھکا کر) جی ہاں

چودھری: (قدرے غصے سے) تم! ہمیں کیا سمجھتی ہو؟

عورت: میری یہ رائے آپ کے بارے میں نہیں ہے۔

چودھری: پھر بولتی جاؤ ہم سن رہے ہیں

عورت: چلیں اسے میری بیوقوفی کہئیے یا کچھ بھی کہ لیجیے میں پنجائیت کے سامنے کچھ تاریخی شواہد پیش کرتی ہوں۔۔۔۔۔تو سنیے بابل اور آشوریہ کے قدیم کھنڈروں میں جو محلات اور مندر دریافت ہوئے ہیں ان پر صبورہ کی تصویریں پائی جاتی ہیں۔ برٹش میوزیم میں قدیم یونانی گلوانوں پر اسکی تصویریں موجود ہیں اس طرح صبورہ کی تاریخ پانچ چھ ہزار قبل مسیح جاتی ہے۔٭لوگ ان باتوں سے بالکل بیزار بیٹھے۔پنچائیت کے بزرگ غور سے سن رہے ہیں لیکن انکے چہرے سے پتہ چلتا ہے کہ جیسے انہیں کچھ سمجھ نہیں آرہی بہرحال چودھری کے چہرے سے پتہ چلتا ہے کہ جیسے وہ کچھ کچھ سمجھ رہا ہے۔عورت چودھری کی طرف متوجہ ہر کر۔۔۔چودھری صاحب! یہ ریت کسی ایک قوم یا ایک ملک تک محدود نہیں تھی۔۔۔ااپ اس کا اندازہ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ تقریباً ہر زبان میں صبورہ کا نام موجود ہے۔ جاپانی میں اسے اپنگی کہا جاتا ہے۔ یونانی میں اسے اولسیوس کہتے تھے۔لاطینی میں اسے فلس (Phallus) اور فرانسیسی میں گادیمیشہ (Godemicha) اور جرمنی میں سمتھانسے (Samthanse) اطالوی میں اسکا نام پاشائمپو (Pashalempa) اور انگریزی میں اسے ڈلڈو (Dildo) ہندوستان میں صبورہ کہا جاتا ہے۔۔۔۔الغرض ہر زبان میں اسکا نام موجود ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ کوئی نئی ریت نہیں ہے۔۔۔۔۔اور آخری بات جو میں کہنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ (باقی تمام لوگ بالکل بے تعلق ہو کر بیٹھے ہیں لیکن چودھری کے چہرے تفکر بہت نمایاں ہو گیا ہے) اصل میں تو میں عورت کی عزت چاہتی ہوں کہ اسے استعمال کے بعد ذلیل اور حقیر نہ سمجھا جائے لیکن گھوم پھر کر اسکا فائدہ آپ مردوں کی طرف ہی جاتا ہے کہ آپکی غیر شادی شدہ بہنیں جنکی شادی غربت یا بدصورتی کی وجہ نہیں ہوئی یا جنہیں تم تم جائداد کی لالچ میں غیر شادی شدہ رکھتے ہوں (چودھری حیرت اور غصے سے اسکی طرف دیکھتا ہے) وہ اپنی خواہش کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی سے چھپ کے تعلق قائم نہیں کرتیں۔۔۔۔۔تمہاری مطلقہ عورتیں اور بیوائیں تم ہی جیسے ہوس پرستوں کا نشانہ بن کر ذلیل و خوار نہیں ہوتیں۔۔۔۔۔انہیں عزت نہیں دے سکتے ہو تو کم از کم ان سے یہ سب تو نہ چھینو۔

یہ سن کر لوگوں کی ہمت جواب دی گئی وہ اٹھ کھڑے ہوئے چودھری کے روکنے کے باوجود،لوگ اسکے غیض و غصب کی پرواہ کیئے بغیر چبوترے پر چڑھ گئے اور عورت کو مارنے پیٹنے لگے۔ چودھری نے اس فاحشہ کو وقتی طور پر بچالیا اور بہانہ یہ کیا کہ پنچائیت کے فیصلے سے پہلے اس پر تشدد کیوں کیا گیا ہے۔۔۔۔۔لہذا جان بوجھ کر فیصلے میں ایک ہفتے کی تاخیر کی گئی۔اتنے عرصے کے لیئے عورت کو چودھری کے عقوبت خانے میں بند کر دیا گیا۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد خبر آئی کہ اس عورت کو پنچائیت کے ارکان کے سامنے الصبح پھانسی دے دی گئی ہے۔پنچایت والے بھی لوگوں کے سامنے قسمیں کھا کر اس خبر کی تصدیق کرتے رہے لیکن لوگوں کو ابھی بھی شک ہے کہ وہ فاحشہ زندہ ہے لیکن وہ مطمئن ضرور ہیں کہ وہ عورت انہیں دوبارہ کبھی دکھائی نہیں دے۔ بہرحال چودھری کی بہنوں کے مزاج اب اتنے کرخت نہیں رہے جتنے پہلے ہوا کرتے تھے۔

احمد زغلول الشیطی
عربی سے اردو ترجمہ:
محمد الیاس ندوی رام پوری (دہلی)

تین ہری چڑیاں

استاد عبدو، ہمارا پڑوسی، جب ملک عراق جانے لگا تو اس نے اپنے بیٹے اسعد کو بلایا، دکان کی چابی اس کے سپرد کی اور عراق کے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔ استاد عبدو کو لکڑی پر کی جانے والی خاص قسم کی نقش ونگاری (اُوَیما ورک) میں مہارت حاصل تھی، وہ بڑی نفاست اور ہنرمندی کے ساتھ نرم لکڑی پر کشیدہ کاری کیا کرتا تھا۔ اس کا بیٹا اسعد لمبے قد کاٹھ کا مالک تھا، اور بال سرخی مائل تھے۔ وہ اپنے والد کی عدم موجودگی میں پابندی کے ساتھ دکان کھولتا اور بند کرتا تھا، مکتب سے واپسی پر سیدھے دکان پر آتا، دکان کھولتا اور دروازے سے لٹکے ہوئے پنجرے میں دو پالتو ہری چڑیوں کو دانہ پانی دیتا، دکان بند کرتا اور اپنے کام سے چلا جاتا۔ شام کو دن ڈھلے پھر واپس آتا، دکان کھولتا، دکان کے سامنے پانی کا چھڑکاؤ کرتا، آرام کرسی نکالتا اور اس پر نیم دراز ہوکر آموختہ دہرانے لگتا۔ استاد عبدو کی عدم موجودگی میں اس کا روزانہ کا یہی معمول تھا اور بظاہر ایسی کوئی بات نظر نہ آتی تھی جو اس کے روزمرہ کے معمول کو متاثر کرنے والی ہو۔

لیکن ایک دن محلے کے لوگوں میں اس کے بارے میں چہ میگویاں شروع ہوگئیں۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ اسعد نے روزانہ کی طرح آج بھی دکان کھولی، دکان کے سامنے چھڑکاؤ کیا، اندر سے آرام کرسی نکالی اور آموختہ دہرانے بیٹھ گیا۔ اسی دوران قریب کے پولس اسٹیشن سے دو لوگ آئے اور اس کے ہاتھ سے کتاب چھین لی۔ اسعد کھڑا ہوا اور ان سے استفسار کرنے لگا کہ وہ اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کیوں کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص نے، جس کا نام مختار تھا اور جو ہمارے محلے میں بلڈوزر کے نام سے جانا جاتا تھا، اسعد کے پیٹ پر ایک زوردار گھونسا جڑ دیا۔ اس سے پہلے کہ اسعد اپنے آپ کو سنبھال پاتا اور معاملے کی نزاکت کو سمجھ پاتا، دیو شکل آدمی نے اس کے چہرے پر تابڑ توڑ کئی گھونسے برسائے اور اسعد تکلیف کی شدت سے دہرا ہوگیا۔

محلے والے ان دونوں آدمیوں کے اردگرد جمع ہوگیے، جو اس وقت اطمینان سے کھڑے سگریٹ کے کش

لے رہے تھے، ان کے سروں سے دھوئیں کے مرغولے بلند ہو رہے تھے۔ جبکہ اسعد ان کے پیروں کے پاس پڑا شدتِ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ بعد میں، سبزی فروش چچا حامد کے بیٹے حماد سبزی فروش نے بتایا کہ وہ بلڈوزر نما آدمی لکڑی کے ایک بڑے سے لٹھے کی طرح دکھائی دے رہا تھا جس میں لگی ہوئی میخیں اکھاڑ دی گئی ہوں اور وہ گرد وغبار کی وجہ سے بھدا اور سیاہ ہوگیا ہو۔ جبکہ دوسرا آدمی جس کو ہمارے محلے کے لوگوں نے پہلی بار دیکھا تھا ایک نوجوان تھا، جو ٹی شرٹ اور پینٹ پہنے ہوئے تھا اور عبدالحلیم حافظ رضی اللہ عنہ کا مشہور گلوکار، جس کا ہیر اسٹائل گزشتہ صدی کی ساتویں اور آٹھویں دہائی میں مصری نوجوانوں میں بہت مقبول ہوا رضی اللہ عنہا طرح بالوں کی مانگ ایک طرف کو نکالے ہوئے تھا۔ حماد نے بتایا کہ وہ محلے کے پولس اسٹیشن میں داروغہ کی حیثیت سے نیا نیا آیا ہے۔

محلے والوں نے پوچھا، وہ مختار پر اپنے ان الفاظ ’’مختار! آخر معاملہ کیا ہے؟‘‘ کے اثرات کے ردعمل کو پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔ مختار رندے کی مانند گرجا اور اسعد کی جانب جھک گیا اور اس کو کالر سے پکڑ کر اٹھایا۔ اسعد کا چہرا کورے کاغذ کی طرح سفید تھا، ’’انسپکٹر مختار! آخر اسعد نے ایسا کیا کیا ہے؟‘‘

انہوں نے مختار کے منہ سے نکلنے والے جھاگ سے اندازہ لگالیا کہ اس کے صاحب، تفتیش کار آفیسر نے اسعد کو طلب کیا ہے۔

مختار نے کوئی جواب نہ دیا اور اپنی راہ چلتا بنا، محلے کے لوگوں کے چہرے تارکول پگھلانے والی ٹرالی کی طرح آگ بگولہ ہو رہے تھے اور اسعد مختار کی گرفت میں دم توڑ رہا تھا۔

محلے کے لوگ اپنی عادت کے مطابق کہ وہ خوشی اور غم کے ہر موقع پر چائے خانوں اور چوراہوں پر جمع ہوجایا کرتے ہیں؛ ’بصل‘ کے چائے خانے، حامد سبزی فروش کے بیٹے حماد سبزی فروش کے کاؤنٹر اور فرنیچر کی دکانوں کے اردگرد پڑی ہوئی کرسیوں اور دکانوں پر اکٹھا ہونا شروع ہوگیے اور ایک دوسرے سے پیش آمدہ صورت حال سے متعلق پوچھ تاچھ کرنے لگے، کہ آخر استاد عبدو جو اپنے کاروبار کی مندی کی وجہ سے عراق چلا گیا ہے اس کے لڑکے اسعد نے ایسا کیا کیا ہے جس کی وجہ سے اس پر یہ افتاد پڑی ہے۔ بالآخر ان کے دکھی اور یاسیت زدہ ذہن اس بات پر متفق ہوگیے کہ اسعد نے ضرور کوئی نہ کوئی حرکت کی ہوگی۔ تاہم حماد سبزی فروش نے تاکیداً وہ بات ان کے گوش گزار کی جو وہ خود بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ اسعد دوشیزاؤں کی طرح شرمیلا تھا، وہ اپنی پالتو چڑیوں کو دانہ پانی دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا تھا اور اپنے والد کی طرح بے ضرر اور خاموش طبع تھا۔

شام کے وقت جب محلے کے لوگ چائے خانے پر جمع ہو رہے تھے، انہیں اس وقت ایک اور دھچکا لگا جب انہوں نے دیکھا کہ مچھلی فروش شہاوی جو بڑے بازار میں مچھلی بیچتا ہے، کا تنومند بیٹا حسونہ ان کی طرف دوڑتا ہوا آیا، اس کے چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا اور اس کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں، اس نے ہانپتے کانپتے بتایا کہ اس نے اپنے گھر کے پچھواڑے سے پولس اسٹیشن کی دیوار پر چڑھ کر دیکھا ہے، اسے اسعد کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں، شاید اس کے تلوؤں پر ڈنڈے برسائے جا رہے تھے۔ شہاوی کے بیٹے نے اتنا کہا اور جدھر سے آیا تھا اسی طرف کو دوڑتا چلا گیا۔

اس خبر سے محلے کے لوگوں کے اضطراب میں مزید اضافہ ہو گیا۔ وہ اپنے سر پیٹنے لگے۔ لیکن جیسے ہی شام ڈھلنے کو آئی، 'بصل' چائے خانے میں حقوں کی گڑگڑاہٹ اور تمباکو کی سوندی سوندی بو چائے خانے کی فضا کو بوجھل بنانے لگی اور محلے کے لوگوں کے ذہن اسعد کے واقعہ سے متعلق جاں گسل اور اضطراب انگیز خیالات سے دھیرے دھیرے باہر آنے لگے، انہیں موچی 'حسن البیسی' اور اس کے ساتھ پیش آنے والا اسی طرح کا واقعہ یاد آیا۔ ہوا یوں تھا کہ حسن البیسی نے اپنے گھر میں کرائم برانچ آفیسر الدسوقی کو بلا کسی عذر کے ایسے اوقات میں آتے جاتے دیکھا تھا جب اس کی بیوی زوبیہ، جو پیشے سے نرس تھی، گھر پر ہی ہوا کرتی تھی، حسن نے اپنی بیوی کو ڈانٹ پلائی اور الدسوقی کو بتایا کہ اس کی بیوی اب انجکشن نہیں لگاتی، لیکن الدسوقی کو تشفی نہیں ہوئی۔ اس لیے، وکیل 'حسین مرجان' نے حسن البیسی کو مشورہ دیا کہ وہ کرائم برانچ کے چیف کے پاس جائے، اس کے جوتے پالش کرے اور الدسوقی کے رویہ کے بارے میں اس سے شکایت کرے۔ یہ واقعہ محلے کے لوگوں میں گردش کرتا رہا اور وہ اپنی اپنی سوچ کے اعتبار سے قیاسات اور اندازے لگاتے رہے، لیکن جب چائے خانے کے مالک 'بصل' نے اس واقعہ کی تائید کی تو ان کے شکوک وشبہات یقین میں بدل گیے۔ کیونکہ بصل پولس اسٹیشن میں مشروبات اور ناشتہ پانی وغیرہ سپلائی کرتا تھا، اور اس لیے اس کو اندر کے تمام حالات کا علم تھا۔ 'حسن' چیف کمشنر کے پاس چلا گیا۔ جبکہ ہم لوگ چاہتے تھے، کاش وہ ایسا نہ کرتا۔

معلوم ہوا کہ کمشنر انچیف نے حسن کی بات توجہ سے سنی، اپنے جوتوں پر گہری نظر ڈالی اور پھر الدسوقی کو بلا کر اس کی سرزنش کی۔

اور بعض ذرائع سے معلوم ہوا کہ کمشنر انچیف نے حسن اور الدسوقی دونوں کی سرزنش کی۔

جبکہ ایسا بھی سنا گیا کہ کمشنر انچیف نے حسن البیسی کے چہرے پر تھوکا اور اس کو بلڈوزر کہا۔

حقیقت تو یہ تھی کہ محلے والوں کو اِن میں سے کسی خبر پر بھی یقین نہیں تھا، بس اتنا تھا کہ وہ رات کے آخری پہر کے سناٹے میں حسن البیسی کی چیخیں سنا کرتے، جو پولس اسٹیشن کی دیواروں سے ٹکراتیں، سیڑھیاں اترتیں، تارکول پگھلاتیں، گھروں کی دیواروں کو پھلانگتیں، ادھر ادھر نکل جاتیں تھیں اور گلی کوچوں میں گرتی پڑتی دوڑتی رہتی تھیں۔ اور ہمارے محلے کے لوگوں کو اس قدر حیران وپریشان کر دیتیں تھیں کہ انہیں کچھ سمجھ نہیں آتا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ اور وہ کیا کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد، مختار بلڈوزر نے حسن البیسی کو اٹھایا اور پولس اسٹیشن کی سیڑھیوں کے باہر کچرے کے ڈھیر کے پاس پھینک دیا تھا۔ جیسے گلے سڑے کپڑے پھینکے جاتے ہیں۔

اس دن سے حسن نے اپنی عادت بنالی تھی کہ وہ نہر کے وسط میں اونچی کرسی پر بیٹھا مچھلیوں کا شکار کرتا رہتا تھا اور جب جب بھی وہ ایسا کرتا ہمارے محلے کے لوگ اس کو ڈوبنے سے بچانے کی فکر میں لگ جاتے۔ پھر جب مچھلیوں کے شکار سے اوب جاتا تو پولس اسٹیشن کے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور کمشنر انچیف اور الدسوقی کو گالیاں بکنا شروع کر دیتا اور وہاں پر موجود لوگوں کو اپنی آپ بیتی کی ساری سرگزشت سناتا.. وہ بتاتا کہ اس نے کل رات

کس طرح ان دونوں کی ماں کے پاس گزاری ہے حالانکہ محلے کے لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ حسن البیسی معمولی چیونٹی کے ساتھ بھی نہیں سو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ کمشنر انچیف اس کی بڑبڑاہٹ سے اکتا گیا اور اپنے کرم چاریوں کو حکم دیا کہ وہ اس کو ذہنی مریضوں کے اسپتال میں داخل کرا دیں۔

ابھی محلے کے لوگ اپنی مشکلات پر قابو پانے کی ہمت جٹا رہے تھے اور حسن البیسی کی آپ بیتی کی تہوں کی پرتیں کھولنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ 'بصل' پولس اسٹیشن سے قابل اعتماد خبر لے کر آیا۔ اس نے بتایا کہ اب سے ٹھیک تین روز پہلے جب ہمارے پڑوسی استاد عبدو کا بیٹا اپنی دکان کے سامنے پانی کا چھڑکاؤ کر رہا تھا تو اچانک پولس کمشنر کی جیپ ادھر سے گزری اور پانی کی چھینٹیں اس کی جیپ پر پڑ گئیں، پولس کمشنر نے اس وقت مناسب نہ سمجھا کہ اسعد کو اس غفلت کی سزا دے، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ ایک اضطراری عمل تھا اور اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن کمشنر کو اس بات پر سخت غصہ چڑھا ہوا تھا کہ وہ اگلے دو تین دنوں کے اندر جب جب بھی اُس راہ سے گزرا، اسعد کو آرام کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے اس طرح بیٹھے ہوئے دیکھا جیسے وہ سلامتی کونسل کا صدر ہے، بس، کمشنر نے اسی وقت فیصلہ لے لیا کہ وہ اسعد کو ضرور سبق سکھائے گا۔

لوگوں نے اپنے ہونٹ کاٹ لیے اور اسعد پر ہونے والے ظلم اور ناانصافی پر گفتگو کرنے لگے۔ ابھی تھوڑا وقت ہی گزرا تھا کہ اسعد لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا آتا دکھائی دیا، اس کے ساتھ بلڈوزر، مختار نہیں تھا۔ وہ گم صم دکھ رہا تھا اور تارکول کی سڑک کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کچھ تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ محلے کے لوگ اس کے گرد جمع ہو گیے مگر اس نے ان سے کوئی بات نہیں کی۔

''اسعد فکر مت کر'' لوگوں نے کہا۔

''ہر کتے کا ایک دن ہوتا ہے''

''ہم نے دکان بند کر دی ہے اور یہ اس کی چابی ہے''

بعد میں لوگوں کو احساس ہوا کہ اسعد اب دوسری دنیا میں پہنچ چکا ہے۔

اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں لوگوں میں گردش کرنے لگیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اس نے حسب معمول دکان کھولی، اپنی دونوں پیاری چڑیوں کو دانہ پانی دیا، آرام کرسی نکالی، کتاب اٹھائی اور بجلی کے کھمبے سے لٹکے ہوئے بلب کی مدہم روشنی میں سبق یاد کرنے بیٹھ گیا۔ پھر کسی وقت اٹھا اور نامعلوم مقام پر چلا گیا۔

یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اسعد نے ''الحناوی'' جو بستی کے غریب لوگوں پر ظلم کرتا تھا اور محلے میں پولس کا رول بھی ادا کرتا تھا، سے چابی لی، اور آبادی کی طرف چلا گیا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محلے والے ایک ایک کر کے وہاں سے کھسکنے لگے اور اپنے اپنے گھروں میں گھس گیے اور اسعد اکیلا کھڑا رہ گیا۔

اسعد روپوش ہو گیا، محلے کے لوگوں نے پھر کبھی اس کو نہیں دیکھا، البتہ دکان صبح تک بھی اسی طرح کھلی ہوئی تھی، اس کے دور کے عزیز واقارب اس کو تلاش کرتے ہوئے آئے مگر انہیں اس کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔

البتہ ایک عجیب وغریب بات جو محلے والوں نے محسوس کی یہ ہوئی کہ پنجرے کی وہ دو چڑیاں جن کو محلے کے بچے جنت کی چڑیاں کہا کرتے تھے، اب ان کی تعداد تین ہوگئی تھی۔ کسی کو بھی یہ پتہ نہ چل سکا کہ تیسری چڑیا کب اور کہاں سے اس پنجرے میں آگئی تھی۔ بس وہ صبح وشام پپیہے کی آواز کی طرح درد بھری آہ سنا کرتے تھے۔ تیز سیٹی کی طرح ایک لمبی سی آہ ہمارے محلے کے صبح وشام کی خاموشیوں میں رچ بس گئی تھی۔ tt

----

احمد زغلول الشیطی

احمد زغلول الشیطی کا شمار عرب کے ان مشہور ادیبوں میں ہوتا ہے جنہوں نے گزشتہ صدی کی آٹھویں دہائی میں قابل قدر اور بلند پایہ ادب کی تخلیق کی۔ قاہرہ میں ۱۹۹۰ء میں جب پہلی بار ان کا ناول ''ورود سامۃ لصقر'' کا اجراء ہوا تو اہل علم وقلم ان کے فن کے معترف ہوئے۔ اس سے قبل ان کی تحریریں مصر کے اعلیٰ معیار کے رسائل وجرائد جیسے 'المساء' 'الاہالی' 'اُدب ونقد' 'القاہرہ' 'الموقف العربی' اور 'الانسان والتطور' وغیرہ میں شائع ہوتی رہی تھیں۔ تاہم ان کو اہل علم وفن کی نگاہ میں جو اعتبار ملا وہ اسی ناول کی اشاعت کے بعد ملا۔ اس کو ''مجلّہ اُدب ونقد'' کی طرف سے ۱۹۹۰ء کا سب سے بہتر ناول قرار دیا گیا۔ اس کے بعد ان کے کئی ناول اور مختصر افسانوں کے مجموعے منظر عام پر آئے اور خوب داد وتحسین حاصل کی۔

احمد زغلول الشیطی ۱۰؍فروری ۱۹۶۱ء کو مصر کے ایک مشہور شہر 'دمیاط' میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے جس خاندان میں آنکھ کھولی اور پرورش پائی اس کے بیشتر افراد لکڑی کے کام سے وابستہ تھے، کچی لکڑی پر نقش ونگاری کا کام جس کو 'اُویما' کے نام سے جانا جاتا ہے اور جس کے لیے یہ شہر کافی مشہور رہا ہے ان کے خاندان کے لوگوں کو خاص دلچسپی تھی۔ ابتدائی اور ثانوی درجات تک کی تعلیم دمیاط میں ہی پائی، پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے قاہر کا رخ کیا اور جامعہ قاہرہ سے ۱۹۸۳ء میں قانون کی ڈگری حاصل کی۔

جب وہ چھ سال کے تھے تبھی ان کے والد کا اس وقت انتقال ہو گیا تھا۔ گرچہ وہ صغر سنی ہی سے لکھنے لگے تھے تاہم ان کے مضامین ۱۹۸۵ء کے بعد جب انہوں نے قانون کی ڈگری مکمل کی اور وکالت کے پیشے سے وابستہ ہوئے تب ہی رسائل ومجلّات میں شائع ہونا شروع ہوئے۔ گزشتہ صدی کی آٹھویں اور نویں دہائی میں جس طرح کا ادب تخلیق کیا جا رہا تھا ان کی تحریریں اُس عام مذاق کی پوری طرح عکاسی کرتی ہیں، گزشتہ صدی کی یہ دو دہائیاں عربی ادب میں جدید لب ولہجے کی ترویج اور جدت پسندانہ نظریات کی توسیع کے لیے خاص طور پر جانی جاتی ہیں۔ تاہم ان کی تحریریں زبان وبیان، الفاظ کے ہنرمندانہ استعمال، اور نغمگی کے لحاظ سے کسی قدر منفرد بھی سمجھی جاتی ہیں۔ عربی ادب کے مشہور قلم کاروں نے ان کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ لیا اور انہیں معاصر قلم کاروں میں انفرادی خصوصیات کا حامل بتایا۔

اقبال حسن آزاد (مونگیر)

بریکنگ نیوز

ٹی۔ وی اسکرین پر اچانک ایک تحریر اُبھری۔

بریکنگ نیوز۔۔۔ مہیلا کے ساتھ بلاتکار

بریکنگ نیوز۔۔۔ مہیلا کا سموہک بلاتکار

بریکنگ نیوز۔۔۔ استری پور کی گھٹنا

بریکنگ نیوز۔۔۔ پبلک پارک میں مہیلا کا سموہک بلاتکار

بریکنگ نیوز۔۔۔ بلاتکار کی کریا جاری

حسین وجمیل نیوز ریڈر نے اپنی بڑی ذہین آنکھوں سے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ابھی ابھی سماچار ملا ہے کہ پبلک پارک میں ایک مہیلا کے ساتھ بلاتکار ہو رہا ہے۔ آیئے ہم آپ کو سیدھے پرسارن کے لیے گھٹنا استھل پر لیے چلتے ہیں۔''

منظر بدلتا ہے۔ ٹی۔ وی اسکرین کے پیچھے دیوار پر ایک بڑا اسکرین اُبھرتا ہے۔ سامنے ایک پارک ہے۔ پارک میں بڑی بھیڑ ہے۔ لوگ ایک دائرے میں کھڑے ہیں اور گردنیں اُچکا اُچکا کر کچھ دیکھ رہے ہیں۔ پھر ہاتھ میں مائک لیے ایک سنواد داتا اسکرین کے سامنے آتا ہے۔

''سمار چار چینل پر آپ سبھوں کا سواگت ہے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے اس سمے اس جگہ بلاتکار کی گھٹنا گھٹ رہی ہے۔ آپ دیکھ رہے کہ اس وقت دن کے تین بجے ہیں۔ موسم بہت سہانا ہے۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈ ہے۔ سورج چمک رہا ہے۔ ہر طرف دھوپ کھلی ہے اور بہت سارے لوگ اس دھوپ کا آنند لینے کے لیے اس پارک میں اکھٹے ہوئے ہیں اور اس دن کے اجالے میں بلاتکار کی گھٹنا گھٹ رہی ہے جو بہت ہی شرمناک ہے۔ آیئے ہم آپ کو ذرا نزدیک سے اس گھٹنا کو ہوتے ہوئے دکھاتے ہیں۔''

کیمرہ آگے بڑھتا ہے اور بھیڑ کو چیرتے ہوئے اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں ایک عورت کی آبروریزی ہو رہی ہے۔ چند ثانیوں تک اس منظر کو دکھانے کے بعد کیمرہ پھر سنواد داتا کے چہرے پر مرکوز ہو جاتا ہے۔ سنواد داتا تیز تیز آواز میں بول رہا ہے۔

’’آپ دیکھ رہے ہیں کہ ابھی بھی اس مہیلا کا بلاتکار ہو رہا ہے۔دو بلاتکاری بلاتکار کر چکنے کے بعد ادھر گھاس پر آرام سے لیٹے ہیں۔تیسرا ویکتی ابھی ویئست ہے اور کم سے کم دو آدمی اور اپنی باری کے انتظار میں کھڑے ہیں۔آیئے! ہم آپ کی ملاقات ان بلاتکاریوں سے کرواتے ہیں۔‘‘

کیمرہ آگے بڑھتا ہے اور گھاس پر آرام فرماتے ہوئے بلاتکاریوں پر مرکوز ہو جاتا ہے۔اپنے آپ کو کیمرے کے سامنے دیکھ کر دونوں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔سنوادداتا ایک بلاتکاری سے پوچھتا ہے۔

’’کیا آپ لوگوں نے ابھی اس مہیلا کے ساتھ بلاتکار کیا ہے؟‘‘

’’جی ہاں!‘‘ دونوں نے ایک ساتھ اطمینان کے ساتھ جواب دیا۔

’’آپ کو پتہ ہے کہ بلاتکار کرنا ایک جرم ہے جس کے لیے آپ لوگوں کو کم سے کم سات سال کی سزا ہو سکتی ہے۔‘‘

’’جی! ہمیں معلوم ہے۔‘‘ ان کے لہجے سے اب بھی اطمینان جھلک رہا تھا۔

’’آپ کو ڈر نہیں لگتا؟‘‘

’’کس کا ڈر؟‘‘ ان میں سے ایک نے حیرت سے پوچھا۔

’’قانون کا ڈر اور کس کا۔‘‘

’’قانون؟ قانون کیا ہوتا ہے؟‘‘ اس نے استہزائیہ انداز میں کہا۔پھر دونوں مل کر ہنسنے لگتے ہیں۔سنوادداتا پھر ناظرین کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔

’’جیسا کہ ابھی آپ نے سنا ان بلاتکاریوں کو قانون کا کوئی ڈر نہیں۔آیئے! اب ہم اس پورے گھٹنا کرم پر ایک پری چرچا میں بھاگ لینے کے لیے آپ کو پھر سے اسٹوڈ لیے چلتے ہیں۔‘‘

ٹی۔وی۔اسکرین پر پھر منظر بدلتا ہے۔گول میز کے گرد اینکر کے ساتھ چار لوگ بیٹھے ہیں، دو مرد اور دو عورتیں۔اینکر ناظرین سے ان کا تعارف کراتی ہے۔

’’یہ شری جگدمبا پرساد جی ہیں۔یونیورسٹی میں سوشل سائنس کے پروفیسر ہیں۔سماج پر ان کی گہری نظر ہے۔ان کی کئی کتابیں پرکاشت ہو چکی ہیں اور ان کے بہوملیہ لیکھ ورشٹ پتریکاؤں میں پرکاشت ہوتے رہے ہیں۔‘‘

بھولے بھالے چہرے والے شخص نے اپنے چہرے پر ایک فرمائشی مسکراہٹ سجائی اور دھیرے سے سر کو خم کیا۔اینکر نے دوسرے شخص کی جانب اشارہ کیا۔

’’شری ستیش بھٹناگر..... ہائی کورٹ کے سینئر ایڈووکیٹ۔ بلاتکار کے کیسز لیتے ہیں اور دوشیوں کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچاتے ہیں۔‘‘

گنجے سر اور موٹی ناک والے سانولے شخص نے اپنے دانتوں کی نمائش کی اور دبیز چشمے کے نیچے سے

اس کی شاطر آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔‘‘ پھر اینکر نے داہنے جانب بیٹھی ہوئی ٹھسّے دار عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔

’’ڈاکٹر شالنی سنہا..... بلاتکار کے کیسز کی جانچ کرتی ہیں۔اور اس کام میں ان سے زیادہ انوبھوی ڈاکٹر شاید ہی کوئی اس شہر میں ہو۔‘‘

لیڈی ڈاکٹر شالنی سنہا نے سلیولیس بلاؤز اور ریشمی ساری زیب تن کر رکھی تھی۔آنکھوں پر نازک سی فریم کی عینک تھی۔بلاؤز سے ان کا بھرپور سینہ اُبلا پڑ رہا تھا۔ڈاکٹر شالنی سنہا نے آنکھوں کی جنبش سے اینکر کی بات کی تائید کی۔آخر میں اینکر دوسری عورت کی جانب مڑی اور تھل تھل بدن والی ادھیڑ عمر کی معمولی شکل وصورت کی عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

’’شریمتی آبھا پرساد..... مشہور سماج سیویکا۔اناتھ اور بے سہارا لڑکیوں کا سہارا۔‘‘ شریمتی آبھا پرساد نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سبھوں کو پرنام کیا۔اینکر پھر گویا ہوئی۔

’’جیسا کہ آپ سبھوں نے ابھی ابھی دیکھا کہ دن دہاڑے اتنے سارے آدمیوں کے بیچ ایک بے بس اکیلی مہیلا کے ساتھ بلاتکار ہو رہا ہے۔اتنا ہی نہیں بلکہ بلاتکاریوں کو قانون کا بھی کوئی ڈر نہیں۔اس سلسلے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے۔‘‘ وہ پروفیسر سے مخاطب ہو کر بولی۔اس کی بات سن کر پروفیسر اپنی کرسی پر سیدھے ہو کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔

’’بلاتکار ایک سماجک برائی ہے اور یہ آج سے نہیں بلکہ جب سے دنیا بنی ہے تب سے اس پرکار کی گھٹنائیں ہوتی رہی ہیں..........‘‘ اینکر نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

’’وہ ٹھیک ہے لیکن آج کل اس پرکار کی گھٹنائیں کچھ ادھک ہی ہونے لگی ہیں۔‘‘

’’ہاں اور اس کا کارن سماجک بدلاؤ ہے۔آج ہر چھیتر میں بدلاؤ آرہا ہے۔پہلے لوگوں کے پاس پیسہ کم تھا۔سادھن کم تھے اس لیے اس پرکار کی گھٹنائیں بھی کم ہوتی تھیں۔سماج جیسے جیسے سمپن ہوتا جاتا ہے، سکھ سویدھائیں بڑھتی جاتی ہیں ویسے ویسے بھوگ ولاس بھی بڑھتا جاتا ہے۔‘‘ سماج سیویکا ان کی بات سن کر کسمائی اور پھر یوں گویا ہوئی۔

’’عورتوں کو تو سدا سے ہی بھوگ ولاس کی وستو سمجھا گیا۔عورت تو اسے کسی نے سمجھا ہی نہیں۔‘‘

اس کی بات سن کر وکیل بول پڑا۔

’’مگر اس میں خود عورتوں کا بھی دوش ہے۔اب دیکھئے جس عورت کا بلاتکار ہو رہا ہے، پتہ نہیں آپ لوگوں نے دھیان سے دیکھا کہ نہیں، اس نے فلمی ہروئنوں کی طرح میک اپ کر رکھا ہے اور بہت کم کپڑے پہن رکھے تھے۔اتنے کم کہ اس کے شریر کا انگ انگ جھلک رہا تھا۔اب ایسے میں اگر اس کا بلاتکار ہوتا ہے تو اسے کوئی

انہونی یا بڑی بات نہیں کہا جائے گا۔‘‘

وکیل کی بات سن کر لیڈی ڈاکٹر ذرا سٹپٹا گئی اور اس نے فوراً اپنے سینے پر سے ڈھلکتی جا رہی ساری کو درست کیا۔ اینکر اس کی جانب مڑی۔

’’ڈاکٹر! اس وشے پر آپ کی کیا رائے ہے؟‘‘

لیڈی ڈاکٹر ہلکے سے کھنکھاری اور پھر اپنی قلقل مینا جیسی آواز میں کہنے لگی۔

’’آپ لوگوں نے جو کچھ بھی کہا وہ سب اپنی اپنی جگہ صحیح ہے یہ بھی صحیح ہے کہ اس پرکار کی گھٹنائیں آدی کال سے ہوتی آ رہی ہیں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ آجکل اس پرکار کی گھٹنائیں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اور اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مردوں نے سدا سے عورتوں کو سمبھوگ کی سامگری سمجھا لیکن آج کے یگ میں یہ کہنا غلط ہوگا کہ عورتیں گھر کے اندر رہیں اور باہر نکلیں تو پرانی ویش بھوشا میں نکلیں۔ آج دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ عورتیں مردوں کے کاندھے سے کاندھا ملا کر جیون کے ہر چھیتر میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ اس پرکار کی گھٹناؤں کو روکنے کے لیے سرکار اور پرساشن کو کڑے قدم اٹھانے ہوں گے تبھی اس پرکار کی گھٹناؤں کو روکا جا سکتا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر کی بات ختم ہوتے ہی اینکر سبھوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

اب سمے ہے ایک چھوٹے سے بریک کا۔ بریک کے بعد ہم پھر ملیں گے۔ دیکھتے رہیے سماچار چینل۔‘‘

ٹی وی اسکرین پر کنڈوم کا اشتہار دکھایا جا رہا ہے۔ پھر کئی اور طرح کے اشتہار آتے ہیں۔ اشتہارات ختم ہونے کے بعد caption آتا ہے۔

تازہ خبر

مہیلا کے ساتھ بلاتکار۔۔۔ مہیلا کے ساتھ سموہک بلاتکار

پبلک پارک میں مہیلا کے ساتھ بلاتکار۔۔۔ بلاتکار کی کریا سمپنیہ

اس کے بعد چند اور اشتہارات دکھائے جاتے ہیں۔ اشتہارات ختم ہونے کے بعد پھر اسٹوڈیو کا منظر سامنے آتا ہے۔ اینکر کہتی ہے۔ ’’سماچار چینل پر آپ سبھوں کا پھر سے سواگت ہے۔ تازہ استھتی کی جانکاری کے لیے ہم آپ کو پھر سے گھٹنا استھل پر لیے چلتے ہیں۔‘‘

اسکرین پر پھر پارک کا منظر اُبھرتا ہے۔ بھیڑ اب بھی موجود ہے۔ جس عورت کی عصمت دری ہو رہی تھی وہ زمین پر چِت پڑی ہے۔ اس کے کپڑے تتر بتر ہو رہے ہیں۔ آنکھیں بند ہیں اور سانس تیز تیز چل رہی ہے۔ ہاتھ میں مائک لیے ہوئے اینکر سامنے آتا ہے۔

"welcome back"، جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں بلاتکار کی کریا پوری ہو چکی ہے اور سارے بلاتکاری اپنا کام کر کے یہاں سے جا چکے ہیں۔ لیکن کچھ درشک ابھی بھی یہاں کھڑے ہیں۔ دور دور تک کوئی پولس والا

دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ کیول پارک کی دیکھ بھال کرنے والا مالی سامنے کھڑا ہے۔ مگر وہ بھی مُک درشک کی طرح اس پوری گھٹنا کو دیکھتا رہا تھا۔ آیئے اس مالی سے بات کرتے ہیں۔‘‘

مالی نے گمچھے سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھا اور کیمرے کو اپنے رخ پر دیکھ کر ذرا سنبھلا۔ سنوادداتا نے پوچھا۔

’’یہ بتایئے آپ اس پارک کی دیکھ بھال کب سے کر رہے ہیں؟‘‘

’’بہت روج ہو گیا۔ کوئی بیس برس تو ہوا ہی ہوگا۔‘‘

’’اچھا یہ بتایئے کہ اس پرکار کی گھٹنا پہلے بھی کبھی ہوئی تھی؟‘‘

’’نہیں جی! البتہ سانجھ ہونے پر بہتّے عورت مرد آتے ہیں اور جہاں تہاں یہی کھیلا کھیلتے ہیں۔‘‘

’’اس پر کسی طرح کی کوئی روک نہیں ہے کیا؟‘‘

’’کون روکے گا؟ سب اپنی مرجی کے مالک ہیں۔ اور پھر کونو جور جبردستی تھوڑے ہی ہے۔ جس کی سادی نہیں ہوئی ہے یا جس کی جورو بدماس ہے یا میکے میں ہے یا پھر جورنڈوے ہو گئے ہیں، سبھی آتے ہیں۔ پیسہ کھرچ کرتے ہیں اور مجا لیتے ہیں۔‘‘

’’آپ نے کبھی اس کی شکایت نہیں کی؟‘‘ سنوادداتا کی بات سن کر مالی نے دانت نکوس دیے۔

’’کیسن بات کرتے ہیں حجور! اپنی آمدنی پر اپنے ہی لات مار دوں؟‘‘

سنوادداتا نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر ناظرین سے مخاطب ہو کر بولا۔

’’آیئے! اب ہم آپ کو اس پیڑت مہیلا سے ملواتے ہیں۔‘‘ پھر وہ مائک لیے ہوئے زمین پر بے سدھ پڑی ہوئی عورت کے پاس جاتا ہے اور زمین پر اکڑوں بیٹھ کر مائک اس کے منھ سے سٹا کر پوچھتا ہے۔

’’آپ کا شبھ نام؟‘‘ عورت کے منھ سے گھٹی گھٹی ناقابل فہم سی آوازیں نکلتی ہیں۔ سنوادداتا اس سے پھر پوچھتا ہے۔ ’’کیا آپ ہمارے درشکوں کو یہ بتانا پسند کریں گی کہ کیا اس سے پہلے بھی کبھی آپ کے ساتھ اس پرکار کی درگھٹنا گھٹی تھی؟‘‘ عورت کے منھ سے ہلکی سی کراہ نکلی اور اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

’’کیا آپ کو بہت درد ہو رہا ہے؟‘‘ عورت کے منھ سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

’’اوں! اوں!!‘‘

’’اچھا اب آپ آرام کیجیے۔ ہم آپ سے پھر بات کریں گے۔‘‘ پھر وہ ناظرین سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

’’جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں پیڑت مہیلا ابھی کچھ بھی کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ چلیے! ہم آپ کو اسٹوڈیو واپس لیے چلتے ہیں۔‘‘

سماچار چینل پر سماچار سماپت ہو چکے ہیں اور ایک قاتل ادا حسینہ بکنی کا اشتہار پیش کر رہی ہے۔

☆☆☆

طالب کشمیری (جموں)

آسودگی

تیس برس قبل جب کیلاش پتی نے شہر کے ایک نواحی علاقے منجھ پٹی میں سات مرلے قطعۂ اراضی مقامی کسان مولراج سے چودہ ہزار روپے میں خریدی تھی تو اسکے وہم وگمان میں نہ تھا کہ ان تین دہائیوں کے اندر ہی اسی زمین کی قیمت تقریباً سو گُنا بڑھ جائیگی۔ وہ کبھی کبھی یہ سوچ کے دھنگ رہ جاتا کہ زمین کی قیمتوں میں اُچھال اور انسانی اقدار میں گراوٹ کا عمل شاید ایک ہی تناسب سے ہو رہا تھا کیونکہ تیس برس پہلے اسکے محلے میں اگر کسی کی وفات ہوجاتی تو کم سے کم پانچ چھ سو لوگ مرحوم کی ارتھی میں شامل ہوا کرتے تھے اور اگر آجکل کوئی انتقال کر جاتا ہے تو بمشکل پانچ چھ اشخاص ہی آخری سنسکار کیلئے شمشان بھومی تک متوفی کے لواحقین کا ساتھ دے پاتے ہیں۔ خیر موجودہ دَور میں زمین و دیگر غیر منقولہ املاک کی قیمتیں تو آسمان کو چھو ہی چکی تھیں، پر کیلاش پتی تیس برس قبل بھی زمین کا یہ چھوٹا سا ٹکڑا خریدنے کے اہل نہ ہوتا اگر مولراج کو اسکے والد اوما پتی نے اپنی حیاتی کے دوران بِنا کسی سود کے اور آسان قسطوں میں واپس کرنے کیلئے اسے اسکی بیٹی کی شادی پر دس ہزار روپے اُدھار نہ دیئے ہوتے۔ مولراج کی بیٹی کے بیاہ کو چار سال بیت گئے اور وہ دو بچوں کی ماں بھی بن گئی، اور اس دوران اوما پتی بھی سرگباش ہوگئے، پھر بھی وہ بیچارہ اس قابل نہ ہو سکا کہ قرضے کی رقم اوما پتی کے فرزند کو لوٹائے۔ گرچہ کیلاش پتی نے سرکاری اسکول میں ایک مدرس ہونے کے ناطے اپنی محدود آمدنی کے باوجود بھولے سے بھی کبھی مولراج سے پیسوں کا تقاضا نہیں کِیا، لیکن پھر بھی جب کبھی وہ کہیں ملتے تو مولراج خود ہی ایک عجیب قسم کی شرمندگی سی محسوس کر لیتا تھا۔ ایک روز جب انکی ملاقات اتفاقاً کہیں ہوئی تو محض باتوں باتوں میں کسی مخصوص نیّت سے نہیں کیلاش پتی نے مولراج سے کہا کہ شہر میں انکے پشتینی مکان میں انہیں اور انکے افرادِ خانہ کو جگہ کی کمی کے باعث زبردست مشکلات پیش آرہے ہیں تو مولراج نے اپنی منجھ پٹی والی زمین میں سے کچھ حصہ اسے دینے کی پیشکش کی۔ لیکن کیلاش پتی نے اس بِنا پر اسکی پیشکش پر کوئی خاص توجہ نہیں دی کہ شہر سے دور اس نواحی بیابان علاقے میں زمین کا وہ ٹکڑا لے کر کیا کریگا۔ لیکن بالاخر یہ سوچکر کہ مولراج انکا قرضہ چکانے کی حالت میں کبھی آ ہی نہیں سکتا اور اپنی پتنی سوشیلا سے صلاح مشورہ کر کے کیلاش پتی نے اپنی ذاتی بچت میں سے چار ہزار کی رقم مِلا کے چودہ ہزار میں زمین کا وہ ٹکڑا حاصل کرلیا۔ اس موقعہ پر مولراج نے کیلاش پتی کو پورا ایک کنال یعنی بیس مرلے اراضی دینے کی پیشکش کی تھی لیکن اسنے دو وجوہات کے باعث نا کردی۔ ایک تو یہ کہ اسکے پاس اتنی رقم دستیاب ہی نہ تھی گرچہ اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار کر وہ دس بارہ ہزار روپے جُٹا کر مزید پانچ چھ مرلے زمین لے بھی سکتا تھا۔ دوسری وجہ تھی کچھ خدشات

اور غیر یقینیت کہ شہر سے بارہ تیرہ کِلومیٹر کی دوری پر جہاں مشکل سے کہیں کوئی آبادی نظر آتی تھی کون ایسا بیوقوف ہوگا جو زمین خرید کر پیسہ پانی میں بہا دیگا۔ چنانچہ اسنے مجبوری کے تحت لی گئی سات مرلے زمین پر ہی اکتفا کیا اور بات یوں ہی ختم ہوگئی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شہر غبارے کی مانند پھولتا اور پھیلتا گیا اور اس سرعت کے ساتھ کہ بیس پچیس برس کے قلیل عرصے میں ہی بارہ کیا پندرہ کلومیٹر تک لوگ بستیاں بساتے گئے۔ لوگوں پر جیسے زمین کے پلاٹ خریدنے اور ان پر عالیشان مکان بنوانے کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ پراپرٹی ڈیلر ایسے پھیل گئے جیسے سرکنڈے کا گھاس.... جہاں کہیں بھی دیکھو پراپرٹی ڈیلر کی دکان مانو پراپرٹی ڈیلر نہیں پنساریوں کی دکان ہو، بلکہ تعداد میں ان سے بھی کہیں زیادہ۔ جو کوئی بھی کسی سے ملتا تو گفتگو کا محور زمین اور مکان کے سِوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ چھوٹے بڑے نئے نگر، نئی بستیاں اتنی جلدی وجود میں آگئیں جتنی جلدی سر کے اوپر بال۔ تمام دیوی دیوتاؤں کے نام پر نگر بستے گئے......... ہری نگر، لکھشمی نگر، کرشنا نگر، شِونگر، شکھتی نگر، اوما نگر، درگا نگر، سرسوتی وہار، نرائن وہار، مہیش وہار، کیشو پُرم، جوالا پُرم اور سیاست میں دلچسپی رکھنے والوں نے سیاسی رہنماؤں پر نئے نگروں کا نام کرن کرنا زیادہ مناسب سمجھا جسکے نتیجے میں گاندھی نگر، جواہر نگر، موتی نگر، کملا نگر، اندرا نگر، راجیو نگر، سنجے نگر، سبھاش نگر، پٹیل نگر، شاستری نگر، دین دیال نگر، آزاد نگر، ہیڈگیور پُرم، قاسم آباد وغیرہ بستیوں کا جنم ہوا۔ ریاستی سطح کے رہنماؤں کے نام پر بھی نئی بستیوں کو نام دینے کا چلن شروع ہوا لیکن میونسپل کارپوریشن کے اراکین کے ناموں کا استعمال محض چند ایک سڑکوں اور چھوٹی موٹی گلیوں تک ہی محدود رہا۔ جب نئی بستیوں کے بننے کی رفتار انہیں نام دینے کی رفتار کو پیچھے چھوڑنے لگی تو کئی نام دو یا تین بار دہرائے گئے جو ڈاکخانے کے ملازمین کیلئے اچھا خاصا دردِ سر ثابت ہوا جسکا حل کچھ دانشوروں نے ایسے نکالا کہ جو کوئی بھی شخص کسی جگہ پہلا مکان بنالیتا تو وہ خود اپنے یا اپنے سرگباشی ماتا پِتا کے نام پر اس جگہ کا نام کرن کر لیتا۔ اسطرح نئی بستیوں کو نیا نام دینے کا دائرہ اتنا وسیع ہوگیا کہ ہر گلی میں واقع تیس چالیس مکانوں کے جھرمٹ کو ایک نئے نگر کا نام مِل گیا۔

بیس سال قبل کیلاش پتی نے اپنے ضمیر کی مزاحمت کے باوجود صرف اپنے بال بچوں کے اس مسلسل تنقید کے سبب کہ پرانے گھر میں رہنے کیلئے کافی جگہ ہی نہیں تھی (اور انکا وایلا بہت حد تک درست بھی تھا) بے شک دور ہی سہی اُس ویران منجھ پٹی کی زمین پر دو بیڈروم والا اوسط درجے کا گھر بنوا ہی لِیا جہاں آس پاس سارے گاؤں کی بھینسوں کو کھلے میدان میں گھاس چرایا جاتا تھا اور گرمیوں کے موسم میں وہ سبھی چوپائے ساتھ والے تالاب میں سر اوپر کِئے سارے جسم کو گندے پانی میں ڈبو کر خود کو آفتاب کی جھلسانے والی گرمی سے محفوظ رکھتے تھے۔ لیکن اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود کیلاش پتی خود کو اپنے ہی گھر والوں کے ان تیکھے طعنوں سے محفوظ نہ رکھ سکا کہ 'پاپا ہمیں کس جہنم میں لے آئے...... نہ بس کی سہولیت ہے نہ بازار کی' وغیرہ وغیرہ۔ دو برس بعد شاید ایسی ہی مشکلات سے دو چار دو اور گھر منجھ پٹی میں بسنے کیلئے آگئے جس پر کیلاش پتی اور اسکے خاندان کو اپنی اس بستی کو اچھا سا نام دینے کی ضرورت محسوس ہوئی اور انکے بچوں نے انکی منظوری سے ہی ایک شام بڑے نیم کے پیڑ پر ''کیلاش دھام'' کی

چھوٹی سی تختی لٹکا کر رسمی طور بستی کا نام کرن کِیا۔

ایک دن شہر کے ایک مالدار اور بارسوخ بیولڈر کی نظر منجھ پٹی پر پڑ گئی۔ پھر کیا تھا........اس نے چند سیاست دانوں کے ساتھ اثر و رسوخ کو استعمال کر کے منجھ پٹی اور اسے ملحق ساری زمین کسانوں سے کوڑیوں کے بھاؤ خریدی اور محکمہ مال کے افسران سے ساز و باز کر کے سرکاری گھاس چرائی، نزول وغیرہ کی اراضی پر بھی قبضہ جما کر پلاٹ بندی کرادی اور پھر وہی پلاٹ بیس پچیس گُنا من مانے قیمت پر بیچ ڈالے۔ صرف مولراج اور برج نرائن ہی ایسے اشخاص تھے جنہوں نے بیولڈر کی پینترے بازی خوب سمجھ کر زبردست دباؤ کے باوجود اپنی زمین اچھی خاصی قیمت پر ہی بیچ ڈالی اور بستی میں ہی اپنے لئے دو بنگلے تعمیر کِئے۔ چار پانچ سال کی قلیل مدت میں ہی وہاں ایک نئی ماڈرن قسم کی کالونی وجود میں آ گئی جس میں عالیشان بنگلوں اور کوٹھیوں کے علاوہ چوڑی سڑکیں، آنکھوں کو چندھیانے والی اسٹریٹ لائٹس، کچھ کھُلی پارکیں اور چند ایک شاپنگ کمپلیکس باعثِ کشش تھے۔ ہر ایک کوٹھی کے پورچ میں دو تین اعلیٰ ماڈل کی کاریں اور کوٹھی کے سامنے سڑک پر مزید ایک دو قیمتی گاڑیاں پارک کی گئی ہوتیں۔ ''کیلاش دھام'' میں اب سبھی کچھ جنت جیسا لگ رہا تھا ماسوائے کیلاش پتی کے گھر کے۔ ایک وہی مکان تھا جو ساری کالونی کی خوبصورتی پر ایک سیاہ دھبہ سا لگ رہا تھا۔ ایک اکیلا یک منزلہ پرانا مکان، نہ کہیں پلاسٹر نہ رنگ نہ روغن، جگہ جگہ اینٹیں اور ٹائلیں اُکھڑی ہوئی، دیواریں معتدد مقامات پر منہدم، مانو ساری کی ساری تعمیر قبرستان کے بیچ کھنڈر کا سا منظر پیش کر رہی تھی۔ لیکن ان سب کے باوجود بستی کا نام ''کیلاش دھام'' ہی رہا، شاید اسلئے کہ کسی کو بھی اسے تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

کیلاش پتی اور اسکی پتنی پانچ بچوں کے دادا، دادی بھی بن گئے، اسلئے انکے گھر میں اچھا خاصا شور شرابہ بھی ہوا کرتا تھا جو کہ انکے اڑوس پڑوس میں رہ رہے 'مہذب' لوگوں جیسے کہ مہاجن مرچنٹس، گپتا گارمنٹس، بخشی بردرس، سیف اللہ سنز، لامبا لمیٹڈ، کمار کمپنی، کمیشنر کوٹوال، ڈائرکٹر ڈیسوزا وغیرہ کو کافی ناگوار گذرتا تھا۔ جب کبھی کوئی 'سفید پوش' مہمان انکے گھر آتا تھا تو وہ اس بات کا تذکرہ ضرور کرتا......کوئی خوبصورت الفاظ میں......'بھئی مِسز گپتا کچھ بھی ہو، آپکے پڑوس میں اچھی خاصی رونق ہوا کرتی ہے'...... یا پھر......'لامبا صاحب، پڑوسی ہوں تو ایسے جیسے کالونی نہیں مچھلی مارکیٹ ہو'......اور ایک حضرت تو یہاں تک فرما گئے.........'معاف کیجئے بخشی صاحب، آپکو رہنے کیلئے اس جہنم سے بہتر جگہ نہیں مِل سکی کیا؟'......اور پھر کیلاش پتی کے گھر کی اور اشارہ کرتے ہوئے بولے......''آپ اس غلاظت کو چند فالتو سکے دیکر دور کیوں نہیں پھینکتے؟'' جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بلدیوراج بخشی نے تنگ آ کر ایک دن کیلاش پتی سے کہہ ہی ڈالا ''دیکھئے کیلاش جی، آپ بزرگ ہیں اسلئے ہم سبھی یعنی اس کالونی کے لوگ آپکی بہت عزت کرتے ہیں اور وہ بھی اس حد تک کہ اب تک اس جگہ کا نام آپکے ہی نام پر چلتا آیا ہے اور کئی اشخاص نے جب اسے تبدیل کرنے کی کوشش کی تو میں نے مخالفت ہی نہیں بلکہ مزاحمت بھی کی۔ آپ ایک استاد رہ چکے ہیں اور سماج کے افراد کو اچھی تعلیم فراہم کرنے میں بھی آپکا قابل تعریف رول رہا ہے، اسلئے کوئی بات آپکو سمجھانا سورج کو چراغ دکھانے کے برابر ہے........ ہے کہ نہیں؟''

''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں.......یہ تو آپکی ذرہ نوازی ہے، نہیں تو میں کس لائق ہوں۔ کہئے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں،'' کیلاش پتی نے بخشی صاحب کے میٹھے کلام سے متاثر ہو کے پوچھا۔

''دیکھئے کیلاش صاحب، میرے سامنے ایک بڑی مشکل آن پڑی ہے۔ میری بیٹی شہر میں رہتی ہے جہاں انکا اچھا خاصا مکان بھی ہے لیکن میرے داماد کو جو محکمۂ تعمیراتِ عامہ میں بطور سینئیر انجینئیر کام کر رہے ہیں سرکاری ڈیوٹی کے سلسلے میں اکثر گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے اور میری بیٹی بھی ڈاکٹر ہے۔ پچھلے برس جب تک اسکی ساس زندہ تھی ہمیں کوئی دقت نہ تھی، پر اسکے پرلوک سدھارنے کے بعد بچوں کی دیکھ بال کرنے کی سمسیا آن پڑی ہے اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں نوکرانیوں یا آیاؤں پر اس معاملے میں مکمل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہے......... اگر آپ چاہیں تو ہماری مدد کر سکتے ہیں۔'' بخشی صاحب نے کہا۔

کیلاش پتی نے تعجب سے پوچھا ''بھلا میں کیا مدد کر سکتا ہوں آپ کی؟''

''دیکھئے میں جو کہوں آپ اسکا بُرا نہیں منانا۔ ہم اپنی بیٹی کیلئے اپنے اس گھر کے ساتھ ہی دو کمرے بنانا چاہتے ہیں، لیکن ہمارے پاس جگہ کی گنجائش ہی نہیں.......اسلئے ہم چاہتے ہیں کہ ہم آپکے پلاٹ پر........آپ سمجھ گئے نا........ہم آپکو منہہ مانگی قیمت دینے کو تیار ہیں، جسے آپ کہیں بھی اپنے لئے اچھا سا مکان تعمیر کرا سکتے ہیں........دیکھئے یہ کوئی مجبوری نہیں، بس ایک گزارش ہے۔ آپ اپنی دھرم پتنی اور بچوں سے صلاح مشورہ کر کے اپنے فیصلے سے آگاہ کیجئے تو آپکی مہربانی ہوگی،'' بلدیوراج نے ایسی سنجیدہ بات اتنی آسانی سے کہہ دی کہ کیلاش پتی ہکا بکا سا رہ گیا اور وہ سمجھ گیا کہ بخشی صاحب جس نے کبھی اسے نمستے کرنی بھی گوارا نہ کی تھی آج اسکی تعریفوں کے پُل کیوں باندھ رہے ہیں۔ گھر پہنچ کر جب کیلاش پتی نے اسکا تذکرہ اپنی اہلیہ اور بیٹے بہوؤں سے کِیا تو وہ بوکھلا اُٹھے اور تجویز کو سرے سے ہی مسترد کر دیا یہ کہہ کر کہ بھلا جس کالونی کی بنیاد ہی جنہوں نے ڈالی وہ کیوں وہاں سے چلے جائیں گے۔ چنانچہ دو تین دن بعد بخشی صاحب خود انکے گھر تشریف لائے اور صحن میں ہی کھڑے کھڑے کیلاش پتی کی جانب سے انکار سن کر انہیں پھر سمجھانے لگے، ''دیکھئے کیلاش جی، آپ سیانے ہیں.......... سمجھدار ہیں۔ دانا لوگوں کا کہنا ہے کہ رہنے کیلئے گھر برابر والوں کے درمیان اور رشتہ بھی برابر والوں کے بیچ ہی ہونا چاہئے.........ایسا کرنے سے ہی زندگی خوشحال رہتی ہے۔ اب آپ ہی دیکھئے نا آپ نے بٹیا کی شادی بھی کرنی ہے......کرنی ہے کہ نہیں؟ آپکے اس خستہ حال گھر کے ہوتے کیا کوئی موافق رشتہ مِل سکتا ہے اس کیلئے۔ پھر آپ نے اسکی شادی کیلئے روپئے پیسہ بھی تو جُٹانا ہے.......جتنی رقم میں آپکو دونگا اس سے آپ آرام سے نیا گھر بھی بنا سکتے ہیں اور پیاری بِٹیا کا بیاہ بھی دھوم دھام سے کرا سکتے ہیں۔''

اس پر کیلاش پتی نے بڑی انکساری کے ساتھ کہا، ''دیکھئے بخشی صاحب، ہم نے آپکی تجویز پر بہت غور و خوض کیا.......میرے گھر والے نہیں مانتے.........کہتے ہیں اتنا سارا ٹبر لے کے کدھر کدھر کی خاک چھانیں گے۔ بچپن اور جوانی اسی جگہ گزار دی، اب اس مرحلے پر بانڈے، بستر لے کر خانہ بدوشوں کی طرح کہاں کہاں دھکے کھاتے پھرینگے.......میں مجبور ہوں، بخشی صاحب۔''

بخشی صاحب کو شاید ایسے جواب کی توقع نہیں تھی اور بول پڑے،''ٹھیک ہے، اگر آپ لوگوں کو اعتراض ہے تو میں ایک بات عرض کرنا چاہونگا اور جو کچھ میں کہنے جا رہا ہوں وہ سمجھ لیجئے میری ذاتی نہیں بلکہ ہمارے پڑوس میں رہ رہے سبھی لوگوں کی متفقہ رائے ہے۔میرے اوپر صرف یہ ذمہ واری سپرد کی گئی ہے کہ آپ سے گزارش کروں کہ آپ یہ جگہ چھوڑ کر کہیں اور مکان لے لیں کیونکہ آپکا یہاں اب اور آگے رہنا نہ آپکے فائدے میں ہے اور نہ ہمارے ہِت میں.......آپکا یہ بوسیدہ کھنڈر اس عالیشان کالونی کے منہہ پر ایک بدنماٗ داغ ہے۔''

کیلاش پتی کے چہرے پر مایوسی اور پریشانی دونوں کے آثار چھا گئے،لیکن پھر بھی ہمت کر کے بولے،'' آپ مجھے ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں........میں نے تو اس کالونی کی داغ بیل ڈالی ہے..........میں پہلا شخص تھا جس نے اس بیابان میں پہلا مکان بنا ڈالا تھا۔''

''تو کیا ہوا....؟؟ آپ نے ساری بستی تھوڑے ہی خریدی تھی........اب اس کالونی میں کسی ایک شخص کی من مانی نہیں چلے گی چاہے وہ سب سے پہلے یہاں آیا ہو یا سب سے آخر میں......اس کالونی میں ایک باضابطہ کمیٹی تشکیل دی گئی ہے اور کمیٹی کا یہی فیصلہ ہے۔یا تو آپ اس کالونی میں رہنے کیلئے ڈھنگ کا مکان بنالیں اور ہماری جیسی سوسائٹی میں رہنے کا شعور اور سلیقہ پیدا کریں یا پھر کمیٹی کے ساتھ اشتراک کریں ورنہ ہمیں آپکو یہاں سے نکالنے کے اور بھی طریقے آتے ہیں۔ہم سمجھے آپ ہماری ہی طرح شریف آدمی ہیں اور شریفوں کے ساتھ شرافت سے پیش آنا ہی ہمارا دھرم ایمان ہے......نہیں تو ہمیں بھی معلوم ہے کہ گھی اگر سیدھی انگلی سے نہ نکلے تو انگلی ٹیڑھی کیسے کی جاتی ہے،'' بخشی صاحب دھمکی پر اُتر آئے اور غصے میں آ کر وہاں سے چل دئے۔

بخشی صاحب کے وہ کرخت الفاظ کیلاش پتی پر بجلی جیسے گرے اور اسے زندگی میں آج پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ سرمایہ داروں کی 'شرافت' کی تشریح کیا ہوتی ہے اور جب وہ اپنی 'شرافت' پہ اُتر آتے ہیں تو کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔آج اسے اس بات کا شدید احساس ہو رہا تھا کہ معاشی بدحالی و اقتصادی پسماندگی انسان کو کتنا کمزور بنا دیتی ہے اور آسودگی و اقتدار کتنا جابر و طاقتور۔ظالم اور مظلوم کے بیچ صرف آسودگی اور اقتدار کا فرق ہے.......مظلوم دماغی،جسمانی،تعلیمی و قابلیتی اعتبار سے ظالم پر برتر ہو سکتا ہے لیکن اقتدار کے لحاظ سے یا اقتصادی طور وہ کبھی ظالم پر سبقت حاصل نہیں کر سکتا۔آج وہ جان گئے کہ پیسے کے بل بوتے پر کیسے ایک امیر کسی غریب کو اسکی جائز یا ناجائز بات منوانے کیلئے مجبور یا مرعوب کر سکتا ہے۔اس نے اپنے آپ کو خوب کوسا ،اپنی قسمت کو کوسا.........''کاش تیس سال قبل میرے پاس چند ہزار روپئے اور دستیاب ہوتے تو میں اس مولراج کسان جو میرے والد صاحب کا قرضدار کئی برسوں تک رہا تھا اور اب اپنے اجداد کی ہڈیاں بیچ بیچ کے 'مولراج ماربلز' کا مالک بن بیٹھا ہے، سے پورا ایک کنال اراضی خرید کے رکھ لیتا اور پھر آج کی تاریخ میں اسکا آدھا حصہ فروخت کر کے اس رقم سے اس پرانے مکان کی جگہ اعلیٰ سا گھر بنوا لیتا........لیکن میں تب بھی ایسا ہی تھا اور اب بھی ویسا ہی ہوں.......''۔آسودہ حالوں کے بیچ پھنسا ہوا غربت کا وہ پتلا سارے کیلاش دھام میں اب ''کنگلے کیلاش'' کے نام جانا پہچانا جانے لگا تھا.......سبزی والا ہو یا دودھ والا یا پھر کپڑوں کی استری کرنے

والا.......حتیٰ کہ ردی اخبار اور کباڑ خریدنے والے بھی انکے گھر کو کنگلے کیلاش کے گھر سے پکارتے تھے۔واپس آنے پر جب اسکی پتنی اور بڑے بیٹے کملیش نے استفسار کِیا تو کیلاش پتی نے ساری صورتِ حال بیان کی جس پر بیٹے نے کہا،''بابو جی، آپ فکر کیوں کرتے ہیں.......یہ کوئی زور زبردستی تھوڑے ہی ہے۔مانا کہ وہ دولتمند ہیں، لیکن قانون نام کی بھی تو کوئی چیز ہے........دیکھتا ہوں میں کیسے بیدخل کرتے ہیں ہمیں وہ۔''

''بیٹے تم نہیں سمجھو گے ان پیسے والوں کے طور طریقے اور اگر سچ پوچھو مجھے خود بھی اب اس جگہ اس ماحول میں رہنا پسند نہیں........ایک شرم سی محسوس ہونے لگی ہے مجھے۔ان لوگوں کے نوکروں کی رہنے کی جگہیں بھی ہمارے اس گھر سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔ہر ایک شخص ہمیں اور ہمارے اس گھر کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے........ہمیں کچھ کرنا چاہئے......کچھ کرنا چاہئے۔'' کیلاش پتی نے کہا۔کمرے کے اندر داخل ہو کر اس نے اپنی' ذلت آمیز' زندگی پر بہت آنسو بہائے اور کئی بار اس بے عزتی سے نجات پانے کیلئے اپنی حیات کا ہی خاتمہ کرنے کی بھی سوچ لی ، پر یہ سوچ کر کہ اسے مسائل کا حل نہیں نکل سکتا ہے........بلکہ وہ صرف اسکے شانوں سے اسکے بیٹوں کے شانوں پر منتقل ہو سکتے ہیں،اس نے وہ خیال ہی ذہن سے خارج کر دیئے۔اسے فقط ایک بات کا پچھتاوا نہیں تھا کہ اسنے شہر میں اپنا پشتینی مکان نہیں بیچا تھا۔اس نے کسی سے کچھ نہ کہا اور برق رفتاری سے اُٹھکر گھر سے باہر چلا گیا جس پر اسکی پتنی سوشیلا کو تعجب سے زیادہ تشوش ہوئی،لیکن کیلاش پتی نے ایک نظر بھی پیچھے مُڑ کے نہ دیکھا۔

دو دن بعد جب گھر کے سبھی افراد منہہ لٹکائے رات کا کھانا کھانے کیلئے بیٹھے تو کیلاش پتی نے اپنے پھٹے پرانے ہینڈ بیگ میں سے ہزار ہزار روپئے نوٹوں کے دو بنڈل نکال کر اپنے بیٹوں کی جانب بڑھائے اور انہیں تاکید کی وہ جلد سے جلد اپنے شہر والے مکان کی فوری طور مرمت اور اس پر مزید ایک منزل تعمیر کرانے کا کام شروع کروالیں جسکے واسطے انہیں نے وافر رقم واگزار کرانے کی بھی یقین دہانی کی۔انہوں نے بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ بذاتِ خود اس کام کی نگرانی کرینگے تا کہ دو مہینے کے اندر وہ سرمایہ داروں کے ''کیلاش دھام' سے نکل کر واپس اپنے اُس دھام میں آسکیں جہاں چین ہو........سکون ہو.........شانتی ہو.........اپنے بڑے بزرگوں، پُرکھوں کی یادیں ہوں اور سب سے اہم یہ کہ جہاں کی تنگ گلیوں ،کوچوں، چوباروں میں آسودگی کے آسیبوں کی جگہ ہر لمحہ پیار،محبت،خلوص ،شفقت اور کشادہ دل رکھنے والوں کے دیدار نصیب ہوں۔

دو مہینے بیت جانے پر کیلاش پتی جب اپنے پورے خاندان سمیت شہر واپس اپنے گھر لوٹ آئے تو انہیں ایسا لگا جیسے انہیں کھوئی ہوئی جنت مِل گئی ہو۔تمام محلے والوں نے ساری گلی کو دلہن کی مانند سجایا تھا اور پھر رات کے وقت گلی کے تمام مکانوں پر چراغاں کِیا گیا،مٹھائیاں بانٹی گئی،آتش بازی کی گئی جس پر کیلاش پتی نے مسرور ہو کر اپنی پتنی اور بچوں سے کہا،''کیوں سوشیلا؟ کیوں کملیش بیٹے.......اب سمجھ گئے نا آپ لوگ زندگی کِسے کہتے ہیں اور ہمارا فیصلہ درست تھا یا غلط؟''اور ان سب کا ایک ہی جواب تھا.......'' Long Live our Babuji'' اور اسکے ساتھ ہی گلی کی دوسری جانب کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں،'' Long Live Kailash Patti'' ...''WelcomeHomeKailashPatti''۔

☆☆☆

فوزیہ مغل (لاہور)

دلال

چوہدری انور 18 ویں گرڈیڈ کا آفیسر، پارک میں واک کرتے ہوئے عجیب وغرب حرکات کرر ہا تھا کبھی ادھر کبھی ادھر اچانک چلتے چلتے اپنے پیچھے گھوم کر دیکھنے لگتا، جب دیکھتا کہ کوئی دیکھ رہا تو ایسے ہی ورزش کے پوز بنانے لگتا کیونکے آج وہ کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آرہا تھا اس کی پریشانی کی وجہ اس کا نیا باس تھا جو پچھلے ہی ہفتے ٹرانسفر ہو کے آیا تھا۔ چونکہ چوہدری انور اپنے کام پر کم ہی دھیان دینے والا آفیسر تھا وہ ہمیشہ اپنے بڑے آفیسرز کی خدمت کسی اور طریقے سے کرنے کا عادی تھا اور وہ خدمت بھی بڑی تندہی سے کرتا تا کہ بڑے آفیسر کی نظریں اس کے کام سے ہٹی رہے ایک ہفتے میں ہی ثابت ہو گیا یہ نیا آفیسر اپنے کام سے کام رکھنے والا تلخ لہجے اور سخت مزاج ہے چوہدری انور کے لیے یہ بہت پریشان کن سچویشن تھی اس سے پہلے جو آفیسر آتا جلد ہی اس کی باتوں کے اثر میں آجا اس بار چوہدری انور کا ستارا ہی شاید گردش میں تھا نئے آفیسر نے الرٹ کر دیا تھا کہ جلد ہی ایک ایسی مٹینگ ہوگی جس میں تمام عملہ کی پچھلی کارکردگی دیکھی جائے گی، اس خبر کا دیگر عملہ پر تو کوئی خاص اثر نہ ہوا نہ ہی کسی اور نے زیادہ ٹینشن لی سوا چوہدری انور کے کیونکہ وہ آفس میں نوکری کم اور دلالی زیادہ کرتا حالانکہ وہ جس سیٹ پر تھا اس کی بدولت با آسانی باعزت باضمیر زندگی گزار سکتا تھا لیکن ہر کوشش کے باوجود وہ اپنے اندر کے پیدائشی دلال کو ختم نہ کر سکا۔

انور کا تعلق اس گھرانے سے تھا جہاں نام کیساتھ باپ کی بجائے ماں کا نام لگتا انور کی ماں خورشید بائی نے جب ایک بیٹے کو جنم دیا تو بہت خوش ہوئی کہ اس کے سلگتے آنگن میں کسی بیٹی نے جنم نہیں لیا وہ انور کی انگلی پکر کر اس وقت کوٹھے کی دہلیز پار کی جب انور نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے گھنگھرو پکڑ کر سوئی ہوئی ماں کے پاؤں میں باندھنے لگا انور کی یہ حرکت خورشید بائی کی روح تک کو زخمی کر گئی اس نے بے اختیار ایک زوردار تھپڑ انور کے معصوم گالوں پر جڑ دیا۔ انور کے رونے کی آواز سن کر مہتاب بائی کمرے میں آئی انور ابھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ وہ مہتاب بائی کو پوری بات بتاتا روتے ہوئے صرف ماں کی طرف اشارا کیا مہتاب بائی نے خورشید سے تھپڑ مارنے کی وجہ پوچھی خورشید کا جواب سن کر خوب ہنسی اور کہنے لگی اس نے وہی کیا ہے جو اسے بعد میں بھی کرنا ہے اور

تُو کیا چاہتی ہے یہ تیرے لئے جائے نماز بچھاتا۔ خورشید آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے ہاں میں یہی چاہتی ہوں مہتاب بائی ایکدم غصے سے بولی گندی نالی کی اینٹ کبھی مسجد میں نہیں لگی، خورشید سسکتے ہوئے اس کی رگوں میں گردش کرنے والا خون گندہ نہیں وہ تو بڑے اونچے سادات خاندان کا ہے اور حرکت ایسی نیچ مہتاب بائی گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولی تمہیں مرشد فضل گیلانی کا خون تو یاد رہا مگر اسکے باپ مرشد ناصر گیلانی کی داستانیں نہیں سنی جو اپنی رنگین مزاجی میں اپنے بیٹے سے بھی دو قدم آگے تھا جب وہ ادا بائی کو اپنی حویلی میں مستقل لے کر گیا تھا تو ادا بائی اپنی کوکھ میں کوٹھے کی نشانی فضل گیلانی کو لے کر گئی۔

خورشید بائی اگلی صبح داتا دربار پر حاضری دینے کے بعد سیدھی اس جگہ گئی جس کو وہ ہر جمعرات کو داتا دربار پر حاضری کے لئے آتے جاتے بڑی حسرت سے دیکھتی وہ داتا دربار اور پیر مکیؒ کے درمیان ایک پرائمری سکول کی چاردیواری تھی جہاں بچے صبح کے وقت بڑی عقیدت سے تلاوتِ کلامِ پاک کرتے پھر دُعا مانگتے اور یہ منظر خورشید بائی کو بہت سرشار کرتا آج وہ انور کو اسی پرائمری سکول کے ہیڈ ماسٹر کے پاس چھوڑنے آئی ہیڈ ماسٹر کو اللہ رسول کا واسطہ دے کر انور کو ہمیشہ کے لئے وہاں چھوڑ کر سیدھی اسٹیشن پر آئی سیون شریف جانے والی ٹرین کا ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر بنے بینچ پر بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کرنے لگی ۔

ہیڈ ماسٹر کا خاندان کا لہو وطن کی بنیادوں میں کام آ گیا تھا وہ اپنوں کی جدائیوں کے غم تنہائیوں میں سہہ سہہ اندر سے بالکل کھوکھلا ہو چکا تھا اسے بھی انور کا ساتھ ایک بوجھ کی طرح نہیں بلکہ سہارے کی مانند لگا ماسٹر صاحب نے پوری توجو کے ساتھ انور کی اچھی تربیت کرنے لگا مگر اس دن اسے شدید صدمہ پہنچا جب انور صرف سات سال کا تھا کے ایک ٹیچر کا ایک رقعہ اور ایک تین پیسہ کا سکّہ ہاتھ میں دبا کر سکول کے بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے ہیڈ ماسٹر نے پیٹھ پیچھے کئے ہاتھوں میں دبا رقعہ پکڑ کر پڑھتے ہوئے اس کے ہاتھ لرزنے لگے انور یہ صورتحال دیکھ کر گھبرا گیا اور جلدی سے اپنے ہاتھوں سے کان پکڑ کر بولا ماسٹر جی معاف کر دو اب میں ایسا نہیں کروگا ماسٹر صاحب نے اس واقعہ کے بعد اور زیادہ توجو دینا شروع کر دی اور انور نے میٹرک پاس کیا تو محلے بھر میں پتاشے بانٹتے اور انور کو کالج میں میں داخل کروانے کے بعد شکرانے کے نفل ادا کیے۔ انور جب سکینڈ ڈائر میں تھا کہ ایک دن ماسٹر نے انور سے کہا تمہاری آخری زمہ داری ابھی مجھ پر باقی ہے حالانکہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا لیکن میرے پاس اب وقت کم ہے میری صحت تمہاری ملازمت کا انتظار نہیں کر سکتی لہذا میں نے فیصلہ کیا کہ نسرین کے ساتھ تیری بات پکی کر دو بچی گھر کی ہے اسکے گھرانے کا لہو بھی اس ملک کی بنیادوں میں شامل ہے۔ انور کو نسرین بچپن میں تو بالکل اچھی نہیں لگتی تھی وہ جب بھی شام کی نماز پڑھنے کی بجائے کھیلنے لگتا تو وہ فوراً ماسٹر صاحب کو آ کر شکایت لگاتی۔ لیکن جب انور نے میٹرک کا امتحان دے رہا تھا تو ماسٹر صاحب شدید بیمار ہونے کی وجہ سے کھانے پکانے میں بڑی مشکل ہونے لگی جب خالہ صغرا کو پتا چلا تو اس نے اپنی بھانجی نسرین کو ماسٹر صاحب کی

روٹیاں سالن پکانے بھیج دیتی نسرین نظریں جھکائے روٹی ہانڈی کے ساتھ ساتھ گھر کی صفائی بھی کرتی اور جاتے جاتے ماچھی سے سارے برتن پانی کے بھروا کے ڈھانپ جاتی۔

اس دن سے ماسٹر صاحب بہت دور کی سوچنے لگا تھا اور ٹھیک دو سال بعد وہ اپنی سوچ انور بتائی انور نے ماسٹر صاحب کی بات سُن کر سر جھکا لیا انور لاکھ باہر بدتمیز تھا مگر ماسٹر صاحب کی بہت عزت کرتا ماسٹر صاحب نے اسی شام لڈوں کا ڈبہ پکڑ کر صغرا کے گھر پہنچ گیا اور خوشی خوشی واپس آیا مگر ماسٹر کو یہ خوشی راس نہ آئی۔ اگلے دن جب انور کالج سے واپس آیا ماسٹر صاحب کی کی تسبیح چار پائی سے نیچے گری ہوئی تھی اور خود اللہ کو پیارا ہو چکا تھا۔ چہلم کے ختم پر ہی انور کا نکاح نسرین سے ہو گیا انور نے پڑھائی جاری رکھی کیونکہ ماسٹر صاحب نے اتنی رقم چھوڑی تھی کہ وہ آرام سے اپنی تعلیم مکمل کر کے نوکری ڈھونڈ سکے اس

زمانے میں تعلیم کی بہت قدر تھی تعلیم یافتہ کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے نوکری کا کوئی خاص مسلہ نہیں تھا ادھر انور نے بی اے پاس کیا ادھر اسے جھٹ سے اچھی نوکری مل گئی انور چاہتا تو اسی سیٹ پر پرموش حاصل کر کے بہت آگے جا سکتا تھا مگر وہ ایسا نہ کر سکا ماسٹر کی تربیت پر انور کے لہو کا اثر زیادہ رنگ لایا وہ اپنے محکمے میں اپنے آفیسرز کی اور ہی طرح سے خدمت کرتا اپنے کام پر دھیان کم ہی دیتا اس کی گھریلو زندگی بھی کوئی خاص اچھی نہ گزر سکی نسرین صرف صرف سال بعد بیٹی کو جنم دے کر اللہ کو پیاری ہو گی انور اور نسرین کی خالہ ننھی شمیم کی دیکھ بھال کرتے جب ننھی شمیم نے اسکول جانا شروع کیا تو انور کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ پتا ہی نہ چلا کب شمیم نے میٹرک پاس کر لیا۔ ایک بار جب انور کے بڑے افیسر نے اسے اس کے مطلب کے کام کی آفر کی اور ساتھ یہ بھی کہا مجھے ایسا مال چاہئے جیسے دیکھ کر میں سب کچھ بھول جاؤں انور نے حسبِ عادت بہت سی خوبصورت مجبور لڑکیاں لا لا کر پیش کی مگر آفیسر کی طبیعت خوش نہ ہو سکی آخر ایک دن آفیسر تلخی سے کہا اگر اب بھی تم اچھا مال نہ لائے تو اپنی نوکری جاتی سمجھنا انور اسی شام بہت سی جگوں پر گیا مگر مایوسی ہی حاصل ہوئی آخر تھک ہار کے ناکام جب اپنے گھر واپس آیا تو شمیم نے دروازہ کھولا شمیم نیند کی غنودگی کی وجہ سے اپنا ڈوپٹہ اورھنا بھول گئی۔ انور کی جونہی شمیم پر پڑی تو اس کی آنکھیں ایکدم چمک اٹھی اور منہ سے بے اختیار ہی جملہ نکلا اب میری نوکری کہی نہیں جا سکتی شمیم آنکھیں ملتے ہوئے بولی ابو کیا کہا انور جلدی سے کچھ نہیں بیٹی تم ابھی جا کر سو جاوٗ۔ اس کے بعد یہ سلسلہ شروع ہو گا آخر ایک دن بیٹی نے تنگ آ کر اپنے کالج کے چوکیدار کے بیٹے کے ساتھ بھاگ کر نکاح کر لیا انور کو بیٹی کے گھر سے بھاگنے کا دکھ صرف اس لئے ہوا کہ اب اسے پھر سے آفیسرز کی خواہش پوری کرنے کے لیے خوار ہونا پڑے گا۔

ستیہ پال آنند (امریکہ)

مختصر مختصر نظمیں

(ان نظموں کے استعاراتی معانی
عنوانات میں تلاش کیے جائیں)

برہنہ مجذوب

"شاید مجھے بھی
سرمدی خلعت نصیب ہو
اب تک تو
سوٹ بوٹ ہی میری شناخت ہے!

ققنس

اک شعلۂ وجود تھا
جو کل اپنی جگہ تھا
اک راکھ کی ڈھیری ہے
جو اب اپنی جگہ ہے!

دعا در خانقاہ

میں انتظار میں تھا
کب جواب آئے گا
پتہ غلط تھا
لفافہ مر اپلٹ آیا

اماں حوّا کی پوشاک

"جاؤ، یہ زندیق سا مکروہ، سفلی پھل
(جسے تم چکھ چکی ہو)
اس کو لوٹا دو
مگر میرے لیے بے حد ضروری ہے
کہ وہ اتری ہوئی پوشاک جیسی پاکبازی
جس کو تم ابلیس کے پاؤں پہ رکھ کر
پاس میرے آ گئی تھیں
اس سے واپس مانگ لاؤ!"

آستین میں خنجر

"کیا بروٹس تُو بھی....؟" ••
میرے لب پہ آیا
اور پھر یہ ساکت و جامد
ادھوری بات آخر
آہ میں تبدیل ہو کر رہ گئی تھی
پیٹھ میں گھونپے ہوئے
خنجر سے میں کیا پوچھتا
اس کے علاوہ؟

"Et tu Brutus'?" (Shakespeare: Julius Caesar)••

افتخار عارف (اسلام آباد)

غالبؔ کے دو مصرعے

ہمارے عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ کو
نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی تھی
مگر ہم کو نہیں آتی
ہمیں آتا بھی کیا ہے
خبر کے اُس طرف کیا ہے
کبھی اُس پر نظر رکھنے کا فن ہم کو نہیں آیا
نظر کے زاویے کس طرح سے ترتیب پاتے ہیں
کہاں اور کس لیے ترتیب پاتے ہیں
کبھی ان زاویوں کو معتبر رکھنے کا فن ہم کو نہیں آیا
ہمیں بس خوئے ماتم راس آتی ہے
کوئی موجِ ہوائے تازہ کم کم راس آتی ہے
ہمارے عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ کو
نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی تھی
مگر ہم کو نہیں آتی!

افتخار عارف

تجاہلِ عارفانہ

جوہری کو کیا معلوم کس طرح کی مٹی میں کیسے پھول
ہوتے ہیں
کس طرح کے پھولوں میں
کیسی باس ہوتی ہے
جوہری کو کیا معلوم
جوہری تو ساری عمر پتھروں میں رہتا ہے
زرگروں میں رہتا ہے
جوہری کو کیا معلوم
یہ تو بس وہی جانے
جس نے اپنی مٹی سے
اپنا ایک پیماں
استوار رکھا ہو
جس نے حرفِ پیماں کا اعتبار رکھا ہو
جوہری کو کیا معلوم کس طرح کی مٹی میں کیسے پھول
ہوتے ہیں
کس طرح کے پھولوں میں کیسی باس ہوتی ہے

ندا فاضلی (ممبئی)

بیٹی کے لیے دو نظمیں

چھوٹی سی شاپنگ

گوٹے والی لال اوڑھنی
اس پر چولی گھاگرا
اس سے میچنگ کرنے والا
چھوٹا سا اک ناگرا
چھوٹی سی یہ شاپنگ تھی
یا کوئی جادو ٹونا
لمبا چوڑا شہر اچانک
بن کر ایک کھلونا
داڑھی، پگڑی، اونٹ چھوڑ کے
اتہاسوں کا جال توڑ کے
الف سے اماں
بے سے بابا
بیٹھا ناچ رہا تھا
پانچ سال کی بچی بن کر
جے پور ناچ رہا تھا!

ندا فاضلی

مرمت کی ضرورت

بہت میلا ہے یہ سورج
کسی دریا کے پانی میں
اسے دھو کر سکھائیں پھر
گگن میں چاند بھی / کچھ دھندلا دھندلا ہے
مٹا کے اس کے سارے داغ دھبے
جگمگائیں پھر
ہوائیں سو رہی ہیں
پربتوں پر پاؤں پھیلائے
جگا کے ان کو نیچے لائیں
پیڑوں میں بسائیں پھر
دھماکے کچی نیندوں میں
ڈرا دیتے ہیں بچوں کو
دھماکے ختم کر کے
لوریوں کو گنگنائیں پھر
وہ جب سے ساتھ ہے یوں لگ رہا ہے
اپنی یہ دنیا
جو صدیوں کی وراثت ہے
جو ہم سب کی امانت ہے
پرانی ہو گئی ہے
اس میں اب
تھوڑی مرمّت کی ضرورت ہے!

عامر سہیل (بہاول نگر)

جزام کی ٹھیکری!

بندھے ہوئے پاؤں
چار پائی کی پائنتی سے
ٹھنسا ہوا منہ کے طاق میں
اک غلیظ کپڑا
قضا کے جھٹکوں سے
رات کی ہچکیاں بندھی ہیں
عجیب غیرت ہے ریڑھ کے پیچ دار مہروں میں
پیچ کھاتی
گلے کی نالی
میں پھر کے آنکھیں اُبالتی ہے

سِتے سِتے سُست پھیری والے
دھکیلتے دھڑ کو اور ٹانگوں کی بے بسی کو
وہ جھریوں کے گڑھوں میں مجبور کھاری پانی
خدا کے گھر میں
مناظرے کی جھڑی لگی ہے
اُڑا تعفّن بھی، تھوک بھی اور چپلیں بھی
بھری ہیں جیلیں
ابد کی شب تک جزام جھیلیں

چھٹی ہے بنیان اور پسینے کے
کیچوے کڑھتے دودھ میں
ڈبکیاں لگا کر
سمے کی تجہید کر رہے ہیں!
وہ آ گیا بچپنا ہتھیلی پر بید کھا کے
سنی ہوئی پینٹ پر لہو کا تلک لگا کے
بتا نہیں سکتا ماں کو
مکتب میں کیا پڑھا ہے!
پڑا ہے بستر میں منہ چھپا کے
بڑی زمینداری اور اُس پر یہ نامرادی!
پڑے ہیں وارث کے پالنے میں
حمل کے تعویذ...... بے اولادی
یہ کھرلیوں میں بھری پرالی
پرالی اور یہ زمینداری کی
جاہ و ثروت، طویل ب...و...س...ہ!
غلیظ گالی!
جھٹک رہی ہے وہ پتلی گردن
پٹخ رہی ہے
دبی دبی سسکیاں یہ انزال کی نقاہت

اُلٹ پڑی وید جی کی حکمت!
کہ پیٹ میں مر گیا ہے بچّہ
خدا اور اُس کا رسول سچّا!

ڈُبک گئے چھپروں میں ہاری
اُبال کر چاولوں کی مُٹھی کو دیگچی میں

بُڑھاپا جبڑے ہلا رہا ہے
وہ پنڈلیوں کو کھرچتے نیلے غلیظ ناخن
جلا کیا ہڈیوں کا بالن، یہ کاروکاری!
لہو میں آسودگی کی کوئی رَمق تو ہوتی
اکڑتے اینٹھے چھِلے بدن میں
مکاشفے کی لپک تو ہوتی
یہ کنٹھ مالا جو اک گلے میں سجی ہوئی ہے
کہاں چھپے گی پھٹے دوپٹے کی آڑ سے یہ!
وجود روگی ہے سوکھے ٹکڑوں پر پل رہا ہے
جہان پہ کیا بنی ہے کا ہے یہ کاٹھ کے ایسا جل رہا ہے!
رنگا ہوا میل سے دوپٹہ
گلی میں جھاڑو لگاتی کوڑے سے رزق چُنتی
وہ مہترانی! یہ بالمیکی!
مُرجھائے دِلت دلوں پہ
بھگوان کا دلاسہ
شریر... ایمان اور ذلّت
بھرا ہوا جھڑکیوں سے کاسہ
دو چوٹیاں گوندھ کر
لگاتی ہے فرش پر خواہشوں کے پوچے
کہ رات پڑتے ہی مالکن کا شرابی شوہر
سَتی ہوئی زرد نوجوانی کا ماس نوچے
اُسے اندھیرے میں آدبوچے

مجاوری کرتے لانبی قبروں کی
روغنِ چشم سے پُرانے چراغ بھرتے، مراقبے کی
گرہ لگاتے!

تھکی غریبی کہ پیٹھ دُکھنے لگی ہے ساری
کوئی نہیں ہے جو خواب میں
بلّیوں کی یلغار سے بچائے
حجاب اُترا ہے یاسمیں سر کی
ہانڈیوں میں اُبل رہی ہیں، چیخ رہی ہیں
کسی وریدیں......کوئی تو آئے
سلوک کی منزلیں پڑھائے
کہ مور چنگھاڑنے لگے ہیں
اُٹھا تشنج سے جسم، سکتے سے
اور جھٹکے سے مُڑ گیا ہے
ڈھلکتے اعضا کی کوئی آکر
بلی چڑھائے!
خدا کرے اب نہ خواب آئے
کوئی نہ اس نیند سے جگائے!

کاوش عباسی (سعودی عرب)

نظم

میں محفل میں سب سے الگ
بیٹھنا چاہتا ہوں
کہ تم میرے سارے بدن میں ہمکتی ہو
اس لطف کی لہر سے میں کہیں اور
کیسے توجہ کروں
بس اسی لطف میں سمٹا
اپنے بدن میں تمہارے بدن کی ترنگوں سے لپٹا
میں تم سے ملن میں مگن جھومتا ہوں
میں محفل میں سب سے الگ بیٹھتا ہوں!

----

۲۴ مئی کی صبح

چلو، اس طرف کو چلیں
وہ، وہاں اک شناسا اداسی ہے
اک ہمنوا چپ ہے
وہ سبز منظر (شجر، فینس، پودے)
اُس میں چلیں / اُس اداسی میں، چُپ میں پھریں
یاد، سب فاصلے، دوریاں، سب وہ کھونا، کریں
پر یہ کیا؟ / پارک کا گیٹ تو بند ہے
اس میں تالا لگا ہے
چلو لوٹ کر گھر چلیں!

کاوش عباسی

راستہ

عمر کا راستہ، راستہ ہی تھا، منزل نہ تھا
جو سفر ہم نے کھینچا
کہیں، کوئی، کچھ، اُس کا حاصل نہ تھا
جن شبیہوں سے، چہروں سے، بھاگے
پھر آگے
وہی چہرے ہم کو ملے
ذہن میں خواب تو تھے
مگر جسم میں وہ اڑانیں نہ تھیں
چاند پر ڈالتیں جو کمند
ہم
بلندی نہ دوری، نہ عظمت، نہ وسعت
نہ کچھ
پا سکے
کھوجتے (جانے کیا کھوجتے)
سوچتے، خود کو کھجلاتے ہی رہ گئے
اپنی بے رس محبت پہ
ہر روز کی
اپنے خوابوں کی ناخواندہ تعبیر پر
چڑتے، جھلاتے ہی ہم رہے!

طالب انصاری (واہ کینٹ)

دیر کر دی

پھر اسی چھوٹے سے گھر کی
بوڑھی دیواروں سے لپٹی خامشی
میرے سواگت کے لیے آئی
تو میں نے میلے چیکٹ خواب کا
برسوں پرانا تھیلا کاندھے سے اتارا
نل کی بوکی پر دھرا اسلور کا چھوٹا سا کٹورا
جا بجا بکھرے ہوئے پژمردہ پتے
صحن کی ویرانی پر نوحہ کناں تھے
ڈگمگاتے ڈولتے زینے پہ گم صم دوپہر
دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر مٹی میں اٹی
اب جس کے خدوخال بھی پہچاننا ممکن نہیں تھا
مدتوں بعد اس کھنڈر میں
اک گلِ تازہ کی خواہش کھینچ لائی تھی مجھے
لیکن وہاں کوئی نہیں تھا
دیکھتے ہی مجھ کو جس کے چہرے پر صبحیں بکھرتیں
گال احساسِ حیا سے تمتماتے
کوٹھڑی کے کبڑے تختے چرچرائے
لڑکھڑاتی بڑبڑاتی لاٹھی نے
چندھیائی آنکھوں سے مجھے غصے سے دیکھا
اجنبی دنیا کی سیروں میں رتم اپنے بچپنے کی بھولی بھالی
چاہتیں بھی بھول بیٹھے، دیر کر دی

توقیر عباس (لاہور)

اس دن۔۔۔۔

اس دن تو وہ خود بھی شکستہ قابلِ رحم تھا لیکن،
کون تھا جس کے لئے، اس کی ہمدردی نہیں تھی،
جس پر اس کو ترس نہیں آیا تھا،
سو اُس نے اِس لمحے کے زیرِ اثر،
سب اشیاء کو دیکھا،

دریا ندی سمندر اپنے کناروں میں سمٹے بل کھاتے
ہیں، تھل میں ویرانی رقصاں ہے،
پیڑ ہیں پاگل ہوا میں ہاتھ میں ہلاتے رہتے ہیں،
پنچھی کتنا اڑتے ہیں،

کوہ فقط تخریب کی زد پر آ کر کرتے
زلزلے پیدا کرتے رہتے ہیں،
ہوا بھی اندھی ہے،
جو سب سے مراسم رکھتی ہے،
اس جیسے سب انساں
اک کاہش میں رینگتی روحیں ہیں،
اس نے دیکھا،
سب کچھ اک مربوط نظام کی جکڑن میں ہے،
سب کچھ جدا جدا ہے، لیکن اک دوجے سے
لاکھوں رشتے جڑے ہوئے ہیں۔

فہیم شناس کاظمی (کراچی)

خواب جو نسلیں نگل گیا

اور پھر خواب کی تجسیم ہوئی
خواب وہ خواب کہ آنکھوں میں لہو بھر آیا
ایسی تجسیم کہ ہر رنگ بکھرتا جائے
جو بھی منظر ہے وہ دھندلا ٹھہرا
سر کٹے
جسم کٹے
عزتِ سادات گئی
اس پہ بھی شکر کیا
خاک پر سجدہ کیا
پہلے اک خواب کو ہم روتے تھے
اور پھر روئے ہم آنکھوں کے لیے
اس پہ بھی شکر کیا
سبز آنکھوں میں لہو
شام جنگل میں کہیں بین کرے
روشنی ڈوب گئی دریا میں
خواہشیں برف ہوئیں
چار اطراف سے یلغار ہوئی
اور پھر رات ہوئی
خواب کی تجسیم ہوئی
میں نے جھیلے ہیں یہاں کتنے عذاب
میری آنکھوں میں نہیں کوئی خواب

علی ساحل (کراچی)

لمس

اُس سے کہنا
میں اسے بھول گیا ہوں شاید
زندگی
اب بڑے آرام سے بےخوف وخطر
اپنی منزل کے تعاقب میں چلی جاتی ہے
وہ مجھے یاد نہیں آتی ہے
ہاں مگر
اس کی رفاقت میں گزارے ہوئے
لمحوں کی جنوں خیزی میں
لمس اس شوخ کی جلتی ہوئی پیشانی کا
میرے جھلسے ہوئے ہونٹوں پہ ابھی زندہ ہے

پروین شیر (کینیڈا)

ست رنگا پرندہ

فلک پر اپنے ست رنگے
ملائم بال و پر کو وا کیے اونچی اڑانوں میں
مگن تھا ایک البیلا، سبک، نازک
پرندہ چاند کی انگلی کو تھامے
نرم کرنوں کو
پہن کر کہکشاں کی چھاؤں میں
سرگوشیاں کرتا ستاروں سے
شبانہ روز وہ پرواز میں گم تھا!
تپش سورج کی جھلساتی
تو بادل کی نمی اس کو چھپا لیتی
یکا یک اک شکاری نے
چلائیں گولیاں اس پر
بہت حیراں
بہت غمناک نظروں سے
پرندے نے شکاری کی طرف دیکھا
کہ جیسے پوچھتا ہو، کیوں؟
گرا آخر زمیں پر خون میں لت پت
وہ ست رنگا پرندہ خواب کا
تعبیر کے رنگیں بسیرے تک نہیں پہنچا!!

پروین شیر

کہاں ہیں تتلیاں؟

یہاں اب خاک اڑتی ہے
کہ صحنِ جاں کے اندر جھومتے، اونچے
شجر، خوشبو کی بانہوں میں
لرزتے پھول اور پتے
دہکتے درد کے شعلوں
کی زد میں جل بجھے ہیں اب!
دھواں دیتی ہوئی اک شاخ باقی ہے
وہ مجھ سے پوچھتی ہے
تتلیاں اب کیوں نہیں آتیں؟

اشکر فاروقی (راولپنڈی)

ریت سے مکالمہ

ہوا کو چھوڑو کہ بے وفائی ہے اس کی عادت
اے ریگ صحرا تو اپنی وسعت گداز رکھنا
جلاتے سورج سے دوستی ہے کہ دشمنی ہے
مگر تعلق بہت ہی گہرا بہت پرانا
میں سوچتا ہوں ـــ کوئی تو رشتہ
ہمارے سانسوں کے درمیاں بھی اے کاش ہوتا
مگر یہ رشتہ ہوا نہ ہوتا
اے ریگ صحرا یہ تیری وسعت
یہ نرم خوئی یہ صبر تیرا
عجب کہانی سنا رہا ہے
اے ریگ صحرا
ہوا نہ بننا کہ اس کی فطرت ہے بے وفائی
اور پانی کی مصلحت کوش زندگی میں
مستقل کوئی شکل ہے اور نہ کوئی رشتہ
اے ریگ صحرا تری تمازت میں اک وفا ہے
تری سفارت ہوا سے پانی سے مستقل ہے
تری محبت بھی معتبر ہے
اے ریگِ صحرا وفا کا رشتہ میں تجھ سے باندھوں
ہوا سے پانی سے کوئی رشتہ نہیں ہے میرا
مری محبت تمہاری وسعت کے مثل ٹھہرے
اے ریگ صحرا تو ماں کی مانند نرم خو ہے!

عاطر عثمانی (ملائیشیا)

بند آنکھوں پر ایک کُھلی نظم

بچاؤ کی
کوئی صُورت
نظر میں آ بھی سکتی ہے
کبُوتر سے کہو!
وُہ اپنی آنکھیں تو
کُھلی رکھے!!

مبشر سعید

خاتمہ

ہجر کے تنہا دشت میں دلبر
صبر کے بیج کو
ہنس کر بوئیں
تنہائی کا ماتم کر کے
آؤ کُچھ دیر
گلے لگ کر روئیں

سعید خان (سڈنی)

بھاگ بھری دھرتی کے لیے ایک نظم

سوہنی دھرتی۔۔۔تُو کب تک برباد رہے گی؟
آزادی کی رُت میں تُو نے
کیسا مشکل جنم لیا ہے
تیرا مقدر۔۔۔بستی بستی سُرخ اندھیرے
رستہ رستہ سرد ہوائیں
بھاگ بھری۔۔۔تیرے آنگن میں
یہ کیسا اندھیر ہوا ہے
تُو اِندس تُو گندھارا تھی/تو جو علم کا گہوارہ تھی
اب تجھ میں بارود بھرا ہے!
سوہنی دھرتی۔۔۔تُو کب تک برباد رہے گی؟
تیرا دامن تنگ ہے۔ورنہ/بجھے ہوئے ہم تیرے بالک
جب جب تیری گود سے نکلے۔۔۔روشن ٹھہرے
اپنی منزل مغرب ہو یا کالا پانی/ہم تیری گلیوں کے پتھر
کہاں کہاں پردیس میں جا کر۔۔۔کُندن ٹھہرے!
سوہنی دھرتی۔۔۔آزادی کی رُت میں تُو نے
کیسا مشکل جنم لیا ہے
تیرا سب سرمایہ تجھ سے رُوٹھ گیا ہے!
سوہنی دھرتی۔۔۔تُو کب تک برباد رہے گی؟

سلیمان جاذب

کاش

کاش وہ رات بھی کبھی آئے
چاند جب آسماں پہ روشن ہو
میرے آنگن میں تو اُتر آئے
چاندنی یوں سمیٹ لے مجھ کو
تیری خوشبو لپیٹ لے مجھ کو
میں تیری ذات میں سما جاؤں
اور تری روح میں اتر جاؤں
میری سانسوں میں تیری خوشبو ہو
تیرا پیکر ہی میرے ہر سو ہو
کاش ایسی بھی رات آ جائے
ہاتھ میں کائنات آ جائے

سید تصنیف حیدر (دہلی)

پھول چہرہ

اک پھول جیسی لڑکی/جب سے مجھے ملی ہے
میں کچھ بدل گیا ہوں/
راہِ خیالِ غم سے/آگے نکل گیا ہوں
شبنم کی طرح میں بھی/گر کر سنبھل گیا ہوں
کچھ قافلے خوشی کے/ٹھہرے ہیں دل میں آ کر
کچھ خواب سرمئی سے/بادل پہ گھر بنا کر
مجھ کو پکارتے ہیں/قسمت سنوارتے ہیں
دنیا مری نہ جانے/کیسے بدل گئی ہے
اک پھول جیسی لڑکی/جب سے مجھے ملی ہے

میں جب کبھی جہاں کے/مکر و ریا سے تھک کر
مایوسیوں کے دل میں/آثار دیکھتا ہوں
خود کو ہر ایک شئے سے/بیزار دیکھتا ہوں
وہ میرے پاس آ کر/ہر ایک غم چرا کر
کہتی ہے مسکرا کر/فکریں سبھی اڑا کر
جیتے ہیں غم بھلا کر/لگتا ہے جیسے وہ بھی
تھوڑی سی فلسفی ہے
اک پھول جیسی لڑکی/جب سے مجھے ملی ہے

پایا ہے میں نے اس کو/تنہائیوں میں اکثر
اس کا ہنر یہی ہے/خاموشیوں کے در پر
وہ مسکراہٹوں کے/روشن دیے جلا دے
آنکھوں میں زندگی کے/کچھ آشیاں سجا دے
اکثر ندی کی صورت/اک زندگی کی صورت
نازک لبوں سے اپنے/لفظوں کی خوبصورت
مالا بناتی ہے وہ/اور ٹوک دو تو خود پر
یوں مسکراتی ہے وہ
جیسے کسی پری سے/اک بھول ہو گئی ہو
جیسے دعائے الفت/مقبول ہو گئی ہو
یہ بھی مجھے لگا ہے/جیسے وہ اک پری ہے
دنیا کے غمکدے میں/بھولے سے آ گئی ہے
اک پھول جیسی لڑکی/جب سے مجھے ملی ہے

آنکھوں میں اس کے جیسے/برسات کھیلتی ہے
زلفوں کے سائے سائے/اک رات کھیلتی ہے
سانسوں سے خوشبوؤں کا/جھرنا سا پھوٹتا ہے
چہرے پہ نور آ گیں/اک رنگ چھوٹتا ہے
ہونٹوں پہ اک گلابی/آہنگ جاگتا ہے
ماتھے پہ چاندنی کا/اک رنگ جاگتا ہے
اس کی ہر اک ادا میں/اک زندگی نہاں ہے
خوابیدگی کا پہلو/جگتے میں بھی عیاں ہے
خوش ہے نظر کا عالم/دل کی کلی کھلی ہے
اک پھول جیسی لڑکی
جب سے مجھے ملی ہے
☆☆☆

انور زاہدی (اسلام آباد)

ایک دوست کے نام
نظم

اسے تحریک کہتے ہیں
جو مل جائے، تو اک لمحہ
نہ ہاتھ آئے تو
کتنے ہی زمانے بیت جاتے ہیں
کبھی بارش کا موسم
اور کبھی ٹھنڈی ہوا ایک جھونکا
کبھی جب شام ڈھلنے پر
ستارہ آسماں کے نیلگوں آنچل پہ جل اُٹھے
کبھی آنکھوں میں پانی
بن کے آنسو جھلملا جائے
کسی کی یاد کا ٹکڑا
خیالوں میں چمک جائے
تو پھر جو لفظ کاغذ پر اتر آئیں
اُسی کو نظم کہتے ہیں۔

انور زاہدی

تمھارے نام ایک نظم

تمہیں سننا تو ایسا ہے
کہ جیسے صبحدم
بارش کا جھونکا چوم لے آنکھیں
چمن سے جس طرح بادِ بہاری
بند کھڑکی کھول کر کمرے میں در آئے
تمہارا لمس۔۔
جیسے ریشم و کمخواب کو چھونا
تمہیں ساحل پہ اپنے روبرو پانا
جہاں میں نیم شب اک خواب
کی حالت میں چلتا ہوں
اُدھر غرقاب کرنے کو مجھے
تم موتیوں کی لہر بن کے بڑھتی آتی ہو۔

انور زاہدی

خواب کی دنیا

سنا تھا خواب میں
تارے زمیں پہ گرتے ہیں
کھلی جب آنکھ تو جلتی ہوئی زمیں ہر سو
سنا تھا خواب میں
رم جھم برستا ہے ساون
کھلی جب آنکھ تو سوکھا ہوا وہی موسم
سنا تھا خواب میں
جو مہربان ہوتے ہیں
کھلی جب آنکھ تو نا مہربان پایا تھا
سنا تھا خواب میں
پریوں سے پیار ممکن ہے
کھلی جب آنکھ تو پریاں نہ تھیں چڑیلیں تھیں
سنا تھا خواب میں
جھیلوں پہ چلنا ممکن ہے
کھلی جب آنکھ تو حدِ نظر پہ صحرا تھا
اگر تھی خواب کی دنیا حسین اتنی تو
نہ خواب ٹوٹتے۔۔۔نہ آنکھ ہی کھلتی اپنی

انور زاہدی

تم سے پھر ملاتا ہے

روز ہی تو جیتے ہیں
علم ہی نہیں ہوتا۔۔۔
زندگی کے مطلب کا
اک ذرا سی غفلت سے
حادثے کا ہو جانا
روشنی دکھاتا ہے
یا ہمیں بتاتا ہے
آج بچ گئے پھر تم۔۔ا
اور زندگی جی لو
کل کا کیا پتہ کیا ہو۔۔؟
کس کی کل کو باری ہے۔۔؟
کون جیت کر آیا
کس نے زندگی ہاری
حادثہ محض ہم کو آشنا کراتا ہے
سرخ رنگ سگنل سے
اور سبز ہو کر پھر۔۔۔
زندگی کے معنی کو
کس طرح بتاتا ہے
تم سے پھر ملاتا ہے۔۔۔

انور زاہدی

اک ہم میں شناسائی تھی

اک ہم میں شناسائی تھی
موسم کی شکل میں
بادل جو اُمڈتے تھے کہیں دور فلک پر
گلشن کی طرح آگ سی
لگتی تھی چھتوں پر
بجلی کے کڑکنے کی صدا دور سے سن کر
تم بال بکھیرے ہوئے
دیوانی سی بن کر
بارش کے برسنے پہ
پھرا کرتی تھیں بے چین
اب دور تلک بھی نہیں وہ سحر کا عالم
ویران چھتیں زیرنگیں
عہد خزاں ہیں
آکاش ہے پھیلا ہوا
صحرا کی شکل میں
بادل کا نشاں ہے'
نہ ہے بارش کی خبر کچھ
موسم بھی ہواؤں کی طرح
روٹھ گئے ہیں
آنکھوں میں بھی
بدلے ہوئے موسم کا سماں ہے۔

تنہا تماپوری (تماپور)

سانس کھوگئی

چولہے کے قہقہوں پہ چلیں
بھوک لکڑیاں
بستر کی سلوٹوں میں
حادثوں کی سوئیاں
مکڑی کا جال بنتی ہوئی
عمر انگلیاں
احساس کا ابلتا ہوا
دودھ پی گئی
حالات بلیاں
سوچا تھا
نئے رنگ بھروں
سانس کھوگئی!!!

☆☆☆☆☆

تازہ تحریر

دل کی بستی میں چاہتوں کے گھر
اور ہر گھر کی سبز دہلیزیں،
سبز دہلیز پر ہیں زرد چراغ،
سب چراغوں کی لوییں
کالی آنکھ،

آنکھ میں اگ رہے ہیں
سرخ گلاب
جن کی ہر پنکھڑی پہ
اک اک بات،
وقت
لکھ کر گذر گیا ہے
ابھی...........
آخری پنکھڑی پہ لکھا ہے
''امن کا خون ہوگیا ہے سعید!!!

☆☆☆☆☆

تنہا تماپوری

بنجر رشتے

اب
حیوانی سوچ
لبادہ آزادی کا
اوڑھ چکی ہے
اسکی عدالت
اپنی شریعت چلا رہی ہے
ہم جنسی رشتوں کی جوڑی
بنا رہی ہے..................
اس رشتے کا نام
لغت میں
کہیں ہیں ہے!!

تنہا تماپوری

وقت کا فیصلہ

گرنے والوں کو کہاں تک
کوئی روکے گا میاں!
آسماں سے تو ستارے بھی گرا کرتے ہیں
گرنے والوں کو اٹھا تو بڑی بات ہوئی،
یا گھڑی بھر کے لئے ہی سہی
افسوس کرو..................
ایسی باتیں ہی سناتے رہے سب
صدیوں سے
سننے والے بھی سدا سر کو ہلاتے ہی رہے سب
وقت
ہر حال میں بڑھتا رہا
آگے کی طرف
اور اک وقت
کسی پیڑ سے
جب سیب گرا
کوئی افسوس نہیں،
سیب اٹھایا بھی نہیں،
بیٹھے بیٹھے وہ بہت دور
کہیں جا پہنچا
سوچ کی گہری گپھاؤں سے

وہ جب لوٹ آیا،
وقت نے
اس کی ہتھیلی پہ
لکھا تھا
''نیوٹن''

☆☆☆☆☆

تنہا تماپوری

انتساب

میری توتلی باتوں سے
تو کتنی خوش تھی
برسوں کی محبت سے
تو نے
مجھ میں اپنے
لفظ اگائے

آج،
وہی الفاظ
شرارت پر اترے ہیں
اجلے کاغذ پر
بکھرے ہیں۔!

☆☆☆☆

تنہا تماپوری

کس لئے

جب سمندر کی جڑوں تک حوصلہ ٹوٹا نہ تھا
سطح پر آیا / تو موجیں
پیٹتی تھیں تالیاں
دیدۂ ہوش وخرد کے سامنے تھیں وسعتیں،
دعوتِ نظارگی دینے لگا تھا آسماں،
پھر ہوا کی سیٹیاں بجنے لگیں چاروں طرف
پھر دلاسہ مل گیا دستِ تسلی سے
مگر..................
قُربِ ساحل کا پتہ دیتی ہوئی
اک موج نے چوما مجھے
اور لبِ ساحل
زمیں کی شاہ زادی
اپنی باہیں کھول کر
بڑھنے لگی میری طرف
چھٹ گئی ہاتھوں سے میرے
کیوں ردائے احتیاط؟!!
میں سمندر میں نہیں
ساحل پہ ڈوبا
کس لئے؟؟

تنہا تماپوری

آخری پلکیں

میں کس کے نقشِ کفِ پا کو ڈھونڈتا ہوں یہاں؟
اڑا کے لے گیا مشتِ غبارِ ماضی کون؟
خیال وخواب میں لاوا اُبل رہا ہے ادھر
اُدھر کھڑے ہوئے الفاظ تھرتھراتے ہیں
کروں تو کیسے کروں قید ایسے لمحوں کو
پسِ غبارِ تخیل پہ چہرے کس کے ہیں؟
یہ آنکھ کس کی ہے؟
کس کے ہیں ہونٹ؟ / کس کی جبیں؟
کسی کی آنکھ نے لوٹا، کسی کے ہونٹوں نے
کسی کے زلف کے سولی پہ چڑھ گیا ہوں میں،
بہک گئی ہیں کسی گال پر مری سانسیں،
کسی کی باہوں میں میرا بدن پگھلتا رہا......
یہ کیا ہوا؟
مری آنکھیں جو یوں ٹپکنے لگیں
کسی کی پلکوں نے آخر انھیں سمیٹ لیا
اسے پتہ نہیں:
میں خود کی دسترس میں نہیں!
کہاں کہاں / مری قسطوں میں
ڈھونڈنا ہے مجھے؟!!

تنہا تماپوری

شب صد تماشہ

خانۂ دل میں لئے دولت بے نام
سنہری لمحے
ایک بے چین سکوں بخش تڑپتی سوغات
دل سلگتے ہوئے
بہکی ہوی سانسوں کی مہک
نور برساتی ہوئی رات میں
دو پیاسے بدن
سیل در سیل
سفر تا بہ سفر
کس کو بتلاؤں بھٹکنے کا سبب؟
منجمد خوابوں میں کس دکھ کا مداوا ڈھونڈوں
دستِ تسخیر میں
سورج ہے نہ مہتاب کرن
صرف شب بھر کی رفاقت
مری مٹھی میں رہی
مجھ کو جی بھر کے
اسی شب میں ابھی جینا ہے۔!!

تنہا تماپوری

عالمِ تشکیک

پیکرِ ورشۂ یقین وگماں
لب گرفتہ
ساعت اظہار کی ہے منتظر
چادرِ حرفِ تمنا کی جسامت مختصر
حسرتِ بے منظری کی
ہمدمِ دیرینہ عافیت کے
سونے پن کو پلکوں میں چھپائے
کھوگئی تھی جب غبارِ وقت میں
کیوں نظارے ہوگئے
لب بستہ، ساکت،
بےصدا
آرزوئے نارسیدہ
قطرہ قطرہ زندگی
اسے بھٹکتے خواب کی
آغوش میں
لمحۂ آئندہ روشن کرگئی..................

شبانہ یوسف (انگلینڈ)

پُکار

اُداس لوگو
نراش لوگو وفا کے شانے سے یہ سرکتی
ڈھلکتی اُمید کی ردا، کہہ رہی ہے تم سے
اب اُٹھ بھی جاؤ/اب اُٹھ بھی جاؤ
یقیں کی پنکھڑیوں پہ یہ ایماں کی جھلملاتی، لرزتی بوندیں
ہراس موسم سے لڑتے لڑتے رَعمل سے خالی
فقط دعاؤں کی، رائگانی سے ڈرتے ڈرتے
یہ کہہ رہی ہیں،
لبوں پہ آ آ کے ٹوٹتی التجائیں، سن بھی لو
لُٹتی ہوئی ثقافتوں کی صدائیں، سن بھی لو
داستاں اک سنا رہی ہیں یہ
مٹتی ہوئی شناختوں کی، ہوائیں، سن بھی لو
اور دھرتی کی اُجڑی آغوش میں
یہ نیلے سمندر اب سرخ ہوتے ہوتے
گگن کی آنکھیں بھی روتے روتے
نڈھال سی، پُر ملال سی، کہہ رہی ہیں کب سے
کہ میرے آنگن میں
سبز وعدوں کی پھر سے اک بار۔۔۔
نئی رتوں کو بلاؤ، خوابوں کی فصل اُگاؤ
اب اُٹھ بھی جاؤ/اب اُٹھ بھی جاؤ
اُداس لوگو۔۔۔نراش لوگو!

شبانہ یوسف

اُس نے پھول بھیجے ہیں

میں اکثر سوچتی تھی
''وہ مجھے سوری کہے گا''
آج اس نے پھول بھیجے ہیں
نہیں! میرا جنم دن تو نہیں
یہ روزِ چاہت بھی نہیں
اور چاہتوں کا دن منانے کے لئے
اک جاں نثاری کے ہنر سے آشنا ساتھی ضروری ہے
مگر روشن دنوں، بھیگی رتوں
کھلتے شگوفوں اور مجھ سے بھی
اُسے کوئی محبت ہی نہیں
کہ برسوں پہلے ہی مکر سے پُر ہواؤں نے
ازل سے موسموں کی آشناؤں نے
حسیں چاہت کے رنگوں سے بنے
سارے گھروندے توڑ ڈالے تھے
مقدر پھوڑ ڈالے تھے
مگر میں نے
وفا کی خواہشوں میں گم
جفا کی بارشوں میں نم
خود اپنے دل کو سمجھانے کی خاطر
اس کی نفرت سے بھری باتوں کے
اُن کم خواب راتوں کے
فقط اپنے ہی مطلب کے معانی بھی نکالے تھے
مگر یوں کب دکھوں کے چاند ڈھلنے والے تھے
پھر بھی
اُسے دل نے کبھی جو چھوڑنا چاہا
ہر اک رشتہ جفا سے توڑنا چاہا
تو کتنے ناگ خدشوں کے
ارادوں کے بدن میں سرسراتے تھے
رگوں میں خوف کا دریا بہاتے تھے
سماعت میں کہیں لفظوں کے ریشم جال بنتے تھے
روایت کی کبھی عزت کی دیواروں میں چُنتے تھے
کہیں معصوم چہرے مسکراتے تھے
مجھے بچے نظر جب آتے تھے
اُس پل سبھی غم بھول جاتے تھے
مگر میں سوچتی تھی
''وہ مجھے سوری کہے گا''
اور اب دیکھو سسکتی سوچ کے پیلے بدن پر
آج کیسی یہ گلابی رُت اُتر آئی ہے
جیسے چاندنی سی چار سو گدرائی ہے
کہ آج اس نے پھول بھیجے ہیں
بہت ہی خاص دن ہے
میرا سفرِ آخرت کا دن
بنا ہے معذرت کا دن
اب اس نے پھول بھیجے ہیں!

شبانہ یوسف

لمحہ

اَنا کے حصار سے
کبھی نکلو تو مُڑ کے اک بار تم دیکھنا
نفرتوں سے پرے، درد کے ریگ زار میں
جُدائی کی تپتی ہوئی رُت میں
یادوں کے گرداب کی ناچتی ان تہوں میں کہیں
راکھ سا کوئی لمحہ
کسی دیپ کے داغ سا کوئی لمحہ
نظر آئے تو تم سمجھنا ابھی زندہ ہوں مَیں
تمھاری رفاقت کا لمحہ سنبھالے ہوئے
جو ٹھہر سا گیا ہے
مری آنکھ کے صحرا میں دکھ کی اک جھیل بن کر
شبِ یخ کے آنچل میں قندیل بن کر

دنوں کی ہتھیلی پہ رکّھا ہوا ہے سلگتا شرار سا
جو دل کے نگر میں بھٹکتا ہے کچھ بے قرار سا
وہ دل کہ جہاں آج بھی خواہشیں بین کرتی ہیں
فرصت ملے تو کبھی مُڑ کے تم دیکھنا
جو مہکتا تھا دل میں کسی ادھ کھُلے سے گلاب ایسا لمحہ
وہی بن گیا ہے عذاب ایسا لمحہ
جو ہر شب مری آنکھ میں دُھل کے ڈھلتا ہے اور
جس کی آغوش میں آج بھی جسم میرا پگھلتا ہے

شبانہ یوسف

شہرِ طلب میں

نیندوں کے جنگل سے ہم نے
خوابوں کی ساری بیلیں کاٹ دی ہیں
پہلے پہلے خواہش کا آنچل تھامے
چلتے رہنا اچھا لگتا تھا
چھاؤں سے ہاتھ چھڑا کر دھوپ میں
جلتے رہنا اچھا لگتا تھا
اک سچے جذبے کی کھوج میں
دھڑکن دھڑکن سنگ ہوا کے بہنا
اچھا لگتا تھا
اور ہوا کب یہ سوچے کس قریہ جانا ہے
کن گلیوں سے دامن کو بچانا ہے
پیڑوں سے ٹوٹے پیلے پتّوں کی صورت
جب ہم بکھرے تو یہ جانا ہے
کہ بے چہرہ زیست کی کوئی صورت نہ بن پائے گی
خوابوں کے چہرے کتنے بھی دل آویز بنا لیں
زخمِ ستم کی خو کب چھوڑیں گے
وقت کا مرہم بھی ان پر لاکھ لا لیں
اب تو سانسوں کی آمد سے
یہ بے آباد بدن دُکھتا ہے
شہرِ طلب میں کوئی خواہش ہو یا جذبہ
خاروں کی صورت چبھتا ہے

جدید ادب شمارہ: ۱۵ ، جولائی تادسمبر ۲۰۱۰ء

ساقی فاروقی (لندن)

صبح کا شور

سفّاک الارم کلاک
کی خواب دوز آواز
اوس کی صورت
پتّی پتّی
نیند کے پھول پر گر رہی تھی۔۔۔
سونے والے نے
آہستہ آہستہ
اپنی پلکوں کے
چمپئی پردے سرکائے
اور سورج مکھی کی طرح
اس جگ مگ دریچے کی طرف نگاہ پھیری
جس پر دھوپ کے ٹوٹے ہوئے سفید پَر
تیز ہوا میں پھڑ پھڑا رہے تھے

احمد ہمیش (کراچی)

سرِ آسماں سرِ زمیں

معلوم نہیں کیا ہوا کہ جنس محبت پر حاوی ہوگئی
گویا محبت ہار گئی اور جنس جیت گئی
جو ہاتھ، ہاتھ میں پیوست ہو سکتے تھے
وہ ہاتھ کہاں ہیں
جو ہاتھ کو تھامے کچھ دور چل سکتے تھے
کیا اُن ہاتھوں کو توڑ دیا گیا
کیا اُن ہاتھوں کو کاٹ دیا گیا
وہ ہاتھ کہاں گئے، جو نظم لکھتے تھے!
وہ ہاتھ کہاں گئے، جو آسمان کو زمین پر اُتار سکتے تھے
کون کب کہاں
پھینکا گیا!
اور اب تو جگنوؤں سے بھرے جنگل میں ماں اکیلی ہے
ایک جگنو بھی نہیں جو روشنی کو حصار کرے
اور ماں کو اُس کے جلو میں لے آئے
اب اتنا سمے نہیں کہ
آسماں یا زمیں اُسے بوسہ دیں

انجلاء ہمیش (کراچی)

اُس کے نام جسے تاریکی نگل چکی

کون پڑھ سکتا ہے باطن کو!
کون چھوٗ سکتا ہے آنکھوں کی ویرانی کو۔۔
کون دیواروں پہ مرتی دھوپ کو اپنے اندر اُتار سکتا ہے!
جب حواس کوڑھ زدہ ہو جائیں
تب جدائی کے زخم سے من اجنبی ہو جاتا ہے
وہ میری آواز کے لمس سے بہت دور ہے
وہ کونسی بنجر زمین ہے
جہاں میرے کسی احساس، کسی کیفیت کی رسائی نہیں
ہوتی
بے تحاشہ چیخ میرے اندر جمع ہے
محبت کس کس طرح سے مذاق بنتی ہے
خدا نے ہر بار میرے دل کو آزمایا
یہ میری خود کلامی ہے، جو مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے
ورنہ مجھے مارنے والوں نے
میرا من خالی کر دیا تھا
اُس نے خاموشی کو اپنا ہتھیار بنایا
اور اُس ہتھیار سے
فریاد کرنے والے کی روح کو زخمی کر دیا
وہ جانتا ہے
تشدد کس کس طرح سے کیا جا سکتا ہے
وہ بیزار ہو گیا اُس آواز سے
جو روک رہی تھی اُسے اندھیروں میں جانے سے

افسوس!
وہ کھو گیا
اُسے تاریکی نگل چکی ہے

ریکھا مَیترے (امریکہ)

مترجم: ستیہ پال آنند

ریکھا مَیترے کی ہندی کوِتائیں

ریکھا میترے ہندی کی معروف شاعرہ ہیں۔ ہندوستان کے تاریخی تیرتھ استھان بنارس میں ان کا بچپن، لڑکپن اور شروع جوانی گذرے۔ اردو اور ہندی کے استادوں کو مشاعروں اور کوی سمّیلنوں میں سنا اور خود کوِتا لکھنا شروع کیا۔ ان کے اب تک آٹھ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اردو میں جس صنف کو ہم ’نثری نظم‘ کہتے ہیں، وہی اس وقت ہندی کی ’پردھان شَیلی‘ (صنف اوّل) کہلاتی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان کی مختصر نظموں میں عام فہم بولی کے الفاظ رہنے دوں اور صرف ان الفاظ کے متبادل ہی لکھوں جنہیں سمجھنا ہندی سے نابلد اردو قارئین کے لیے مشکل ہو۔ ریکھا مَیترے ان دنوں میری لینڈ (امریکا) میں اقامت پذیر ہیں۔ (س۔پ۔آ)

کھڑکی کوِتا کی

بغیر رُکے ہوئے سفر پر چلتی ہوئی
زندگی کی اس گاڑی میں
بھیڑ سے جب سانس میری گھُٹنے لگی
کھڑکی کھول دی میں نے کوِتا کی
اب کبھی تو بھیگے پلوں کی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا
تمام جسم کو تر و تازہ کر دینے لگا
کبھی دُکھوں کے کوئلے، مٹی کے ذرّے
آنکھوں میں چبھنے لگے
لیکن اچھا تو ہے
اب سانس نہیں گھُٹتی میری!

نیند

کئی بار سوچا ہے
پلکوں کے دونوں کواڑوں کو
بند کرتے وقت ایک تختی لٹکا دوں
بغیر اجازت اندر آنا سخت منع ہے
پر، میرے بنائے ہوئے ضابطے
جب میرا دل ہی نہ مانے
تو اور کسی کو کیا کہوں؟
اُول جلُول منظر آتے جاتے ہیں
بند پلکوں کو دھکّا دے کر کھولتے رہتے ہیں

نیند مجھ سے کوسوں دور
کھڑی مجھے تکتی رہتی ہے
جب یہ سب فالتو لوگ چلے جائیں
تب ہی تو وہ آ پائے
اور مجھے تھپکی دے کر سُلائے!

درختوں کی مہمان نوازی

راستے کے دونوں طرف
لمبے اونچے گھنے درخت
اپنی پرچھائیں سے راستے کے
بیچوں بیچ چٹائی بچھاتے ہوئے دکھائی دیں
درختوں کو نہ جانے کیسے
خبر مل گئی کہ ہم
کڑی دھوپ میں نکلے ہیں
سو، بے چاروں نے ہمارے
ستانے کا انتظام کر دیا
اب ہم ان سے کیسے کہتے
ہمیں چلتے رہنا ہوگا
ابھی رکنے کی
کوئی گنجائش نہیں ہے!

لیکن ہم
لوگوں کی بیگانگی کو کیوں برا کہیں
پیڑوں کی مہمان نوازی کی
کیوں نہ تعریف کریں؟

سہ پہر

کبھی کسی کو چلتے ہوئے
یوں بھی دیکھا ہے جیسے
بچپن، جوانی اور بڑھاپا
ایک ساتھ چل رہے ہوں
تبھی لگا ہے مجھے، اس سے پوچھوں
عمر کے پچھلے موڑوں پر
اس نے کیا کچھ کیا، جو
وہ ایک ساتھ ہی
تین تین عمریں جی رہا ہے؟
صحیح وقت پر صحیح عمر
کیوں نہیں جی پایا؟
پھر سوچا ہے
کہیں یہ بات پوچھ کر
اس کے زخم ہرے نہ کر دوں
جن سسکیوں کو
اس نے تھپکی دے دے کر
سلایا ہے، انہیں کیوں جگاؤں؟
جی لینے دوں
اسے عمر کے تیسرے پہر میں
گذرے ہوئے دو پہروں کو بھی!!

پتنگ

پتنگ ہوں تمہاری مَیں
پہلے تو شاندار، شوخ
رنگ سے تم نے سجایا مجھے
ہوا میں تمہارے
دھاگے کے سہارے
اونچا، بہت اونچا
جب اُڑنے لگی، تو
اپنے حسن پر ناز کرنے لگی
بلندی پر اِترانے لگی
تبھی اچانک
ایک اَن دیکھی ڈور آئی
اور میں کٹ کر زمین پر آ گری
تب خیال آیا
ارے، ڈور تو میری
تمہارے ہی ہاتھ میں تھی!

سوئمبر

درخت ان دنوں ہر روز
نئی نئی پوشاکیں بدلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں
سبز سے زرد
پھر زرد سے سرخ

بہار کی تیاری میں
جیسے طے ہی نہیں کر پا رہے ہوں
بہار کی دلہن کون سے رنگ کی پوشاک میں
انہیں دولھا چُننا چاہے گی
قطاروں میں کھڑے ہیں
یہ شہزادے
آنے والی شہزادی کے انتظار میں
جو ''ورمالا'' ہاتھوں میں لیے
بس اب آتی ہی ہوگی!

عبارت پیار کی

تھکا، ٹوٹا ہوا دل تمہارے در پہ آیا
تم نے بڑے جتن سے اس کو بٹھایا
لگاتار استقبال کرنا
پکارنا، دُلارنا
پچکارنا، دل بہلانا
یہ بھکشو کا سا رشتہ
مجھے نہیں بھاتا
تکلف کے سارے داغ
ہونٹوں سے پونچھ ڈالو
رشتوں کی سلیٹ کو
دھو کر صاف کر دو
پھر اس پر لکھ سکوں گی
پیار کی عبارت مَیں!!

جدید ادب شمارہ: ۱۵ ، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۰ء

اکبر حمیدی (اسلام آباد)

انشائیہ

کامیابی کی دیوی

دیوی دیوتاؤں کا تعلق یوں تو یونانی متھالوجی سے ہے۔مگر جس طرح یونانی ادویات ایک زمانے میں ہمارے ہاں بہت مقبول اور شاید مفید بھی رہیں اسی طرح ایک وقت تھا کہ یونانی متھالوجی کے دیوی دیوتاؤں کا بھی ہمارے ادب میں بہت چرچا اور عمل دخل رہا۔ پھران دیوی دیوتاؤں کو علامتی رنگ دے دیا گیا۔عشق کے دیوتا کیوپڈ اور دولت کی دیوتی لکشمی کا ذکر ہم اکثر سنتے رہے۔لکشمی دیوی تو خوش بختی کی علامت بن کر بھی ادب کو باثروت بناتی رہی۔اسی طرح ہم جیسے لوگوں نے دیوی کو مختلف طرح کی معنوی علامتیں دے کر ادب میں شامل رکھا۔مثلاً کامیابی کے امیدواروں نے کامیابی کی دیوی کے خدوخال مرتب کر لیے اور اس کے انتظار میں عمریں بسر کر دیں!

ایک عرصے تک ہم بھی اس خیال میں رہے کہ کامیابی کی سُندر دیوی ایک روز ہمیں تلاش کرتی ہوئی خود ہی ہمارے پاس آئے گی اور چمکتے دمکتے موتیوں کی قیمتی مالا ہمارے گلے میں ڈال کر اپنی نہایت دلنشیں آواز میں کہے گی ''حمیدی صاحب آپ کہاں چھپے بیٹھے تھے..........مَیں کب سے آپ کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی..........لیجیے مَیں زندگی کے عظیم میدانوں میں آپ کا سواگت کرتی ہیں''!۔

ایک طویل عرصے تک ہم انہی سوچوں میں مگن اور دیوی جی کے دل میں اتر جانے والے محبت بھرے الفاظ کی مٹھاس سے لطف اندوز ہوتے رہے اور دیوی جی کے آنے کے دل خوش کُن منظر سے دل کو بہلاتے رہے اور انتظار کی گھڑیوں کو دیوی کے حسین تصور سے رنگین کرتے رہے..........مگر دیوی جی کو شاید ہمارے گھر کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔وجہ غالباً یہ ہوئی کہ ہماری گلی کی نمبر پلیٹ جس پر گلی نمبر 32 لکھا تھا کرکٹ کھیلنے والے لونڈوں کی گیند کا شکار ہو گئی تھی!

ایک مدت تک گھر کے اندر دیوی جی کے انتظار میں بے چین ہو ہو کر ٹہلتے رہے۔کان دروازے پر اور قدم زمین پر..........مگر آخر عالم بیقراری میں باہر کے دروازے کی طرف لپکے۔گھر کا دروازہ کھولا اور باہر گلی میں جھانکا۔وہاں عجیب منظر تھا جس نے ہمیں حیران کر دیا۔کیا دیکھتے ہیں کہ کامیابی کی سُندر دیوی ہمارے آس پاس کے گھروں پر دستک دے رہی ہے اور لوگ تو جیسے پہلے سے ہی اسے خوش آمدید کہنے کے لیے دروازوں کے باہر کھڑے تھے۔ بلکہ بعض تو اس کی تلاش میں دوسری گلیوں میں بھی گھوم پھر آئے تھے۔میں نے ذرا ہمت سے کام لیا اور دیوی جی کو مخاطب کر کے کہا ''اے کامیابی اور عزت وشہرت کی دیوی ہم کب سے آپ کے انتظار میں گھر سے باہر ہیں۔آیئے ہمارے ہاں بھی قدم رنجہ فرمایئے۔''

تب دیوی جی مسکراتی ہوئی ہماری جانب بڑھیں مگر ایک کاغذ ہمارے ہاتھوں میں تھما کر ہنستی مسکراتی ہوئی واپس ہوئیں۔حیران ہو کر پوچھا ''ہم تو آپ کے ہاتھوں سے قیمتی موتیوں کی مالا کے امیدوار تھے۔کامیابی

اور عزت وشہرت کی خاطر ہم نے برسوں لہو پانی ایک کیا ہے۔محنت اور مشقّت اٹھائی ہے۔اب قیمتی موتیوں کی مالا پر ہمارا بھی حق ہے۔آپ نے ہم سے کمتر درجے کے لوگوں کو مالا پہنائی ہے اور اب یہ کُھلی ناانصافی ہے''۔

کامیابی کی دیوی نے مسکراتی نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور کہا..........''اس دَور میں لہو پانی کو اور محنت مشقت کو کیش کروانے کی ضرورت ہے اور آپ نے اس پر توجہ نہیں دی۔''! پھر کہا ''اس کاغذ پر کچھ آسان نسخے درج ہیں انہیں استعمال کریں اور پھر قدرت کے کرشمے دیکھیں''۔

سو ہم نے ان نسخوں پر غور کرنا شروع کیا۔سب سے پہلے اپنی خاندانی وجاہت پر غور کیا جو وجاہت سے زیادہ شرافت نکلی اور یہ کوئی کارآمد چیز نہیں تھی۔بس سیدھے سادے کسانوں کا خاندان تھا جو کام کرنے کو اہمیت دیتے ہیں۔مہربان اور مشفق اساتذہ کی طرف دھیان گیا جنہوں نے ہمیں تربیت کیا تھا۔سو یاد آیا کہ وُہ بھی ہمیشہ محنت کی عظمت پر ہی زور دیا کرتے تھے۔پھر اخلاقیات میں اقبال کی دی ہوئی ''خودی'' پر نظر پڑی۔پتہ چلا ہم نے اسے خواہ مخواہ سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔یہ تو بڑی مہنگی چیز ہے اور اس کے اچھے خاصے دام مل سکتے ہیں۔بعض لوگوں نے تو اسے فروخت کر کے غریبی میں بھی اچھا خاصا نام پیدا کر رکھا ہے!

بس پھر کیا تھا ہم ساری صورتِ حال کو سمجھ گئے۔جی ہی جی میں وہ سب ٹوٹکے اپنا لیے جو دوسروں کے لیے عزت وشہرت اور کامیابی وکامرانی کا باعث بن رہے تھے کہ ہمارے ہاں کی زیادہ تر کامیابیاں انہی ٹوٹکوں کی مرہونِ منت ہیں۔کامیابی کی دیوی نے جاتے جاتے ہمیں جو نصیحت کی تھی وہ کاغذ پر لکھی ہوئی تھی ''اِس دَور میں لہو پانی ایک کرنے کی بجائے لہو پانی کو کیش کروانے کی ضرورت ہے۔'' سو ہم خاندانی شرافت، محنت کی عظمت، اقبال کی خودی اور ایسی ہی بہت سی قیمتی اشیا ریڑھی پر سجا کر گھر سے نکلے اور آواز لگائی۔

''ہر شے ایک ایک روپے میں جو چاہو لے لو''۔۔۔لیکن اس سے پہلے کہ کوئی گاہک ہماری طرف آتا ساری گلی دن کی روشنی کے باوجود ایسی غیر معمولی روشنی سے جگمگا اٹھی کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔حیران ہوئے کہ کیا ہونے والا ہے۔سامنے دیکھا کہ کوئی دیوی ہیرے جواہرات کی مالائیں ہاتھوں میں لیے ہماری طرف نہایت سنجیدہ چہرے کے ساتھ آ رہی ہے۔دیوی ہمارے قریب آ کر رُکی اور پھر بڑے جاہ وجلال کے ساتھ بولی۔

''اکبر حمیدی صاحب..........آپ نے ہمارا انتظار نہ کیا اور کامیابی کی جھوٹی دیوی کے فریب میں آ گئے۔محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی اور سچائی اور خودداری سے ہی ہمیشہ عزت حاصل ہوتی ہے (پھر ریڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) ہٹایئے یہ کام آپ کے شایانِ شان نہیں'' کامیابی کی دیوی نے پاؤں کی ایک ٹھوکر سے ریڑھی کو ایک طرف ہٹا دیا اور مسکراتے ہوئے کہا: ''حمیدی صاحب ہمارے آنے میں اکثر تھوڑی سی تاخیر ہو جایا کرتی ہے۔مگر بھروسہ رکھیے ہم آپ کی طرف آ رہے ہیں..........آج نہیں تو کل''!۔

اور پھر سورج دیس کی یہ شہزادی دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔تب مجھے یہ شعر یاد آیا۔

میں کہتا ہوں آج وہ کہتی ہے کل

مجھے اندازہ ہوا کامیابی اُن لوگوں کے لیے ہے جو کل کا انتظار کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور آج کا شکار نہیں ہو جاتے!!

محمد زبیر ٹیپو

انشائیہ

جوٹھا

جوٹھا کھانا کوئی بھی پسند نہیں کرتا، شاید کہ روزِ ازل سے انسان کے شعور میں اس کے خلاف نفرت پیدا ہو چکی ہے۔ انسان کے ساتھ ہوا بھی یہی کچھ ہے۔ خدا کے سامنے انسان سے پہلے شیطان کھڑا تھا۔ دوسری جگہ جانے سے بیشتر ہی وہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ زمین پر آنے سے پہلے بھی زمین پر بہت سی مخلوقات تھیں تو کوئی بھی صاحب عقل اور عقل دشمن اور پاگل تک جوٹھا کھانے کو تیار نہیں جوٹھا پہننے کو تیار نہیں۔ جبکہ یہ تو انسان کے ہمزاد کی طرح کا ایک قیمتی اور انمول ہمسائیہ ہے جو انسان کو اس کی پیدائش سے لے کر آخری سانس تک میسر ہے لیکن انسان ہے کہ جو بات جو معاملہ اس کو آسانی سے حاصل ہو اُس سے نفرت اور اکتاہٹ کا اظہار کرنے لگتا ہے۔

میرے نزدیک تو جھوٹا نعمت خداوندی ہے جو ہمیں پہلی سانس سے آخری دم تک برابر مفت میں ملتا ہے مثلاً انسان کا علاج معالجہ ہی دیکھ لیجئے۔ انسان سے پہلے کن کن جانداروں پر اس کے تجربے کیے جاتے ہیں پھر انہی کے آپریشن میں استعمال ہونے والے آوزاروں کی شکل کے آوزار انسان کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں ۔ادویات انسان کو استعمال کرانے سے پہلے چوہوں، بندروں، مینڈکوں سے جوٹھی کروانے کو تجربے کا نام دیا جاتا ہے پھر انسان کے لیے مفید قرار دیا جاتا ہے۔ جس کو انسان خوشی سے اپنے لیے خریدتا ہے اور صحتمند ہو جاتا ہے۔ انسان نے اپنی پیدائش سے لے کر مرنے تک تمام اسباب لاشعوری اعتبار سے اسی جھوٹے پن سے حاصل کیے ہیں۔ مثلاً اٹیم بم جو ایجاد کیے۔ تو سب سے پہلے چھوٹے موٹے جانداروں پر تجربے کیے۔ پھر زمین پر تجربے کیے اور اب بھی کوئی موقع محل ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ روز اِن میں اضافہ کرتا ہے اور روز نئی زمین تلاش کرتا ہے جہاں کامیاب تجربے ہوں۔

انسان کے پاس علوم جتنے بھی ہیں۔ سب جوٹھے ہیں یعنی کس کے دیئے ہوئے۔ انسان کو دنیا میں بھیجنے والے نے اپنی تحریر میں اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ جن علوم کی گُتھیاں آہستہ آہستہ انسان کھول رہا ہے اور اس کھولنے کے عمل کو اپنی دنیوی برتری خیال کرتا ہے وہ آج کے انسان کے جدِ امجد کے شعور میں تھے۔ انسان کی روحانی اور معاشرتی نظام کی ضروریات بھی جوٹھی ہیں۔ جن کی وجہ سے آج انسانی ذہانت مختلف تعصّبات کا شکار ہے۔ شعوری آگہی کی منتقلی بھی جوٹھے کی علامت ہے ایسی بعض چیزوں کے استعمال میں انسان کا مفاد ہے اور بعض جوٹھی اشیا اور معاملات کے بے سوچے سمجھے اختیار کرنا نقصان ہے لیکن انسان اس کی پرواہ نہیں کرتا۔

انسان سامنے پڑا ہوا جوٹھا نہیں کھاتا۔ لیکن اُس کی غیر موجودگی میں اگر کوئی جوٹھا کر جائے تو علیحدہ بات ہے۔ اُس کو نعمت جان کر کھا جاتا ہے۔ انگریز کو یہاں سے گئے ہوئے مدتیں ہوئیں لیکن آج بھی اُس کا جوٹھا نظام رائج ہے۔ پھر ہم اپنے بچوں کے نام بھی جوٹھے رکھتے ہیں نقل کرنا بھی دراصل جوٹھے پن میں شامل ہے جو ہر طالب علم کرنے کا موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ہے۔

مَیں اکثر اپنی والدہ صاحبہ سے اُن کا نام پوچھتا ہوں وہ بڑی اُداس ہو کر فرماتی ہیں۔ آج کوئی بھی مجھے نام سے پکارنے والا نہیں رہا۔ میرے والدین اور چچے اور چچایاں اور سُسرال میں کچھ لوگ تھے جو مجھے سلیمہ بیگم کہہ کر پکارتے تھے وہ آج نایاب ہو چکے ہیں۔ میری نسل یا تھوڑی بڑی کے قریبی عزیز و اقارب حدِ ادب کی وجہ سے والدہ کا نام نہیں پکارتے صرف رشتے کا نام لیتے ہیں۔ یعنی ایک خاص عمر تک پہنچنے کے بعد بھی رسمی شناخت پریڈ کا ہونا ضروری ہے تاکہ وہ شخص تر و تازہ نظر آئے۔

ماں کی آغوش سے انسان جنم لیتا ہے وہ مسلسل جوٹھی ہوتی رہتی ہے بچہ اس عمل کو روک نہیں سکتا۔ ایسے ہی ایک ماں کی آغوش سے پیدا ہونے والے بچوں کا دل ساری عمر ایک ساتھ نہیں دھڑکتا بھلے دنیا کے لالچ اُن میں وقتی بول چال بند کرا دیں، لیکن ایک دوسرے کی تکلیف کو جیسا وہ محسوس کریں گے کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

دراصل مادی برتن جوٹھے ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتے وہ تو صاف ہو جانے کے بعد کار آمد ہو جاتے ہیں اصل تو شعور کو جوٹھا کرنے کا ذمہ دارنہ رویہ ہی کائنات میں مثبت تبدیلیاں لا سکتا ہے۔

جنت میں بے شمار مخلوق پہنچ چکی ہے۔ اس کے باوجود لوگ اس جوٹھی جنت میں جانے کے خواہش مند ہیں۔

دنیا میں بادشاہت کے نام پر موروثی بادشاہت کا نظام چل نکلا یہ ایسا جوٹھا گلاس ہے خاندان اور بغیر خاندان کا ہر آدمی اس کو پینا چاہتا ہے خواہ اس کے لیے اُسے کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ ایسے ہی موروثی جائیداد کا تعلق انسانوں سے ہے کہ انسان اس کے باعث صدیوں سے آپس میں نفرتوں کا شکار ہوتا چلا آیا ہے۔

ہوا، پانی، آگ یہ بھی جوٹھے پن کی بڑی علامتیں ہیں ایسے ہی انسان ایک پل میں اُڑنا دوسرے میں تیرا کی اور تیسرے میں غصے کا اظہار نہیں کرتا۔ اڑنے سے مراد خیالات کے ذریعے سوچنا اور پل بھر میں میلوں کا سفر طے کر جانا اور تیرا کی کا معنی صبر و تحمل سے کام لینا اور غور و فکر بھی ہے آگ کا معاملہ جنگ و جدل کا شوقین ہونا ہے۔

بعض جذبے جن کو لفظوں کے نام سے جانا جاتا ہے صدیوں سے آزمائے چلے آرہے ہیں جو کہ انسان کی عظمت کا سبب بھی ہیں اسی طرح وہ جذبے جو انسان کے اندر تبدیلیوں کے ذریعے موسموں اور رنگوں کو بدلتے ہیں۔

انسان آج ترقی کی جس منزل پر پہنچا ہے، وہ اس لیے پہنچا ہے کہ اُس نے اپنے علوم سے استفادہ کیا ہے اس زاویہ نظر سے دیکھیں تو انسان کی ساری ترقیاں سارے علوم سارے فنون ساری عظمتیں پہلے آنے والوں کی جوٹھ پر مبنی ہیں مگر یہ جوٹھ انسانوں کے لیے کس قدر مفید ثابت ہوئی ہے۔

محمد زبیر ٹیپو

خاتون بل

لیجئے جناب! آپ لوگوں کی عیاشی بند، سیر وتفریح کا مزہ پھیکا، کھانوں کے ذائقے بھی بند، بچو تمھاری الٹی گنتی کے دن شروع، اب اخبارات میں بھی حسین دوشیزہ اور تتلیوں جیسے خوبصورت القابات دیکھنے کو نہیں ملیں گے جن کو پڑھ مرد قارئین کے جنسی رونگٹھے کھڑے ہو جاتے تھے اور اخباری صفحات پر غیر ادبی چاشنی پیدا کی جاتی تھی۔ بجائے ان کے اب مندرجہ ذیل نئے الفاظ کا استعمال ہوگا ملکہ عالیہ، شہزادی محترمہ، بیگم صاحبہ، پھوپھی جان، باجی جی، آنٹی جی، ممانی جی، چچی حضور، والدہ صاحبہ جیسے باعزت اور بارعب لفظ اخبارات کے صفحات کی زینت بنیں گے اور آپ لوگوں کی زبان پر بھی آہستہ آہستہ آ ہی جائیں گے۔

ابھی خواتین پَر تو ُل ہی رہی تھیں، کہ میرے دوست جبار جنہوں نے زناٹے دار مونچھیں رکھی ہوئی تھیں مجھے مشورہ دیا تم بھی ایسی مونچھیں رکھ لو۔ مَیں کبھی کبھار عقل عظیم سے کام لے لیتا ہوں یا چھٹی حس خود ہی غور وخوص کرنے کے بعد میرے کان میں خطرے کی گھنٹیاں بجانے لگتی ہیں اور مَیں اس طرح کے نامعقول مشورے پر عمل درآمد کرنے سے رک جاتا ہوں۔ اگلے دن صبح جب مَیں دفتر پہنچا تو معلوم ہوا پچھلی شام کو اسمبلی میں خواتین کے ساتھ کچھ مردلوٹوں نے بھی اس کارِ خیر کے بل میں برابر کا حصہ ڈالا ہے، ابھی شام کے وقت کے کچھ لمحات باقی تھے۔ اُس دوست نے بتایا تمہاری بھابھی نے ان کو چہرے سے مونچھیں صاف کرنے کا کہا ہے چونکہ وہ ان سے خوف زدہ ہیں۔ بل کی اچھی باتیں بتائیں پانچ لاکھ جرمانے اور چند سال قید بامشقت کا بل پاس ہو گیا ہے۔ مَیں آپ کے خلاف مونچھوں کے ذریعے خوف و ہراس میں مبتلا کرنے کی رپورٹ تھانے لکھوانے جاؤں گی۔ جبار صاحب کو بھابھی کی بات پر شک تھا لیکن وہ بڑا اتراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ جبار نے کیبل ٹیلی ویژن آن کیا تو ایک نیوز چینل پر یہ خبر نشر ہو رہی تھی اور نیوز کاسٹر خاتون بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ ان کو اس چینل پر اعتبار نہ تھا۔ انہوں نے سوچا یہ اکثر دوپہر بارہ بجے اور شام کے وقت شائع ہونے والی اخبارات کی طرح جھوٹ بول رہا ہے۔ انہوں نے تین چار مستند چینل یکے بعد دیگرے تبدیل کیے، سب پر ایک ہی خبر اور ساتھ تبصرے جاری تھے۔ اللہ ان نیوز چینل والوں کا بھلا کرے، چھوٹی سی بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں لیکن بل ایک دفعہ پاس ہوا یہ سو دفعہ اس کو نشر کر رہے ہیں۔ ہمیشہ جلتی پر تیل چھینکتے ہیں۔ اوپر سے بھابھی جان کی طرف سے بھی دھمکی۔ میرے وہ دوست ساڑھے گیارہ بجے رات کو شدید سردی میں مارکیٹ ریزر لینے کے لیے پہنچے تو معلوم ہوا کہ صرف تین چار دُکانیں کھلی ہیں۔ ایک کریانے کی دُکان کے پاس ریزر پڑے ہیں لیکن وہ من مانی قیمت وصول کر رہا ہے۔ میرے ان دوست نے ریزر بلیک میں خریدا، یعنی دُکان دار نے پچیس روپے کے ساتھ سو کے

نوٹ کا سرخ رنگ چیک بھی کیا۔ اب میں جان گیا کہ ٹیلی ویژن کے اشتہارات میں خصوصاً ریزر کے اشتہار میں خواتین مردوں کے ساتھ کیوں چپکی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مرد ریزر سے شیو کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مردانا شیو ہے۔ اس کے بعد ماڈل خاتون مرد ماڈل کے چہرے پر ہاتھ پھیر کر ملائم ہے وغیرہ وغیرہ کے نعرے کیوں بلند کرتی ہے، اکثر خواتین مردوں کی مونچھوں اور ڈھاڑیوں کے خلاف کیوں ہیں؟

یہ بات اب طے ہے کہ مستقبل قریب میں خواتین کے درمیان خانہ جنگی کا آغاز ہونے والا ہے اب کیا زمانہ قدیم سے خواتین کے ہاں خوبصورتی کی چار پانچ کلاسیں قائم ہو چکی ہیں۔ اب جو خواتین درجہ تین اور چار کی خوبصورتی میں ہیں۔ مرد اُن کو دیکھ کر گزارہ کر لیا کریں گے۔ اس طرح درجہ اول اور دوم کی ایک الگ پارٹی بن چکی ہوئی ہے ان کے درمیان اسی بات پر اختلافات کا آغاز ہوگا اور آہستہ آہستہ ملک عزیز کے گھروں گلی محلے شہر اس خاتون وحشت کا شکار ہوں گے۔ یہ طالبان، القائدہ، اور امریکا کی تباہی سے یہ بھی بڑا معاملہ ہے۔

بہر حال جو اچھی بات ہے ہم ہر بات کا اُلٹا مطلب لیتے ہیں مثبت پہلو چھوڑ دیتے ہیں اس سے مزید اگلی شام کو مارکیٹ اور راستوں، پارکوں، بس اسٹاپوں وغیرہ وغیرہ پر مونچھوں، ڈھاڑیوں سے آزاد مرد دیکھئے صاف ستھرے، اُجلے اُجلے، چمکتے تر و تازہ نکھرے نکھرے مرد چہرے نظر آئے جو اپنی عمروں سے آدھے دکھائی دیئے اللہ بھلا کرے اس قدر حیرت انگیز بل اور تبدیلی پر۔ اس بل سے ہر مرد متاثر ہوگا خواہ وہ ان کا باپ، بھائی، شوہر، بہنوئی، پھوپھا ماموں وغیرہ وغیرہ یہاں تک کہ ججز اور وکلا بھی متاثر ہو سکتے ہیں۔ دُکان دار جنہوں نے من مانی قیمتیں وصول کرنا اپنی عادت بنالی ہے۔ اب خیال ہے کہ خواتین کی باون فیصد آبادی اس کی رُک تھام کر سکے گی۔ دوسری اہم بات یہ باون فیصد آبادی میں نومولودہ کو چھوڑ کر باقی تمام خواتین سروسز میں آجائیں گی اور گھریلو خواتین بھی اپنے مردوں سے تنخواہ اور پنشن کی حق دار ٹھہریں گی۔ ریڑیوں پر فروٹ مہنگے داموں فروخت ہوگا چونکہ اب خواتین مردوں کو سیل کریں گی، قصاب کی دُکانوں میں بھی خواتین گوشت فروخت کرتی ہوئی نظر آئیں گی یعنی خون خار بھی ہو جائیں گی۔ خواتین کی عدالتوں میں گواہی بھی آدھی کی بجائے پوری شمار ہوگی ورنہ جج صاحب کے خلاف الٹے دو تین مقدمات بن سکتے ہیں۔

یہ بل پاس کروانے میں چند ایک مردلوٹوں کا ہاتھ ہے بعد میں وہ خود اور ان کے بچے بھی اس کی زد میں آسکتے ہیں۔ اب غریبوں، دیہاڑی داروں، ریڑھی والوں، جاگیر داروں، خانوں اسمبلیوں کے ممبران، صنعت کاروں، وڈیروں، زخیرہ اندوزں کے ہاتھوں میں اُلٹی چوڑیاں ڈالی گی ہیں اگر انہوں نے اب کسی بہن بیٹی کی زبردستی شادی کی یا پسند کی شادی بھی نہ ہونے دی یہ خواتین کی طرف سے مردوں پر پھینکی جانے والی اسی جوتی ہے جو جادوائی طور پر اثر انداز ہو گی۔

مرد آئندہ زنانہ گالیاں بھی ایک دوسرے کو بلند آواز میں لڑائی جھگڑے کی صورت میں نہیں دیا کریں گے اور اب سے بندے کا پتر کہلوانے کی بجائے بندی کا پتر کہلوانے میں فخر محسوس کریں گے مَیں نے کافی باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے۔ مردوں کے اعتبار سے تو مشرقی معاشرہ ویسے ہی بدنام ہے جتنے ظلم وستم عورتیں ایک دوسرے پر کرتی ہیں مثلاً ساس اور بہو، نند بر جائی، یہاں تک کہ ماں جیسے انمول رشتے میں بھی عورتیں ایک دوسرے کے

ساتھ ناانصافی کرتی ہیں ماں ہی بیٹی کو مناسب غذا فراہم نہیں کرے گی، اُلٹا بیٹے کو ہی لاڈ لا رکھیں گی۔ یہاں تک کہ رشتوں ناطوں کو طے کرتے وقت بھی اور آپس میں لین دین میں جتنی گھٹن ،طعنوں، مکاریوں، چالاکیوں، منافقتوں کا استعمال خواتین کرتی ہیں مرد نہیں۔ اگرچہ عورتوں کے خلاف اس نامناسب رویئے پر بھی ایک بل پاس ہونے کی ضرورت ہے بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھنے والی بات ہے۔ مردوں سے تو یہ کرنا ممکن نہیں۔
آج سے مردوں نے نئی سکیم تیار کر لی ہے خواتین کو ٹیلی ڈراموں، مذاکروں ،اشتہاروں میں دیکھ کر دل کو بھلا لیا کریں گے۔

مردوں بچاروں کی عادات آپ نے خود ہی بگاڑی ہوئی ہیں۔ اکثر خواتین جب گھر میں موجود ہوتی ہیں تو میک اَپ میں نہیں ہوتیں تاکہ اُن کے مجازی خدا ان کو دیکھ نا لے اور جونہی گھروں سے باہر نکلتی ہیں یعنی مارکیٹ وغیرہ کے لیے تو خوب میک اَپ کر کے شاپنگ کرنے کے لیے جاتی ہیں اپنے مرد کے لیے بدصورتی اور دوسروں کے مجازی خداؤں کے بھکانے کے لیے یہ سارے جتن اوپر سے ایک دم اس طرح کا ظلم وستم کرنا خلاف مردانگی ہے۔ وہ بچارے بم دھماکے کرنے پر تُل جائیں گے اور اس طرح ہو سکتا ہے کہ کچھ خواتین مردوں کے ساتھ اس ناروا سلوک روا کرنے کے خلاف سڑکوں پر نکل آئیں۔

خواتین کی خواہش عظیم ہے کہ وہ بڑھاپے میں بھی جوان نظر آئیں شاید کسی ظالم عقل عظیم کے فلاسفر کے جملے سے متاثر ہو گئی ہوں کہ گھوڑا اور مرد کبھی بوڑھے نہیں ہوتے اور نکلی ہیں بڑھاپے میں بھی جوان نظر آنے کے لیے یہ تو سوچیں کہ مرد کی مثال کس سے دی جا رہی ہے یعنی جانور سے۔ کیا آپ بھی؟ اس طرح گھٹیا جملہ بازی سے متاثر نہ ہوں اور اپنے اوپر کنٹرول کریں۔ جوانی ہی سے نوجوان اور بڑھاپے میں جوان نظر آنے کی خوبی پر قابو پائیں ورنہ شمع پر پروانے تو قربان ہو جانے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ مرد گھروں سے نکلنا چھوڑ دیں گے ہر دفتر، فیکٹری، کارخانے اسمبلی میں عورتوں کا راج ہو گا جیلر بھی خواتین ہوں گی۔ آئندہ الیکشنوں میں خواتین عام نشتوں سے نہ جیتیں تو سب مرد ووٹرز جرمانے کے ساتھ جیل کی چکی پس رہے ہوں گے۔

ان بہنوں، پھوپھیوں، باجیوں، ماؤں سے درخواست ہے کہ وہ ایسا ظالمانہ قانون پاس نہ ہونے دیں چونکہ انہی کے بھائی، بھیجتے، بیٹے، خاوند وغیرہ وغیرہ جیلوں میں بند ہوں گے اس لیے کسی عقل مند نے کہا ہے کہ جتنی جتنی رشتے داری ہوتی ہے اتنی اتنی تکلیف بھی اٹھانی پڑتی ہے۔ اگر آپ سوچیں تو آپ گھروں میں بچوں کی نگہداشت پر غور وفکر کرنے کے ساتھ ہی یہ فیصلہ کر لیں کہ گھر ہی سے بچوں کی اخلاقی تربیت کرنی ہے تو پھر کسی قانون کی ضرورت نہیں، ویسے بھی اس طرح کی غیر ضروری عقل مندی نے ہمیشہ الٹا ہی اثر دکھایا ہے بلکہ یہ تو خواتین اپنی ڈیوٹی سے غفلت اور منافقت سے کام لے رہی ہیں۔ مجھے میری والدہ اور بہن، پھوپھی، چچی جان وغیرہ نے تربیت ہی ایسی کی ہے کہ مَیں سوچ بھی نہیں سکتا کہ راستہ چلتی خاتون اور گھر میں بیٹھی بیوی اور دیگر رشتوں کے عورت کو ہراساں کروں اور اگر کرتا ہوں تو یہ ذمہ داری ان کی غلط تربیت کا نتیجہ ہے۔ سو فیصد قانونوں کی اجارہ داری تو ترقی یافتہ ممالک میں بھی نظر نہیں آئی ہے۔ ہاں اگر کہیں نظر آئی تو وہ اخلاقی تربیت کے سبب ایسا ہوا ہے۔

حیدر قریشی

کھٹی میٹھی یادیں

لبّیك الهمّ لبّیك

قل ان کانت لکم الدّارالآخرة عندالله خالصة من دون الناس فتمنو الموت ان کنتم صادقینo ولن یتمنوه ابداً بما قدمت ایدیهم ط والله علیم بالظّٰلمینo
(سورۃ **البقرۃ** ۔آیت۹۴۔۹۵)

(**ترجمہ:** تو ان سے کہہ اگر اللہ کے نزدیک آخرت کا گھر (باقی) لوگوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے ہے، تو اگر تم دعویٰ میں سچے ہو تو موت کی خواہش کرو۔ (یاد رکھو کہ) جو کچھ ان کے ہاتھ آگے بھیج چکے ہیں، اس کے سبب سے وہ کبھی بھی (موت کی) تمنا نہیں کریں گے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے)

مجھے جنوری ۲۰۰۹ء میں ایک خواب کے ذریعے واضح طور پر بتایا گیا کہ ۳۱ر دسمبر کو میری وفات ہو گی۔ میں یہ تحریر نومبر کے آخری عشرہ میں لکھ رہا ہوں اور قارئین تک تب پہنچے گی جب ۳۱ر دسمبر ۲۰۰۹ء گزر ہو چکا ہو گا۔
زندگی کے معاملہ میں دو جمع دو چار کی طرح کوئی دوٹوک اور حتمی بات کہہ کر گزر جانا ممکن نہیں۔ ہر انسان کی زندگی اس کے اپنے ڈھب سے ہوتی ہے۔ زندگی نے اس کے ساتھ کیا کیا اور اس نے زندگی کے ساتھ کیا کیا؟ دونوں معاملات ہی ہر انسان کی ذات اور اس کی اپنی کائنات کے حوالے سے ہوتے ہیں۔ میری چھوٹی سی کائنات خاندانی سطح پر میرے والدین، بہن بھائیوں، بیوی، بچوں اور ان سب سے منسلک رشتہ در رشتہ کہکشاں پر مشتمل ہے۔ ان سارے رشتوں کا ذکراذکار میرے، خاکوں اور یادوں میں نمایاں طور پر اور دوسری اصناف میں بھی کسی نہ کسی رنگ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اب کہ عمر کے اس حصے میں ہوں جب بندہ اِس دنیا سے آگے کی دنیا میں جانے کے لیے بوریا بستر باندھنے میں لگا ہوتا ہے، میں نے بھی کچھ عرصہ سے اپنا بوریا بستر باندھنا شروع کر رکھا ہے۔ اگلی دنیا میں جانے کی تیاری کے ساتھ اِس دنیا سے لذت کشید کرنے کا عمل بھی میں نے کم نہیں ہونے دیا۔ میری اہلیہ مبارکہ ان معاملات میں ایک حد تک میرے ساتھ ہے اور ایک حد تک مزاحمت کر رہی ہے۔ اس دنیا کے معاملات میں تو نہ صرف اس نے مزاحمت نہیں کی بلکہ بڑی حد تک پردہ پوشی بھی کی ہے۔ البتہ اگلی دنیا کے معاملہ میں اس نے شدید مزاحمت کر رکھی ہے۔ اس

حوالے سے جوتازہ ترین صورتحال ہےاسے بعد میں بیان کروں گا پہلے گزرے دنوں کا کچھ ذکرضروری ہے۔

۱۹۹۶ء میں مبارکہ کو Rheumatism کی بیماری کی ابتدا ہوئی تھی۔ پہلے تو بیماری کی نوعیت سمجھ میں نہیں آئی۔ پتہ نہیں یہ ''روئے ماٹ ازم'' کونسی اللہ ماری ولایتی بیماری لاحق ہوگئی ہے۔ہم نے تو سوشلزم، کمیونزم، کیپٹل ازم کے نام ہی سن رکھے تھےاور مبارکہ کوان میں سے کسی سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ بہرحال بیماری کی نوعیت کا جب کچھ کچھ اندازہ ہواتواس کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے میں نے ۱۹۹۶ء ہی میں ایک غزل میں کہا تھا:

دیکھو مجھے اس حال میں مت چھوڑ کے جانا — دل پر ابھی میں نے کوئی پتھر نہیں رکھا

پھر مبارکہ نہ صرف اس بیماری کی عادی ہوگئی بلکہ Rheuma نے بھی اس کے ساتھ دوستانہ برتاؤ شروع کر دیا۔ بارہ تیرہ برس علاج معالجہ کے ساتھ آرام سے گزر گئے۔مبارکہ کی علالت اوراپنے شروع میں بیان کردہ خواب کا مزید ذکرذرا آگے چل کر۔۔۔۔ یہاں یادوں کے اس نئے باب کے تناظر میں اپنی پرانی تحریروں کا تھوڑا سا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

بیسویں صدی کے آخری سرے پرلکھی گئی میری یادوں کے باب ''دعائیں اورقسمت'' کا اختتام ان دعائیہ الفاظ پرہوتا ہے۔

''اب یہی دعا ہے کہ ایسی ہی دافع البلیّات دعاؤں کے سائے میں زندگی کا یہ سفرآسانی کے ساتھ' حفاظت کے ساتھ' اور بے حد آرام وسکون اور اطمینان کے ساتھ مجھے اگلی دنیا میں لے جائے۔موت میرے لئے دُکھ کا مُوجب نہیں راحت کامُوجب بنے۔ہجر کا احساس نہیں بلکہ وصل کا پیغام ہواور وصل کا راحت بھرا پیغام تو جب بھی آئے' عشّاق کی خوش نصیبی ہوتا ہے۔''

یہ کوئی دنیا کو جتانے یا بتانے کا رویہ نہیں ہے بلکہ زندگی کے مقابلہ میں موت کے تئیں میرا یہ رویہ میری ابتدائی شاعری سے اب تک کسی کسی نہ رنگ میں آتا چلا گیا ہے۔زندگی اور موت کے معاملہ میں میرا رویہ میرے مزاج کی ترجمانی کرتا ہے۔مثلاً میرے شعری مجموعوں کی بالکل ابتدائی غزلوں سے لے کراب تک کی شاعری کے یہ اشعار دیکھیں۔

موت سے پہلے جہاں میں چندسانسوں کا عذاب — زندگی! جو قرض تیرا تھا ادا کر آئے ہیں

دیکھا خلوص موت کا تو یاد آ گیا — کتنے فریب دیتی رہی زندگی مجھے

چلو پھر آنکھیں کروچار موت سے حیدؔر — پھر آج موت کی آنکھوں میں زندگی بھردو

زندگی! دیکھ بجھتے ہوئے لوگ ہم — بزمِ جاں میں چمکتے رہے رات بھر

ابھی ممکن ہی نہیں قرض چکانا تیرا — زندگی! قرض ترا ہوگا ادا میرے بعد

موت کی بھی حقیقت انہیں سے کھلی — زندگی کے جو دل میں دھڑکتے رہے

موت کو چھو کے دیکھنا ہے ذرا — زندگی، اپنی دیکھی بھالی ہے

گزشتہ برس میری دوغزلوں میں اس حوالے سے زیادہ کھلا اظہار سامنے آیا:

کفن مرے لیے دامانِ یار ٹھہرے گا — چلوں گا کوچۂ دلدار میں لحد کے لیے

تمام خواہشیں حیدؔر کبھی کی چھوڑ چکے — کہوتو خود سے بھی اب ہم کنارا کرتے ہیں

ایسے اشعار کے زمانی تسلسل کے درمیان میں کہیں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا جب موت مجھے کچھ دیر تک دیکھتی رہی۔ساتھ لے جانے کا ارادہ کیا، زندگی کے ساتھ کچھ دیر کے لیے الجھی، مگر پھر خاموشی سے واپس چلی گئی۔اُس وقت کی کیفیات میری تب کی ایک غزل میں موجود ہیں۔

موت آئی ہوئی ہے مجھے لینے کے لیے اور — یہ زندگی پاس اپنے ہی رکھنے پہ اڑی ہے

ہے زندگی و موت میں اک معرکہ برپا — جیتے کوئی، ہم پر یہی اک رات کڑی ہے

دیکھو ہمیں ہم ہنستے ہوئے جانے لگے ہیں — کچھ جان پہ گزری ہے نہ نزع کی تڑی ہے

ہمبرگ کے خالد ملک ساحل صاحب کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے مجھے اپنی بالکل ابتدائی شاعری کے دو شعر یاد آ گئے۔یہ غزل ہفت روزہ مدینہ بھاولپور میں ۱۹۷۵ء سے ۱۹۷۷ء کے درمیانی عرصہ میں کہیں چھپی تھی، میرے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔لیکن اس کے ان دو اشعار سے موت کے تئیں میرے رویہ اور بالخصوص ابتدائی رویہ کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

کوئی آورہ ہے یا بھٹکی ہوئی ہے زندگی — موت کی نظروں میں جو کھٹکی ہوئی ہے زندگی

شور سنتے تھے بہت لیکن حقیقت اور ہے — ایک ہی تو سانس پر اٹکی ہوئی ہے زندگی

۲۶ جنوری ۲۰۰۹ء کو میں نے صبح چار بجے کے لگ بھگ ایک خواب دیکھا۔اس میں مجھے تاریخِ وفات ۳؍دسمبر بتائی گئی۔خواب میں سَن نہیں بتایا گیا لیکن بیداری پر مجھے اس کی جو تفہیم ہوئی اس کے مطابق سال ۲۰۰۹ء ہی میں وفات ہوگی۔اس تفہیم کے ساتھ ایک بار پھر غنودگی کی کیفیت ہوئی اوراس میں یہ قرآنی الفاظ میرے ہونٹوں پر جاری ہوئے: انی متوفیك ۔یعنی بے شک میں تجھے وفات دوں گا۔

میں نے اسی روز صبح پانچ بجے سبز رنگ کی جلد والی اپنی نوٹ بک کے بائیں جانب اندر کے پہلے صفحہ پر وہ خواب، اوراس کی تعبیر وتفہیم درج کردی، اپنے دستخط بھی کر دیئے۔اسی روز اپنے چھوٹے بیٹے طارق کو وہ نوٹ بک دکھا کر بتا دیا کہ دسمبر ۲۰۰۹ء میں اگر کچھ رونما ہو جائے تو اس تحریر کو خود بھی پڑھ لینا اور بہن بھائیوں کو بھی پڑھا دینا۔ ساتھ ہی اسے کچھ اور ہدایات بھی دیں۔لیکن ہوا یہ کہ طارق نے دو چار دن تک تو صبر سے کام لیا لیکن پھر گھبرا کر اپنی ماں کو اس بارے میں بتا دیا۔مبارکہ کو خواب کی کچھ حقیقت کا اندازہ ہوا تو وہ خود بیمار پڑ گئی۔ یہاں تک کہ ۶ فروری کو ایمبولینس بلانا پڑ گئی۔ ہفتہ بھر صورتحال اتنی زیادہ نازک رہی کہ ڈاکٹرز نے صاف کہہ دیا کہ ہم اپنی طرف سے بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔بچ جانے کے چانسز ہیں تو سہی لیکن بہت کم۔کیونکہ قوتِ مدافعت کمزور

ہوتے ہی Rheuma نے تقریباً تمام مرکزی اعضا پر حملہ کر دیا ہے۔ان آرگنز کو بچانے کے لیے جن دواؤں کو دیا جا سکتا ہے وہ موجودہ صورت میں جتنی مفید رہیں گی ،سائڈ ایفیکٹ میں اس سے زیادہ نقصان دہ ہوں گی۔عجیب مشکل اور پیچیدہ صورتحال تھی۔بہر حال دعا اور دوا دونوں کے نتیجہ میں مبارکہ نے ایک مہینہ کے لگ بھگ عرصہ میں بیماری کو کچھ کوَر کر لیا۔شیموتھراپی جو کینسر کے مریضوں کے لیے ہوتی ہے،اس کا پانچ فیصد چھ مہینوں میں آزمانے کا طے ہو گیا۔پانچ مہینوں میں مبارکہ اس حد تک صحت یاب ہو گئی کہ مجھے باقاعدہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگی۔کامیاب شوہر بخوبی جانتے ہیں کہ بیوی جب شوہر کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے لگے تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ پوری طرح سے صحت یاب ہو چکی ہے۔وگرنہ ناکام و نامراد شوہر تو بیوی سے سرِ عام جوتے یا دھکے کھا کر بھی کچھ نہیں سمجھ اور سیکھ پاتا،البتہ اس کے انجام سے لوگ سبق ضرور سیکھ لیتے ہیں۔

مبارکہ کی حالت سنبھلنے تک ۲۰۰۸ء کے آخر میں دی گئی ،میری بائیں آنکھ کے موتیا کے آپریشن کی تاریخ آ گئی۔اطہر خان جیدی جو پاکستانی مزاحیہ ڈرامہ کا ایک معروف نام ہیں،ان کا ایک شعر حسبِ حال ہو گیا۔

هم نے پھولوں کی آرزو کی تھی   آنکھ میں موتیا اتر آیا

۲ر مارچ کو آپریشن ہوا اور اسی دن مجھے چھٹی بھی مل گئی۔دو تین دن احتیاط سے کام لیا اور پھر اپنی معمول کی ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہو گیا۔کچھ عرصہ کے بعد دوسری آنکھ کے آپریشن کی تجویز دی گئی تھی۔چند مہینوں کے بعد جب اس کی نوبت آئی ،دائیں آنکھ کے کنارے پر نیچے کی جانب ایک چھوٹا سا دانہ نکل آیا۔بس اس دانے کے ختم ہونے تک آپریشن موخر کر دیا گیا۔جو تا حال موخر چلا آ رہا ہے۔لیکن یہ تاخیر تو بعد کی بات ہے۔فی الحال بات ہو رہی تھی مبارکہ کی اپنی سنگین بیماری کے وار سے بچ کر گھر واپس آ جانے کی۔

مبارکہ کا بہتر حالت میں گھر واپس آنا خدا کا بہت ہی خاص فضل تھا۔گردوں کی کارکردگی متاثر ہونے کے باعث اس کے پورے جسم سے پانی رِستا تھا۔خوشی سے بھیگنا اور غم میں آنسوؤں سے بھیگ جانا تو ہماری دنیا میں ہوتا ہے لیکن بیماری سے اس طرح بھیگنا ہمارے ہاں پہلا تجربہ تھا۔جسم بھی کسی حد تک پھول گیا تھا،تاہم تھراپی کرانے کے نتیجہ میں حالت تدریجاً بہتر ہوتی جا رہی تھی۔اس دوران مبارکہ کو نہانے کے لیے تو مدد کی ضرورت نہ ہوتی لیکن نہانے کے بعد کھڑا کرنے اور ٹب میں سے باہر نکالنے میں مجھے بہت زیادہ ہیلپ کرنا پڑتی۔

اپنے افسانہ ''گھٹن کا احساس'' میں ایک بار اپنی بیوی کے ساتھ ہوئی بات کو میں نے یوں لکھا ہوا ہے۔

''نہاتے ہوئے اس کا ہاتھ اپنی پوری کمر پر نہیں پھر سکتا تھا۔ماں کا کمر پر صابن مَلنا یاد آتا تو اس کا جی چاہتا کاش ماں زندہ ہوتی اور اب بھی میری کمر پر صابن مَل دیتی۔ایسے ہی خیالوں کے دوران ایک بار اُس نے اپنی بیوی کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔اس کی بیوی نہ صرف اس کی ماں کی بھتیجی تھی بلکہ بڑی حد تک اس کی ماں کی ہم شکل بھی تھی۔اس نے اپنی بیوی سے اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ وہ نہاتے وقت اس کی کمر پر صابن مَل دیا کرے

۔اس کی بیوی تھوڑا سا شرمائی پھر کہنے لگی: ''مجھ سے یہ فلموں والے باتھ روم کے سین نہیں ہو سکتے''

وہ بیوی کے جملے پر مسکرایا اور سوچا یہ پگلی کہاں جا پہنچی۔یوں بھی باتھ روم میں اتنی جگہ ہی کہاں ہے کہ وہ بھی میرے ساتھ سما سکتی۔''

اور اب صورتحال یہاں تک آ پہنچی تھی کہ ہم انڈین فلموں کے باتھ روم سے بڑھ کر انگریزی فلموں کے باتھ روم والے سین جیسی صورتحال سے گزر رہے تھے۔مبارکہ کا وزن بہت بڑھ گیا تھا اس لیے اس سین کا مزہ تو کیا لیا جاتا،میرا سانس ہی پھولنے لگتا۔یہ سانس پھولنے کا سلسلہ بڑھا تو ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ڈاکٹر نے ای سی جی تک کے اپنے سارے ٹیسٹ کرنے کے بعد مجھے ہسپتال ریفر کر دیا۔ہسپتال والوں نے ٹیسٹ کے کئی مراحل سے گزارنے کے بعد بتایا کہ دل کا کوئی وال (شریان) بند ہے۔انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی دونوں کام ایک ساتھ کر دیئے جائیں گے۔اس کے لیے یکم اکتوبر کی تاریخ دے دی گئی۔

انہیں دنوں میں ایک نئی غزل ہوئی،جس کے یہ اشعار جیسے ۳ر دسمبر کے لیے ذہنی تیاری کی غمازی کر رہے تھے۔

دردِ دل کی ہمیں اب کے وہ دوائی دی ہے   اپنے دربار تلک سیدھی رسائی دی ہے
اک جھماکا سا ہوا روح کے اندر ایسے   نوری برسوں کی سی رفتار دکھائی دی ہے
کیسے زنجیر کا دل ٹوٹا یہ اُس نے نہ سُنا   وقت نے قیدی کو بس فوری رہائی دی ہے
اک نئی لمبی مسافت کا زمیں زاد کو حکم   اور اس بار مسافت بھی خلائی دی ہے
جب بھی جانا ہے پلٹ کر نہیں دیکھیں گے کہیں   اپنے اندر سے یہ آواز سنائی دی ہے

اکیس ستمبر کو عید الفطر تھی ،عید بہت اچھی گزری۔سارے بچے گھر پر جمع ہوئے۔پانچ بیٹے بیٹیاں ،پانچ بہوئیں اور داماد، دس پوتے ،پوتیاں اور نواسے۔۔گھر پر اتنی رونق تھی کہ ہم دونوں تھک گئے۔بائیس ستمبر کو میں ڈٹسن باخ میں خانپور کے زمانے کے ایک دوست وزیر احمد صاحب کو ملنے چلا گیا۔شام کو گھر آیا تو مبارکہ کی طبیعت خراب تھی، بخار ہو گیا تھا۔رات گئے تک بخار میں شدت آ گئی اور صبح تک حالت اتنی بگڑ گئی کہ اس کی لیڈی ڈاکٹر فراؤ ہے نگ' (Frau Hennig) کو گھر پر بلانا پڑا۔ڈاکٹر نے مبارکہ کی حالت دیکھتے ہی ایمبولینس منگا لی۔جاتے وقت مبارکہ پر غشی سی طاری تھی۔اسے قریبی شہر ہوف ہائم کے ہسپتال میں لے جایا گیا۔۲۴ تاریخ تک حالت اتنی بگڑ گئی کہ اسے صوبائی صدر مقام ویزبادن کے اس ہسپتال منتقل کر دیا گیا جہاں پہلے سے اس کا ''روئے ما'' کا علاج چل رہا تھا۔انتہائی نگہداشت والے کمرہ میں جب ہم دیکھنے کے لیے پہنچے تو دل دھک سے رہ گیا۔وہاں کے ڈاکٹرز نے کہا کہ ہم بچانے کی پوری کوشش کر رہے ہیں لیکن اس طرح کے کیسز میں بچنے کا صرف ایک فی صد چانس ہوتا ہے۔جو بچہ اندر آتا اور رونے لگتا میں اسے باہر بھیج دیتا۔رفتہ رفتہ بچوں نے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا شروع کیا۔

میں تو مستقل طور پر مبارکہ کے سرہانے کھڑا ہوا تھا،بچوں کو دو سے زیادہ تعداد میں آنے کی اجازت نہ تھی۔

جب بھی کوئی بچہ آتا۔میں پوچھتا یہ کون ہے؟ آواز نہیں آتی تھی لیکن مبارکہ کے ہونٹ اس طرح ہلتے جس سے بچے کا نام ادا ہوتا ہوا پورا سمجھ میں آتا۔حالت تو غیر ہی تھی لیکن تیسرے دن دو دلچسپ باتیں ہوئیں جس سے مجھے کچھ تسلی ہونے لگی۔میں نئے کپڑے پہن کر ہسپتال پہنچا۔مبارکہ نے آنکھ کھولی تو مجھے دیکھ کر کہنے لگی۔''کتھے چلے او'' (آپ کہاں جا رہے ہیں؟)۔جب بیوی بے ہوشی اور بے خبری کی حالت میں بھی نگرانی کی اس حد تک آجائے تو اسے کون بے ہوش یا بے خبر کہے گا۔جب سارے بچے باری باری آکر ماں سے مل چکے تو مبارکہ نے دوسری طرف پڑی ہوئی کرسی کی طرف آنکھ سے اشارہ کر کے کہا آپ اب وہاں بیٹھ جائیں۔مجھے ان دونوں باتوں سے کافی تسلی ہوگئی۔لیکن کمال یہ ہے کہ جب مبارکہ بالکل صحت یاب ہوگئی تو اسے ان باتوں میں سے کچھ بھی یاد نہ تھا۔صرف اتنا یاد تھا کہ بچوں کی پرچھائیاں سی دکھائی دیتی تھیں اور بس۔

مجھے اندازہ ہے کہ اصلاً مبارکہ کو اندر سے یہ خوف ہے کہ میں دنیا سے کوچ کرنے والا ہوں۔فروری والی بیماری کے دوران میں نے اسے بڑے رسان سے کہا تھا کہ مبارکہ بیگم! آپ زیادہ فکر مت کریں، میں پہلے چلا گیا تو جاتے ہی آپ کو بلوا لوں گا۔آپ پہلے چلی گئیں تو میں بھی زیادہ دیر یہاں نہیں رہوں گا، آپ کے پیچھے پیچھے ہی چلا آؤں گا۔لیکن شاید ہم دونوں کے درمیان اہلِ لکھنو کے ''پہلے آپ۔۔۔۔پہلے آپ'' کے برعکس ''پہلے میں۔۔۔پہلے میں'' کا مقابلہ چلا ہوا ہے۔اس چکر میں شاید موت کا فرشتہ بھی کنفیوز ہو رہا ہے کہ ان دونوں میاں بیوی نے مجھے کس چکر میں ڈال دیا ہے۔پہلے کسے لے جاؤں؟

۲۹ر ستمبر ۲۰۰۹ء کو مبارکہ ابھی انتہائی نگہداشت والے روم میں تھی، گردن میں، ہاتھ پر، سینے پر، بازو پر مختلف کنکشنز لگے ہوئے تھے۔ایک بازو اور ہاتھ کے الٹی طرف ڈرپیں لگانے کے لیے، ایک بازو پر بوقتِ ضرورت ٹیسٹ کرنے کی غرض سے خون لینے کے لیے، گردن اور سینے پر کہیں ڈائلسز کے لیے، کہیں کمپیوٹرائزڈ ریکارڈ کے لیے اور کہیں پتہ نہیں مزید کن کن مقاصد کے لیے کنکشن کی تاریں ہی تاریں لگی ہوئی تھیں۔مبارکہ کیا تھی، اچھی بھلی روبوٹ دکھائی دے رہی تھی۔جیسے روبوٹ کو بالکل انسان جیسا دکھائی دینے کا تجربہ کر لیا گیا ہو۔ہم سارے گھر والے اسے دیکھ کر واپس گھر پہنچے۔چائے بنانے کے لیے کہا، چائے بن کر ٹرے میں ہی چائے کے کپ رکھ کر لائی جا رہی تھی کہ اچانک میری چھ سالہ پوتی ماہ نور کمرے سے باہر کی طرف دوڑ کر گئی اور اپنی چچی کی اٹھائی ہوئی چائے کی ٹرے سے ٹکرا گئی۔یہ حادثہ ایسے ہوا کہ ساری چائے ماہ نور پر آن گری۔فوراً ایمبولینس کو بلایا۔ایمبولینس پہنچی تو انہوں نے حادثہ کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے ایک اور ایمبولینس بلا لی۔ہم سمجھے ابھی فرسٹ ایڈ دے رہے ہیں، بعد میں پتہ چلا کہ گھر پر ہی اصل علاج شروع کر دیا گیا تھا۔معاملہ کی سنگینی کا تب احساس ہوا جب انہوں نے ہیلی کاپٹر بھی منگا لیا۔ماہ نور اور اس کی امی تسنیم دونوں ہیلی کاپٹر سے من ہائم کے یونیورسٹی کلینک روانہ ہوئے۔یہ شہر ہمارے شہر سے ایک گھنٹہ کی ڈرائیو پر ہے۔بچوں کے اس طرح کے جلنے کے علاج کے سلسلہ میں

اسے خصوصیت حاصل ہے۔شعیب اور میں، ہم دونوں کار کے ذریعے من ہائم روانہ ہو گئے۔من ہائم اور ویزبادن کے دونوں ہسپتال بالکل مختلف سمتوں میں واقع ہیں۔بہر حال ابھی پہلے بحران سے نکلے نہ تھے کہ دوسرا بحران آگیا۔اور تیسرا بحران یکم اکتوبر کو میرے دل کا وال (شریان) کھولنے کی صورت میں پہلے سے طے کیا جا چکا تھا۔کیا کوئی یقین کر سکتا ہے کہ ان سارے بحرانوں میں گھرا ہوا تھا اور تب ہی میری گیارہ کتابوں کی کتاب ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' کا لائبریری ایڈیشن اور جدید ادب کا جنوری ۲۰۰۹ء کا شمارہ ریلیز ہو چکا تھا۔اسی دورانیہ کے اندر میں نے ارشد خالد کے عکاس انٹرنیشنل کے نارنگ نمبر کے لیے بنیادی نوعیت کا کام بھی نمٹایا۔اسی دوران ہی میں نے نہ صرف اپنی کتاب ''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت'' کی بیک وقت ہندوستان اور پاکستان سے اشاعت کو ممکن بنایا بلکہ جنوری ۲۰۱۰ء کا جدید ادب کا شمارہ بھی انہیں ایام میں مکمل کر کے اشاعت کے لیے بھیج دیا۔اور اب جبکہ نومبر کے آخری عشرہ کے شروع میں یادوں کا یہ باب لکھ رہا ہوں تو جدید ادب کا اگلے سال جنوری ۲۰۱۰ء کا شمارہ جدید ادب کی ویب سائٹ پر ریلیز کیا جا چکا ہے اور کتابی صورت میں چھپ جانے کی اطلاع بھی آگئی ہے۔اور انشاءاللہ نومبر کے مہینے کے اندر ہی کتابی صورت میں ریلیز بھی کیا جا رہا ہے۔اسی اثناء میں غزلیں، نظمیں بھی تخلیق ہوئیں، ایک نیا افسانہ بھی لکھا گیا، اور اب یادوں کا یہ نیا باب بھی مکمل کر رہا ہوں۔انہیں ایام کے دوران ہی خدا نے مجھے چوتھا پوتا شیراز حیدر بھی عطا کر دیا۔یہ شعیب کا دوسرا بیٹا ہے۔**فالحمدلله علی ذالك!**

جب شیراز کی پیدائش ہوئی مبارکہ ہسپتال میں تھی۔ہسپتال سے چھٹی ملتے ہی سب سے پہلے اس ہسپتال میں گئی جہاں شیراز کی پیدائش ہوئی تھی، وہاں پوتے کو دیکھا، چوما، دعا کی اور پھر گھر واپس آئی۔اپنے دونواسوں اور ایک پوتے کے ختم قرآن کا ذکر یادوں کے ایک باب میں کر چکا ہوں۔اس عرصہ میں مزید پیش رفت یہ ہوئی کہ گزشتہ برس عثمان کے بیٹے اور میرے دوسرے پوتے جہاں زیب نے فروری میں ساڑھے پانچ برس کی عمر میں قرآن شریف ختم کر لیا۔اس برس جولائی میں جہانزیب کی بہن علیشا نے پونے پانچ سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کر لیا۔ماہ نور بھی بیس پارے پڑھ چکی ہے اور اگلے دو تین ماہ تک اس کے ختم شریف کی بھی امید ہے۔سو اپنی ذاتی زندگی کی اس سال کی اچھی خبروں میں ان خبروں کو بھی شمار کرتا ہوں۔ایک بار پھر **شکر الحمدلله**!

یہاں ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ویسے تو سارے بچے بہت فرمانبردار اور خیال رکھنے والے ہیں۔ہمارے عمرہ اور حج کی توفیق میں ان کا بھرپور ساتھ شامل رہا ہے۔جب مجھے کسی ذاتی کام کے لیے رقم کی ضرورت پیش آئی اور میں نے تینوں بیٹوں کے ذمہ کچھ رقم لگائی، سب نے وہ رقم فراہم کر دی۔عام حالات کے مطابق میرے کہے بغیر بھی طارق نے دو تین اہم مواقع پر از خود میری ضرورت کا احساس کرتے ہوئے مجھے خاصی معقول رقم فراہم کی ہے۔تاہم مجھے پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ بڑا بیٹا شعیب ایک عرصہ سے ہر سال ایک معقول رقم خاموشی کے ساتھ ماں کو دے رہا ہے۔مجھے کئی برس کے بعد اب علم ہوا تو میں نے دونوں ماں بیٹے کو نصیحت کی کہ

مجھے اس کا علم ہونا چاہیے تھا تا کہ میں تحدیث نعمت کے طور کہیں اس کا ذکر کر دیتا۔خدا کا شکر ہے کہ اب مجھے اس کا ذکر کرنے کا موقعہ مل گیا ہے۔

یکم اکتوبر کو میری انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی ہوئی۔ایک سائڈ پر سکرین پر سارا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ سمندروں ڈوہنگے دل دریا کی گہرائیوں میں تو کئی بار غوطہ زن ہوا ہوں،لیکن اس کی مواجی کا منظر ایک اور طرح سے دیکھ رہا تھا۔دائیں ران سے سوراخ کر کے تار وہاں سے گزارا گیا جو بائیں جانب مقیم دل تک پہنچنا تھی۔تو جناب یہ دل بائیں جانب ہی کیوں ہوتا ہے اور دائیں جانب سے چل کر ہی بائیں جانب والے دل کا علاج کیوں کیا جاتا ہے۔ادب میں دائیں بازو اور بائیں بازو کے مکاتب فکر کی کہانی بھی شاید ران اور دل کے رشتے کی کہانی ہے۔ دونوں لازم وملزوم ہیں اور ایک دوسرے سے وابستہ۔میں ادب میں دائیں بازو،بائیں بازو والوں کی کارگزاری کے ساتھ مشینوں کی انسان دوستی کا منظر بھی دیکھ رہا ہوں۔علامہ اقبال نے اپنے حساب سے کہہ دیا تھا۔

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس ہو رہا ہے۔مشینیں دل کے لیے موت کا نہیں بلکہ حیات کا پیغام بن رہی ہیں۔پیس میکر کی صورت میں دل کا محافظ تو متعارف ہو چکا ہے،حال ہی میں جاپان کے سائنس دانوں نے پلاسٹک کا ایسا دل تیار کیا ہے جو کارکردگی کے لحاظ سے اب تک کے سارے متبادل ذرائع سے زیادہ موثر اور مفید ثابت ہوگا۔علامہ اقبال کی بعض باتیں آج بھی درست ثابت ہو رہی ہیں،لیکن مشینوں کو دل کے لیے موت قرار دینے کی طرح ان کی بعض باتیں درست ثابت نہیں ہوئیں۔انہوں نے مغربی تہذیب کو للکارتے ہوئے کہا تھا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

مغربی تہذیب نے تب سے اب تک خودکشی نہیں کی،البتہ عالمِ اسلام کے کئی خطوں سے چلتی ہوئی خودکش حملوں کی وبا اب پاکستان کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔میں یہاں کسی موازنۂ مشرق ومغرب میں نہیں پڑ رہا۔بس اتنا سا اشارہ ہی کافی ہے۔بات ہو رہی تھی،جدید ترین ٹیکنالوجی کے ذریعے انسان کو ملنے والی سہولتوں کی۔میرے لیے آپریشن کا سارا مرحلہ خیر وخوبی کے ساتھ مکمل ہو گیا تھا۔کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔لیکن چند گھنٹوں کے بعد شدید تکلیف اور اضطراب کا سامنا کرنا پڑا۔دائیں ٹانگ کو پٹیوں سے جکڑ دیا گیا تھا اور اگلے چھ گھنٹے تک اس ٹانگ کو ہلانا سختی کے ساتھ منع تھا۔چھ گھنٹے تک ٹانگ کو نہ ہلانے کا احساس اتنا جان لیوا ثابت ہوا کہ میں اس کرب کو بیان ہی نہیں کر سکتا۔رات مجھے ہسپتال ہی میں گزارنا تھی۔رات کو ساڑھے دس بجے کے قریب دائیں ٹانگ کو جکڑ بندی سے نجات ملی تو میں نے فوراً ہسپتال کی جانب سے پہنایا گیا ملنگوں جیسا چولا اتارا،اپنا لباس پہنا اور چہل قدمی کرتا ہوا ہسپتال سے باہر نکل آیا۔سردی کے باوجود کھلی فضا میں بہت اچھا محسوس ہو رہا تھا۔ باری باری سارے بچوں کو فون کیا۔سب کو اپنی خیریت سے آگاہ کیا،ان سب کی خیریت دریافت کی۔مبارکہ اور

ماہ نور کا حال پوچھا۔گھنٹہ بھر باہر گھومنے کے بعد ہسپتال میں واپس آ گیا۔اگلے دن دوپہر کے بعد مجھے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔اسی دن شام کو مبارکہ سے ملنے گیا۔وہ انتہائی نگہداشت والے روم سے اب درمیانی نگہداشت والے روم میں منتقل ہو گئی تھی۔ہوش میں آ گئی تھی لیکن کوئی جنبش از خود نہیں کر سکتی تھی۔اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں خود اپنے دل کے معاملے سے نمٹ کر آ رہا ہوں۔ابھی اسے اپنے بارے میں یا ماہ نور کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ جیسے جیسے مبارکہ روبصحت ہو رہی تھی ویسے ویسے ماہ نور کی حالت بھی بہتر ہو رہی تھی۔اس کا چہرہ تو خدا نے اپنے فضل سے محفوظ کر دیا تھا۔سینے کے بیشتر داغ بھی کم ہو رہے تھے اور ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ بچی بہت چھوٹی ہے اس لیے ایک سے دو سال تک یہ داغ بھی دور ہو جائیں گے۔

مبارکہ کو جب مختلف کنکشنز سے آزاد کرنے کا سلسلہ شروع ہوا تو جہاں جہاں سے سوئی وغیرہ کو ہٹاتے، وہاں گہرے سرخ داغ نمایاں ہو جاتے۔تن ہمہ داغ داغ شد والا منظر تھا۔پنبہ کجا کجا نہم کہنے کی ضرورت نہ تھی۔ایک دن کے بعد یہ گہرے سرخ داغ جیسے نیلے سے رنگ میں ڈھلنے لگے اور مجھے پنجابی کا ''تن من نیل و نیل'' یاد دلانے لگے۔(ویسے کمال ہے کہ ایک مہینہ کے اندر ہی وہ گہرے داغ ایسے ختم ہو گئے ہیں جیسے کبھی تھے ہی نہیں)۔

۲۳/اکتوبر کو مبارکہ کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی لیکن اس خبر کے ساتھ کہ ہفتہ میں تین بار ڈائلسز ہوا کرے گا۔ سرکاری طور پر ہی سارا انتظام کیا گیا ہے۔مقررہ وقت پر ٹیکسی آتی ہے اور گھر سے ہسپتال لے جاتی ہے،چار سے پانچ گھنٹے کے درمیان ڈائلسز کا عمل مکمل ہوتا ہے تو ٹیکسی گھر چھوڑ جاتی ہے۔مبارکہ کی بیماری،اپنی پوتی ماہ نور کے حادثہ اور اپنے دل کے علاج تک تین چار ہسپتالوں سے واسطہ رہا۔کہیں بھی امیر یا غریب،جرمن یا غیر جرمن کا فرق دکھائی نہیں دیا،کہیں بھی ہسپتال کے عملہ میں دیکھ بھال کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔وہ جو مسیحانہ مقام تھا ہر جگہ دکھائی دیا۔انسانی خدمت کا ایسا اعلیٰ معیار کہ سوچنے بیٹھیں تو آنکھیں شکر گزاری سے بھیگ جائیں۔ہمارے معاشرے کے لوگ اپنی ذہنیت کے مطابق اان کے بارے کیا کچھ باور کرتے ہیں لیکن میں پورے یقین سے کہتا ہوں کہ اپنی خدمتِ انسانی کے اعلیٰ ترین معیار کے باعث ان لوگوں نے سچ مچ اپنی جنت کمالی ہے۔

اپنی اس علالت کے نتیجہ میں مبارکہ کا وزن پچاس کلو کے لگ بھگ رہ گیا۔بیشتر کپڑوں کی نئی فٹنگ کرانی پڑی،چھوٹی بیٹی کا شادی سے پہلے کا ایک کوٹ پورا آ گیا۔اب بہو بیٹیوں میں حسرت کے ساتھ مبارکہ کو دیکھا جاتا ہے کہ ہائے امی! آپ اتنی سمارٹ ہو گئی ہیں۔

میرے دل کا وال(شریان)ٹھیک کر دیا گیا تھا لیکن سانس پھولنے کی کیفیت نہیں جا رہی تھی۔ڈاکٹر اور ہسپتال کے دو معائنوں کے بعد فرینکفرٹ کے یونیورسٹی کلینک کے ریڈیالوجی نیوکلیر میڈیسن کے شعبہ میں چیک اپ کے لیے بھیج دیا گیا۔یہ چار گھنٹے طویل دورانیے کا چیک اپ تھا۔پہلے مرحلہ میں جب مجھے انجکشن لگا کر سائیکلنگ کرائی جا رہی تھی تو ڈاکٹر بار بار پوچھتی تھی کہ دل میں کوئی گھبراہٹ تو نہیں ہو رہی؟ میں مزے سے

سائیکل چلائے جا رہا تھا اور ہر بار بتا رہا تھا کہ دل کو کوئی گھبراہٹ نہیں ہو رہی، البتہ سائیکل چلاتے ہوئے ٹانگوں میں درد ہو رہا ہے۔ دوسرے مرحلہ میں جب مجھے لٹا کر اوپر ایک مشین لائی جانے لگی تو شدید گھبراہٹ ہونے لگی۔ میرے دونوں ہاتھ اس طرح سے میرے سر کے نیچے تہہ کر دیئے گئے تھے کہ میں اُٹھ بھی نہ سکتا تھا۔ میں نے کہا میں اپنے جوتے اتارنا چاہتا ہوں، جواب ملا آپ اسی طرح پڑے رہو، ہم خود جوتے اتار دیتے ہیں۔ پندرہ منٹ تک کسی جنبش کے بغیر پڑے رہنا تھا، یہ بھی ٹانگ سیدھی رکھنے جیسا ہی کربناک تجربہ تھا۔ کھجلی جو ویسے کبھی نہ ہوتی تھی اب ہر جگہ ہوئی جا رہی تھی لیکن کہیں بھی کھجانے کی اجازت نہ تھی۔ بہر حال پندرہ منٹ کے بعد اس مشکل سے نجات ملی۔ ایک وقفہ کے بعد جب ایک بار پھر یہی معائنہ دہرایا گیا تو پھر میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پالیا تھا۔ دوسری بار یہ معائنہ بخیر وخوبی مکمل ہو گیا۔ سارے چیک اپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مزید دو وال بند پائے گئے۔ اور اب ایک بار پھر آپریشنل پراسیس سے گزرنا ہوگا۔ گھر آکر میں نے مبارکہ سے پنجابی میں کہا کہ ’’سر تے اک وال نئیں رہیا، تے اے ہن دل دے والاں دے دوالے ہو گئے نیں‘‘۔ بہر حال ۳ نومبر کو ایک بار پھر دل کی انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی ہونا قرار پائی۔

میں اپنے دوست احباب کو بتا رہا تھا کہ زندگی بھر جنہیں دل کھول کر دکھانے کی حسرت رہی وہ تو پوری نہیں ہوئی، لیکن یہ لوگ نہ صرف دل میں جھانکتے رہتے ہیں بلکہ جب جی چاہتا ہے اسے کھول کر دیکھ بھی لیتے ہیں، بلکہ بار بار دیکھتے جا رہے ہیں۔ بہر حال ۳ نومبر کو یہ مرحلہ بھی خیر وخوبی سے گزر گیا۔ رات کو چھ گھنٹے سیدھے لیٹے رہنے اور دائیں ٹانگ کو بالکل نہ ہلانے کی ہدایت پر عمل کے لیے میں اس بار ذہنی طور پر تیار تھا۔ میں نے نیند کی گولی کی خواہش ظاہر کی۔ ڈاکٹر نے ڈرپ میں ہی ہلکی سی مقدار میں دوا دے دی۔ اس سے نہ تو گہری نیند آئی اور نہ ہی بے چینی والی بیداری رہی۔ نیم خوابی کی سی کیفیت تھی۔ سو اس بار زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ جب پٹی کھولی گئی تو میں اطمینان اور آرام کے ساتھ اُٹھا۔ ہسپتال والوں کا ملنگوں والا چولا اتارا، اپنا لباس پہنا اور اس بار اپنے وارڈ کے باہر لان میں کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ ہسپتال سے باہر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔

دوسرے دن معمول کے مطابق چھٹی مل جانی تھی لیکن ایک مہینے میں دوسری بار اس مرحلہ سے گزرنے کے باعث مجھے احتیاطاً ایک دن کے لیے مزید روک لیا گیا۔ ۵ رنومبر کو چھٹی دی گئی اور میں مزے مزے سے گھر پہنچ گیا۔

پہلی بار آپریشن وارڈ سے جنرل وارڈ تک پہنچا تھا تو طارق، نازیہ اور شایان فوراً ہسپتال پہنچ گئے تھے۔ اب دوسری بار جنرل وارڈ میں پہنچا تو مبارکہ، طارق، نازیہ اور شایان کے ساتھ پہنچ گئی تھی۔ دوسرے دن جب چھٹی نہیں ملی تو مبارکہ، شعیب اور عثمان ایک ساتھ ملنے آگئے۔ اب عمر کے اس حصے میں اور بیماریوں کی اس یلغار میں مبارکہ اور میں ایک دوسرے کی دیکھ بھال کرتے رہتے ہیں۔ بعض عزیز اور دوست احباب ہم دونوں کی خیریت دریافت کرنے لگے تو میں نے کہا ہم دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کی دیکھ ریکھ کرتے رہتے ہیں

۔ مثلاً میں مبارکہ سے کہتا ہوں آپ آرام سے بیٹھیں، میں چائے تیار کر کے لاتا ہوں۔ مبارکہ جواباً کہتی ہے نہیں آپ آرام سے بیٹھیں میں چائے تیار کر کے لاتی ہوں۔ ہم دونوں کا جذبہ دیکھ کر چائے کہتی ہے آپ دونوں آرام سے بیٹھیں میں خود ہی تیار ہو کر آجاتی ہوں۔

۱۹ رنومبر ۲۰۰۹ء کو ڈاکٹر کو میں نے بتایا کہ سانس پھولنے کا مسئلہ جوں کا توں ہے، تو اس نے کہا کہ ایک بار پھر انجیو گرافی اور انجیو پلاسٹی کے مراحل سے گزرنا ہوگا۔ میں نے کہا ۳ ردسمبر کے بعد کی کوئی تاریخ طے کرلیں۔ تب تک خواب کی تعبیر نہ آئی تو پھر جیسے چاہیے ہمارے دل پر مشقِ ناز فرمائیے۔

جب میرے ۳ ردسمبر والے خواب کی بات گھر کے تقریباً سارے افراد تک پہنچ گئی تو میں نے مناسب سمجھا کہ خوابوں اور ان کی تعبیروں سے دلچسپی رکھنے والے بعض خاص دوستوں کو بھی خواب بتا دیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہالینڈ سے جمیل الرحمٰن، انگلینڈ سے نصیر حبیب اور جرمنی سے خالد ملک ساحل تین دوستوں کا بطور خاص حوالہ دوں گا۔ خالد ملک ساحل صاحب اتنے رقیق القلب نکلے کہ مجھے لگا میری فوتگی پر وہ جس طرح رونے لگیں گے، انہیں دلاسہ دینے کے لیے شاید مجھے خود ہی اٹھ کر انہیں چپ کرانا پڑے گا۔ تاہم انہوں نے تعبیر یہ کی کہ ۳ ردسمبر سے آپ کی زندگی میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا، جس میں روحانی پہلو زیادہ ہوگا۔ لگ بھگ اسی انداز کی بات نصیر حبیب صاحب نے ہنستے ہنستے اور بعض رنگین اشارے دے کر کردی۔ جمیل الرحمٰن سے بات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ۳ دسمبر کی تاریخ کو ایک طرف رکھیں۔ اور انّی متوفّیک کے اعداد نکالیں۔ اعداد نکالے تو ۹ نکلے۔ میں نے کہا اب تو بات واضح ہوگئی کہ ۲۰۰۰ کی صدی میں ۲۰۰۹ ایک بار ہی آنا ہے۔ اس کی دوسری تاویل کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ۲۰۰۹ء سے اگلے نو برس تک زندگی رہے گی اور ۲۰۱۸ء میں وفات ہوگی۔ اس پر جمیل الرحمٰن نے کہا کہ میرے حساب سے ۲۰۱۶ء کا سال نکلتا ہے۔ کیونکہ ۲۰۱۶ کے اعداد نو نکلتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں یہ بھی قرینِ قیاس ہے۔ جب مبارکہ کو اس حساب کتاب کا علم ہوا تو کہنے لگی کہ ۲۰۲۵ء اور ۲۰۳۴ء کے اعداد بھی تو نو ہی نکلتے ہیں۔ میں نے کہا کہ صرف ۲۰۳۴ تک ہی کیوں پھر ۲۰۵۲ء کر لیں۔ اس کا عدد بھی ۹ نکلتا ہے اور میری زندگی کی سنچری بھی پوری ہوتی ہے۔ ۹ کے پھیر میں جمیل الرحمٰن نے ڈال دیا ہے ورنہ خواب سیدھا سادہ ۳ ردسمبر ۲۰۰۹ء سے متعلق ہے۔ پورا ہو گیا تو بھی ٹھیک اور پورا نہ ہوا تو بھی خیر۔۔۔ لیکن نو کے عدد سے تاویل وتعبیر کا ایک طویل تر سلسلہ بنتا جا رہا ہے۔

اتنی تعبیریں یکجا ہوتی گئیں تو میرا بے چارہ خواب اپنی موت آپ مر جائے گا۔ شاید دوستوں نے مجھے بچانے کے لیے یہی ترکیب نکالی ہو کہ اتنی تعبیریں اور تاویلیں جمع کر دو کہ سب کچھ خلط ملط ہو جائے۔ کثرتِ تعبیر کے ہاتھوں خواب کے انجام سے مابعد جدید والوں کا ڈھکوسلہ بھی مزید سمجھ میں آتا ہے۔ لیجیے صاحب معنی کو ہمہ وقت ملتوی کراتے رہیے، موت سے جان بچاتے رہیے، لیکن تابہ کے!

میں نے اپنی یادوں کے باب ''دعائیں اور قسمت'' میں بڑی وضاحت سے لکھا تھا:

''چند قرآنی اور مسنون دعائیں مجھے بچپن میں رٹادی گئی تھیں۔ان کی بھی ایک اہمیت ہے لیکن میں جب کسی دُکھ کی حالت میں ہوتا ہمیشہ اپنی زبان میں خدا سے دعا کرتا۔بہت بار ایسا تجربہ ہوا کہ میں نے دعا کی اور اسی حالت میں مجھے دعا کی قبولیت کا یقین بھی ہو گیا۔جب بارہا ایسا ہوا تو میں نے اپنے بعض قریبی عزیزوں کو اس بارے میں بتایا۔اس بتانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو دعا بظاہر قبول ہو چکی تھی'ایک لمبے وقفہ تک معلّق ہو گئی۔دو تین بار ایسے جھٹکے لگنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ قبولیت دعا کا نشان تو خدا کے مامورین اور اولیاء کے لئے مخصوص ہے۔میری کسی بھی دعا کا قبول ہونا میرا انفرادی معاملہ ہے۔اگر میں اسے دوسروں کو بتاؤں گا تو مقامِ ولایت پر قدم رکھنے جیسی جسارت کروں گا'جس کا میں اہل ہی نہیں۔سو اسی لئے وہ دعائیں جن کی قبولیت کے بارہ میں دوسروں کو بتا دیتا ہوں' لمبے عرصہ کے لئے ردّ و قبول کے درمیان معلّق ہو جاتی ہیں اور یہی میرے افشاء کی سزا ہوتی ہے۔

عجب سزا ہے کہ میرے دعاؤں والے حروف نہ مسترد ہوئے اب تک نہ مستجاب ہوئے ''

اپنے خواب اور غنودگی کی حالت میں قرآنی الفاظ کے زبان پر جاری ہونے کے تجربہ کو قبولیت دعا سے ملتا جلتا یا شاید اس سے بھی کچھ زیادہ قرار دیا جا سکتا ہے۔تو میں نے جو اسے مقررہ وقت آنے سے پہلے اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں میں اتنا زیادہ بتا دیا ہے تو کہیں لاشعوری طور پر میں نے یہی تو نہیں چاہا کہ تین دسمبر کا سن سچ مچ معلق ہو جائے۔اور چاہے پھر بعد میں تاریخ بھی ادل بدل ہو جائے۔بظاہر ایسا نہیں ہے لیکن انسانی لاشعور کا کیا کہا جا سکتا ہے۔یوں بھی دل دریا سمندروں ڈوہنگے۔مجھے موت کے سلسلہ میں صرف ایک خواہش شدت کے ساتھ رہی ہے کہ جب بھی آئے بہت آرام سے آئے۔جیسے ہلکی سی اونگھ میں گہری اور میٹھی اونگھ آجائے اور میں اسی میٹھی اونگھ میں آگے نکل جاؤں۔روح اور جسم کے حوالے سے میں اپنی بساط کے مطابق کافی کچھ لکھ چکا ہوں۔یہاں اپنی سوچ میں ہوئی پیش رفت کا ہلکا سا ذکر بھی کر دوں۔جسم اور روح لازم و ملزوم ہیں۔جسم کے اندر ہی کہیں کوئی مین سوئچ ہے (جسے ابھی جدید سائنس دریافت نہیں کر پائی)۔وہ مین سوئچ آف کر دیا جاتا ہے تو ہم مر جاتے ہیں۔جسم سے گہرے اور مستقل ربط کے باوجود مجھے روح کی ایک حد تک الگ حیثیت کا بھی پرچھائیں جیسا ادراک ہوتا ہے۔اس سے جسم کی نفی نہیں ہوتی لیکن روح جسم کے ساتھ اس سے سوا بھی ہے۔مثال کوئی بہت واضح نہیں ہے لیکن اسے کسی حد تک اور محض مثال کے طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔سیٹلائٹ سے جو پروگرام نشر کیے جا رہے ہیں،وہ اپنے اظہار کے لیے ٹی وی سیٹ کے محتاج ہیں۔ٹی وی کے بغیر وہ خود کو ظاہر نہیں کر سکتے،یوں ٹی وی اور سیٹلائٹ سے آنے والے پروگرام میں گہرا ربط ہے۔تاہم ٹی وی کے بغیر بے شک وہ پروگرام خود کو ظاہر نہ کر پائے لیکن وہ یہیں کہیں موجود تو ہوتا ہے۔میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر میرے لیے بہت سا مزید غور و فکر کا سامان موجود ہے۔تاہم اس سے روح اور جسم کے لازم و ملزوم ہونے کے اس تصور کی نفی نہیں ہوتی جو میں اپنی یادوں کے باب ''روح

اور جسم'' میں بیان کر چکا ہوں۔یہ نئی سوچ دراصل اسی سوچ کی محض توسیع اور اسی کے اندر ایک نئے زاویے کی دریافت کا احساس دلاتی ہے۔

بہر حال دوستوں کی تعبیروں کو بھی ایک حد تک مد نظر رکھا جائے تو اب تین امکانات ہیں،اسی سال ۲۰۰۹ء کے ۳ دسمبر کو مجھے بارگاہِ الٰہی سے بلاوا آجائے۔یا پھر ۲۰۱۶ء یا ۲۰۱۸ء تک اسے موخر سمجھا جائے۔ذاتی طور پر میرے دامن میں حبّ رسولؐ کے طور پر کچھ بھی خاص نہیں ہے۔ایک ہلکا سا احساس اور بس۔میں نے ایک عرصہ پہلے سے یہ خواہش کر رکھی ہے کہ میرے پاس نذر گزارنے کو اور کچھ بھی نہیں ہے سو اپنی عمر کا نذرانہ بارگاہِ رسالت میں پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ میری عمر ۶۳ برس سے تجاوز نہ کرے،اس کے اندر ہی اندر کہیں بھی مکمل ہو جائے۔

بلا شبہ زندگی خدا کا عطا کردہ بہت بڑا انعام ہے،اس کے لیے خدا کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔موت بھی برحق ہے،خدا جب چاہے بلا لے،میں اس کے لیے بھی ہمیشہ اس کی رضا پر راضی اور کوچ کے لیے کمر بستہ ہوں۔بس اپنی عمر کے ۶۳ برس سے تجاوز نہ کرنے کی خواہش کے پیش نظر مجھے ۲۰۱۶ء یا ۲۰۱۸ء کے مقابلہ میں ۲۰۰۹ء کا سال ہی زیادہ مناسب لگ رہا ہے۔آگے جو اس کی مرضی!

۳ دسمبر ۲۰۰۹ء والی تعبیر سچ ثابت ہو گئی تو اس لیے بھی خوشی ہو گی کہ یادوں کا یہ باب چھپتے وقت پورا باب بزبانِ حال کہہ رہا ہو گا۔ ؎ زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

خواب کی تعبیر کچھ اور ہوئی یا سارا خواب ہی غلط ہو گیا تو پھر ۴ر دسمبر کو ایک دو سطروں کا اضافہ کر کے یہ باب مکمل کر لوں گا۔**وما توفیقی الا باللہ!**

(یہ تحریر میں نے ۲۳ر نومبر ۲۰۰۹ء کو مکمل کر لی تھی۔آج ۲۶ر نومبر تک اس میں ہلکے پھلکے اضافے کیے اور آج ہی ان احباب کو ای میل سے یہ فائل بھیج رہا ہوں:شمس الرحمٰن فاروقی (الٰہ آباد)،محمد عمر میمن (امریکہ)،شمیم حنفی (دہلی)، ڈاکٹر علی جاوید (دہلی)،منشا یاد (اسلام آباد)،ایوب خاور (کراچی) ڈاکٹر صغریٰ صدف (لاہور)،جمیل الرحمٰن (ہالینڈ)،خورشید اقبال (۲۴ پرگنہ)،خالد ملک ساحل (جرمنی)،شبانہ یوسف (انگلینڈ)،ارشد خالد (اسلام آباد)، احمد حسین مجاہد (ایبٹ آباد)،سلیمان جاذب (دبئی)۔۔۔**ح۔ق**)

۲۸ نومبر کو یہ فائل سلطان جمیل نسیم (کینیڈا)،عبداللہ جاوید اور شہناز خانم عابدی (کینیڈا) کو بھی بھیج دی گئی۔

۴ر دسمبر کو لکھا جانے والا اضافی نوٹ: اس وقت جرمنی کے وقت کے مطابق رات کے بارہ بج کر سات منٹ ہو چکے ہیں، ۳ر دسمبر ۲۰۰۹ء گزر چکا ہے،۴ر دسمبر کا دن شروع ہو چکا ہے۔ویسا کچھ نہیں ہوا جیسا میں سمجھ رہا تھا۔لیکن منشا یاد کے افسانہ ''بیک مرر'' کے اختتام کے مطابق ایسا ہو تو سکتا تھا۔(**ح۔ق**)----------

قارئین جدید ادب کے لیے: توفیق ملی تو یادوں کے اس باب کے تناظر میں جلد ایک نیا باب لکھنے کا ارادہ ہے۔

حیدر قریشی

ڈاکٹر ستیہ پال آنند
اور دیگر مہمانوں کا خیر مقدم

(ہائیڈل برگ یونیورسٹی جرمنی میں ۲۴ مارچ کو ہونے والی تقریب میں پڑھا گیا خیر مقدمی مضمون)

اس تقریب کے انعقاد کا خیال تب آیا جب مجھے ڈاکٹر ستیہ پال آنند صاحب نے امریکہ سے اطلاع دی کہ وہ انڈیا سے واپسی پر یورپ کا چکر بھی لگائیں گے۔ میں نے انہیں کہا کہ جب یورپ آ رہے ہیں تو جرمنی سے بھی ہوتے جائیے۔سوانہوں نے میری فرمائش پر جرمنی آنے کی حامی بھر لی۔ میں نے کرسٹینا جی سے پروگرام ترتیب دینے کی بات کی انہوں نے ہمیشہ کی طرح تعاون کر دیا۔یوں ستیہ پال آنند صاحب کے اعزاز میں تقریب کا پروگرام طے کیا جانے لگا۔اسی دوران معلوم ہوا کہ کوپن ہیگن سے صدف مرزا ان کے اس سفر کے انتظامات سنبھالیں گی۔سواس حوالے سے ان کا فون آیا تو انہیں بھی مدعو کرنا واجب ٹھہرا۔یوں ہمارے ایک مہمانِ خصوصی کی جگہ دو مہمانِ خصوصی ہو گئے۔ پھر چراغ سے چراغ جلنے کی طرح صدف مرزا کے توسط سے ارم بتول اور شہزاد ارمان سے رابطہ ہوا اور ان کے ذریعے پاکستان سے جرمنی میں آئے ہوئے شاعر باقر رضا زیدی سے تعارف ہوا۔اور انہیں بھی بطور مہمان خصوصی مدعو کر لیا گیا۔ایک فلمی گانے میں ایک مصرعہ بار بار آتا ہے۔

''ایک۔۔ایک سے بھلے دو۔۔۔۔دو۔۔دو سے بھلے تین''

سو یوں ہماری آج کی تقریب میں تین مہمانانِ خصوصی موجود ہیں۔باقر رضا زیدی صاحب الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ ہیں اور شعر وادب سے اپنی وابستگی کو بھی انہوں نے برقرار رکھا ہے۔''صدائے باقر''اور''تم نے کہا تھا'' کے نام سے ان کے دو شعری مجموعے چھپ چکے ہیں۔مزید تعارف اب رابطہ کے بعد ہوتا چلا جائے گا۔صدف مرزا سے جب ٹیلی فون پر بات ہوئی تو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ ادبی موضوعات پر نہ صرف اچھی گفتگو کر سکتی ہیں بلکہ ان باتوں میں اچھی خاصی ادبی سوجھ بوجھ بھی ملتی ہے۔یہ میرے لیے اس واسطے حیران کن بات تھی کہ عام طور پر ادبی شعور تو اچھے اچھے شاعروں اور ادیبوں میں بھی دیکھنے کو نہیں ملتا۔بہر حال اس خوشگوار تاثر کے بعد جب ان کی شاعری پڑھنے کا موقعہ ملا تو لگا کہ وہ روانی جوان کی گفتگو میں تھی، وہ اسی طرح اس شاعری میں نہیں مل رہی جبکہ

شاعری میں تو فطری روانی زیادہ ہونی چاہیے تھی۔بعد میں راز کھلا کہ مجموعہ کچھ عجلت میں چھپوالیا گیا تھا۔بہر حال اب توقع کی جا سکتی ہے کہ اپنے ادبی مطالعہ کو مزید بڑھانے اور ستیہ پال آنند جیسی علمی و ادبی شخصیت کے مشوروں سے ان کے ہاں شعری بہاؤ بھی جو بن پر آ تا جائے گا۔

ستیہ پال آنند جی سے میرا تعلق لاگ اور لگاؤ دونوں طرح کا ہے۔یہاں شروع میں ہی وضاحت کر دوں کہ ایسے تعلق کا ایک اعتراف میں اپنی پرانی دوست فرحت نواز کے حوالے سے کر چکا ہوں اور دوسرا اعتراف صرف ستیہ پال آنند جی کے حوالے سے کر رہا ہوں۔یہ ایسا سادہ اور پر پیچ تعلق ہے جہاں لاگ میں بھی لگاؤ ہوتا ہے اور لگاؤ میں بھی لاگ ہوتا ہے۔علمی طور پر ستیہ پال آنند جی سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔جب وہ غزل میں پیش پا افتادہ مضامین اور تراکیب کی بھرمار سے کلیشے جیسی صورت بن جانے کی خبر دیتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے۔غزل کی روایتی بھرمار کے مقابلہ میں اصلاح احوال کی امید پیدا ہوتی ہے لیکن اس سے آگے معاملہ جاتا ہے تو غزل کی بقا کا مسئلہ درپیش ہو جاتا ہے اور ہم غزل کے چاہنے والے فکر مند ہو جاتے ہیں۔

مغربی دنیا میں مشاعروں کی بھرمار اور اس میں پنپنے والے منفی رویوں کی نشان دہی سب سے پہلے اور سب سے موثر طریقے سے ستیہ پال آنند جی نے کی تھی۔انہوں نے بڑے اعداد و شمار کے ساتھ حقائق کو بیان کیا تھا۔اس معاملہ میں ان کا پرچم میں نے آج تک اُٹھا رکھا ہے۔تاہم مجھے امید ہے کہ اپنے حالیہ دورۂ یورپ کی جملہ تقریبات کو بھگتنے کے بعد وہ اپنے سابقہ موقف کو ایک بار پھر یورپی تناظر میں ضرور تحریر کریں گے۔تب اندازہ ہوگا کہ ان کے نزدیک صورتحال پہلے سے زیادہ تشویشناک ہو گئی ہے یا بہتر ہوئی ہے۔ماہیا کی ثقافتی پہچان کے سلسلہ میں ستیہ پال آنند جی سے ایک بار سہو ہو گیا تھا،ہم نے مناسب طور پر نشان دہی کر دی تھی اور بات وہیں ختم ہو گئی۔نثر میں لکھی ہوئی ستیہ پال آنند جی کی مختلف تحریریں اپنی اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہیں،وہ رپورتاژ کی صورت میں ہوں یا یادوں کی صورت میں۔مضامین کی صورت میں ہوں یا تاثرات کی صورت میں۔میری خوش قسمتی ہے کہ انہوں نے ایک بار میرے اردو افسانوں پر انگریزی میں کچھ لکھا تھا لیکن افسوس کہ پھر ان سے اپنی لکھی ہوئی تحریر کہیں کھو گئی جو آج تک انہیں مل نہیں پائی۔آنند جی نے افسانہ نگاری بھی کی ہے،تین چار افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں، پہلا مجموعہ تب چھپا تھا جب میں ایک سال کا تھا۔حال ہی میں''میرے منتخب افسانے''کے نام سے ان کے منتخب افسانوں کا مجموعہ منظر عام پر آیا ہے جس سے بحیثیت افسانہ نگار ان کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکے گا۔شروع میں غزل بھی کہی اور ان کی غزل کے چند یادگار نقوش ادبی رسائل میں محفوظ ہیں۔ستیہ پال آنند جی کی نظم کے سلسلہ میں میرا کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائے گی۔تاہم یہ حقیقت ہے کہ جدید نظم کی معتبر ترین روایت کے حوالے سے آنند جی کا شمار اہم ترین شعراء میں کیا جاتا ہے۔آج کے زندہ شعراء کی آٹھ دس اہم ترین نظم نگاروں کی فہرست مرتب کی جائے تو اس میں ان کا نام لازماً شامل رہے گا۔ستیہ پال آنند جی ادبی سچائی کو محترم سمجھتے ہیں لیکن اس کے اظہار

میں احتیاط کا دامن تھامے رکھتے ہیں۔

اتنا سچ بول کہ ہونٹوں کا تبسم نہ بجھے   روشنی ختم نہ کر، آگے اندھیرا ہوگا

بے لاگ سچ کی اہمیت اپنی جگہ لیکن حکمت وفراست والا ان کا خاص رویہ بھی بری بات نہیں۔اگر چہ زیادہ احتیاط میں بے احتیاطی بھی ہو جاتی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہم سب نہ صرف ڈاکٹر ستیہ پال آنند جی جیسی علمی و ادبی شخصیت سے ملنے کے لیے جمع ہوئے ہیں بلکہ ان کی وجہ سے ہمیں صدف مرزا اور باقر رضا زیدی جیسے احباب سے بھی ملنے کا موقعہ مل رہا ہے۔اور ہم سب کو مل بیٹھنے کا بہانہ مل گیا ہے۔میں اس تقریب میں آنے پر تمام شرکاء کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ہائیڈل برگ سے اقبال چئیر کے پروفیسر ڈاکٹر وقار شاہ صاحب،افغانستان کے شیریں دل گردی وال صاحب،فرید برگ سے راجہ محمد یوسف صاحب،اوفن باخ سے طاہر عدیم صاحب،سجاول صاحب اور محمد افضل صاحب،بون سے امتہ المنان طاہرہ صاحبہ، عاطف توقیر صاحب، بریمن سے علینہ (Alena) صاحبہ، فرینکفرٹ سے عرفان خان صاحب،ہائیڈل برگ سے ڈاکٹر ہنس ہارڈر (Hans Harder) صاحب،ڈاکٹر وسیم احمد طاہر صاحب،شہزاد ارمان صاحب ، ارم بتول صاحبہ اور زیب النساء صاحبہ،من ہائم سے نوید ظفر صاحب اور قرۃ العین صاحبہ،پاکستان سے آئے ہوئے دوست جعفر رضا صاحب اور برلن سے ہندی کویتا اور غزل کے ملاپ جیسی انوکھی شاعری کرنے والے دوست جیتندر دت صاحب،ہمبرگ سے طاہرہ رباب صاحبہ،ان سب کا خیر مقدم کرتا ہوں۔حقیقت یہ ہے کہ آپ سب شرکاء مہمانانِ خصوصی بھی ہیں اور میزبان بھی۔ یہ ادب کا ذوق رکھنے والوں اور ادبی برادری کے مل بیٹھنے کا ایک بہانہ ہے۔

اب پہلے مرحلہ میں شعرائے کرام سے کلام سنا جائے گا،دوسرے مرحلہ میں ڈاکٹر وقار شاہ صاحب اظہار خیال فرمائیں گے۔پھر مہمانانِ خصوصی اور خاص طور پر ڈاکٹر ستیہ پال آنند جی کے ساتھ سوال و جواب کی صورت مکالمہ ہوگا،جس کا مقصد مہمانوں کو علمی اور تخلیقی طور پر مزید جاننا ہوگا۔اور آخر میں صاحبِ صدر کے اختتامی کلمات کے ساتھ محفل اختتام پذیر ہوگی۔تقریب کے بعد کھانے پینے کا انتظام ہے۔

ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے شعبہ جنوبی ایشیائی انسٹی ٹیوٹ میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند،صدف مرزا اور باقر رضا زیدی کے اعزاز میں تقریب

ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ کی زیر صدارت ہائیڈل برگ یونیورسٹی کے جنوبی ایشیائی انسٹی ٹیوٹ میں ایک پُر وقار ادبی تقریب ہوئی۔اس تقریب میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند (امریکہ)،صدف مرزا (ڈنمارک) اور باقر رضا زیدی (پاکستان) مہمانانِ خصوصی تھے۔حیدر قریشی نے اسٹیج سیکریٹری کے فرائض انجام دیئے۔آغاز میں حیدر

قریشی نے ایک مضمون کی صورت میں مہمانانِ خصوصی اور جملہ شرکاء کا خیر مقدم کیا۔اس کے بعد مشاعرے کا دور ہوا جس میں جیتندر دت (برلن)،ارم بتول (ہائیڈل برگ)،عاطف توقیر (بون)،شہزاد ارمان (ہائیڈل برگ)،طاہرہ رباب (ہمبرگ)،راجہ محمد یوسف (فرید برگ)،طاہر عدیم (اوفن باخ) اور مہمانانِ خصوصی باقر رضا زیدی،صدف مرزا اور ڈاکٹر ستیہ پال آنند سے ان کا کلام سنا گیا۔شعرائے کرام نے عمدگی سے اپنا کلام پیش کیا اور حاضرین نے مناسب طور پر داد دی۔مشاعرے کے دور کے بعد یونیورسٹی میں اقبال چئیر کے پروفیسر ڈاکٹر وقار علی شاہ نے اظہار خیال کیا۔انہوں نے اقبال کی شاعری میں اُس زمانے کے افغانستان کا ذکر کیا اور پھر آج کے افغانستان اور پاکستان کے پختون علاقوں تک کی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ یہ اقبال کے زمانے سے بھی زیادہ تشویشناک ہو چکی ہے۔اس تقریر کے بعد کھانے اور چائے کا وقفہ دیا گیا۔

وقفہ کے بعد مہمانانِ خصوصی کے ساتھ اور خاص طور پر ڈاکٹر ستیہ پال آنند صاحب کے ساتھ ادبی مکالمہ کا موقعہ فراہم کیا گیا۔تاہم اپنی عمر اور مسلسل سفر کی تکان کے باعث وہ یکسو نہیں رہ پائے تھے۔حاضرین کی طرف سے میڈیا کی اثر آفرینی اور ادب کے معاملہ میں لاتعلقی کے حوالے سے سوال کیا گیا لیکن ڈاکٹر ستیہ پال آنند اردو کی ابتدا کیسے ہوئی کے موضوع کی طرف نکل گئے۔صدف مرزا نے اس موقعہ پر اصل موضوع پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے اس کا مناسب جواب دیا اور ڈاکٹر کرسٹینا نے مغرب میں بھی ادب اور میڈیا کے رشتے میں لگ بھگ ایک جیسی صورتحال کی نشان دہی کی۔راجہ محمد یوسف کی طرف سے ایک سوال کے جواب میں عروض کی بحث چھڑنے لگی۔راجہ یوسف نے ''تسکین اوسَط'' کہا تو ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے کہا کہ س پر زبر نہیں ہے،جزم ہے۔راجہ یوسف نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ڈاکٹر ستیہ پال آنند مسلسل سفر کی تکان کے باعث غلط تلفظ بتا رہے ہیں،بحث پر اصرار کرنے کی بجائے مہمانِ خصوصی کے احترام میں خاموشی اختیار کر لی۔اس مکالماتی حصہ کو صدف مرزا کی دانشمندانہ گفتگو اور باقر رضا زیدی کی شرکت نے زیادہ بامعنی بنایا۔دیگر شرکائے گفتگو میں ارم بتول،راجہ یوسف،توقیر عاطف،شہزاد ارمان،ڈاکٹر وسیم احمد طاہر اور طاہر عدیم سر گرم رہے۔

حیدر قریشی نے ڈاکٹر کرسٹینا کے تعاون کا خصوصی شکریہ ادا کیا،راجہ محمد یوسف،طاہر عدیم،اور بطور خاص ''اہل قلم'' کے شہزاد ارمان اور ارم بتول کا شکریہ ادا کیا جن کے تعاون کے باعث یہ تقریب نہایت پر وقار اور کامیاب رہی۔آخر میں تقریب کی صدر ڈاکٹر کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ نے اس تقریب کی کامیابی کا تمام تر کریڈٹ حیدر قریشی کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ نہایت کامیاب تقریب ہمارے لیے بہت خوشی کا باعث ہے۔آئندہ بھی جب حیدر قریشی اس انداز کی تقریب کرنا چاہیں ہماری طرف سے بھرپور تعاون شامل رہے گا اور ہمارے اردو کے جرمن نژاد طلبہ اس میں بھرپور شرکت کریں گے۔

کوائف ایوب خاور

مرتب: ارشد خالد

(مدیر عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد)

اصل نام محمد ایوب خاور

قلمی نام ایوب خاور

پیدائش 12 جون 1948ء

مقام چکوال (پنجاب)

ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال

کراچی منتقلی 1965ء

میٹرک مقبولِ عام ہائی اسکول شرف آباد، کراچی

بی۔اے نیشنل کالج، کراچی

ایم اے اُردو لٹریچر کراچی یونی ورسٹی

ملازمت پروڈیوسر، ڈائرکٹر پاکستانی ٹیلی وژن (1976ء سے 2004 تک)

یادگار پروگرام

(1) **ماہ نامہ** اُردو اَدب کا بصری جریدہ، زیرِ ادارت احمد ندیم قاسمی اور اشفاق احمد صاحب

(2) **دانش کدہ** علامہ اقبال کی طویل نظموں پر مبنی پروفیسر محمد منور صاحب کے لیکچرز اور مشہور مصور اسلم کمال کی تصاویر پر مبنی اُن نظموں کی Visual Interpertation

(3) **ڈراما سیریلز (ڈائرکٹر کی حیثیت سے)** فشار (امجد اسلام امجد)، دن (امجد اسلام امجد)، گرہ (امجد اسلام امجد)، حصار (مرزا اطہر بیگ) دلدل (مرزا اطہر بیگ)، نشیب (کہانی عبداللہ حسین، ڈرامائی تشکیل مرزا اطہر بیگ)، غریب شہر (اصغر ندیم سیّد)، کانچ کے پرَ (آصف علی پوتا)، ریڈ کارڈ (ایوب خاور)، خواجہ اینڈ سن (عطاالحق قاسمی)، اپنے پرائے (عطاالحق قاسمی)

(4) **ڈراما سیریز** قاسمی کہانی (احمد ندیم قاسمی کی منتخب کہانیوں پر مبنی ڈراما سیریز)

کہانی گھر (معروف افسانہ نگاروں کے افسانوں پر مبنی ڈراما سیریز)

گل زار کلاسیک (فلم ساز، ہدایت کار، شاعر، افسانہ نگار، گل زار کے افسانوں پر مبنی ڈراما سیریز)

(5) **انفرادی ڈرامے** خرمن (کہانی خدیجہ مستور، ڈرامائی تشکیل خالد احمد)، خوب صورت (منو بھائی)، باز گشت (امجد اسلام امجد)، کیٹ واک (مرزا اطہر بیگ)، چور (کہانی اشفاق احمد، ڈرامائی تشکیل ایوب خاور)، سن سیٹ بلیووارڈ (گل زار، ڈرامائی تشکیل ایوب خاور)

(6) **ڈراما نگار کے طور پر:** ریڈ کارڈ (سیریل)، چور (اشفاق صاحب کی کہانی پر مبنی)، سن سیٹ بلیووارڈ (گل زار کی کہانی پر مبنی)، بادشاہت کا خاتمہ (منٹو کی کہانی پر مبنی)، دشتِ تنہائی (طبع زاد)، ایھا الناس (طبع زاد)، گل زار کلاسک (گل زار کی کہانیوں پر مبنی سیریز)

اہم ایوارڈز: پی ٹی وی نیشنل ایوارڈ (7 بار)، پی ٹی وی علاقائی ایوارڈ (1 بار)، گریجویٹ ایوارڈ (8 بار) نگار ایوارڈ (1 بار)، بولان ایوارڈ (3 بار)

شاعری: **گل موسم خزاں** (پہلا مجموعہ)، **تمھیں جانے کی جلدی تھی** (دوسرا مجموعہ) **بہت کچھ کھو گیا ہے** (تیسرا مجموعہ)، **محبت کی کتاب** زیرِ طبع ہے جو فلم/ ٹیلی وژن کے انداز میں شاعری کی کتاب ہے جس میں ہدایات بھی شعری پیرائے میں درج کی گئی ہیں۔ **گل موسم خزاں** اور **تمھیں جانے کی جلدی تھی** کا بیک وقت تیسرا ایڈیشن نومبر دو ہزار نو تک آ جائے گا۔

☆ دس بارہ افسانے بھی میری زندگی کا حصہ ہیں جو ابھی تک کتابی شکل میں نہیں آ پائے۔ ایک فلم کی کہانی لکھی جو کامیاب فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔

☆ بہت سارے گیت لکھے خاص طور پر نصرت فتح علی خاں صاحب کے لیے فلم بینڈنٹ کوئن کا گیت ''سجنا رے''۔

☆ فلم ''پلکوں کی چھاؤں میں'' کے لیے ایک دوگانا جو اُس سال کا بہترین گیت کہلایا ''میری پلکوں میں اِک سپنا تھا'۔

☆ فلم ''دل تو پاگل ہے'' کا بہت کام یاب اور مشہور گیت 'تو ہے چاند اور میں ہوں چاندرات'

☆ اور فلم 'میں اِک دن لوٹ کے آؤں گا' کا تھیم سونگ 'میں اک دن لوٹ کے آؤں گا'

☆ فلم 'سلاخیں' کا گیت 'ممکن ہی نہیں' اور تھیم سونگ 'سلاخیں' بہت مقبول ہوئے۔

☆ ٹیلی وژن کے ڈراما سیریلز کے بہت سارے تھیم سونگ جو کافی تعداد میں ہیں اور ڈراما دیکھنے والے ناظرین میں بے حد مقبول ہیں۔

حالیہ ملازمت: جیو ٹی وی (ہیڈ آف دی ڈرامیٹک پروڈکشنز)

احمد ندیم قاسمی

گلِ موسمِ خزاں

علامت اوراستعارے سے جو بھرپور فایدہ ایوب خاور نے اُٹھایا ہے،اس کی توفیق نئی نسل کے کسی بھی دوسرے اہم شاعر کونہیں ہوئی۔ یوں سمجھئے کہ ایک ایسے دور میں جب علامت،عدم ترسیلِ معانی کا شکار ہورہی تھی اور جب استعارے کا تناظر ابہام کی لپیٹ میں جارہا تھا۔ایوب خاور نے اپنی اپج، ذہانت اور تخلیقی وفور کے بل پر علامت اوراستعارے کوحیاتِ نوبخشی اور شعروادب کے ان امکانات کو نہ صرف زنگ خوردہ ہونے سے بچالیا بلکہ انھیں نئی وسعتوں اور رسائیوں سے روشناس کرایا۔ میں ایوب خاور کی شاعری سے اس زمانے سے متعارف ہوں جب وہ کراچی یونی ورسٹی کا طالب عالم تھا۔چناں چہ میں اس کے شعری سفر کے بیش تر مقامات و حالات سے واقف ہوں۔اس لیے میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ خاور کے فن میں جو تدریجی ارتقا ہوا ہے اس سے ان نوجوان اہل قلم کو بہت کچھ سیکھنا چاہیے جو یکا یک ہائی جمپ یالانگ جمپ لگا کر معروف ونمایاں ہونے کے درپے رہتے ہیں۔ دوام صرف تدریجی ارتقا سے ملنے والی شہرت کو حاصل ہے اوراس کی ایک جیتی جاگتی اور بلیغ مثال ایوب خاور کی شاعری ہے۔

اُردو میں نظم معریٰ اورنظم آزاد کے رواج کے بعد جن شعرا نے اس صنفِ سخن کومقبول بنایا ہے ان میں ن۔م۔راشد،اختر الایمان،ظہورنظراور مجید امجد کے ساتھ ہی دیگر چند شعرا کے علاوہ مجھے ایوب خاور کا نام بھی ہمیشہ یاد آتا ہے۔ ہمارے اس نوجوان اور تازہ گوشاعر نے جس سلیقے اور آسانی اور روانی کے ساتھ آزاد نظمیں لکھی ہیں وہ اسی کا حصّہ ہے۔اس کی قریب قریب ہر نظم کے مطالعے سے مجھے آزاد نظم کے آفاق،حدِّ نگاہ تک پھیلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ایوب خاور کی نظموں کے مطالعے سے ہر ذہین قاری کا یہ یقین پختہ ہوگا کہ نظم آزاد کے امکانات اتنے لامحدود اور اتنے بے پناہ ہیں کہ جب تک شاعری ان سبھی امکانات کو مسخر نہیں کرلیتی۔نام نہاد نثری نظم کا کوئی ابتدائی جواز بھی پیدا نہیں ہوتا۔آخرانسان کے پاس پھر سے غاروں میں اُترنے اور درختوں پر چڑھ جانے کا کوئی تو جواز چاہیے۔

ایوب خاوراپنی آزاد نظموں میں مصرعوں کو کہیں کہیں سے توڑ کر انھیں مصنوعی طریقوں سے پڑھنے والے کو

چونکا تا یا صدمہ نہیں پہنچا تا بلکہ وہ دریا کی طرح رواں دواں رہتا ہے۔اس لیے اگراس کا کوئی مصرع بہت طول کھینچ جاتا ہے تو وہ اس سے گھبراتا نہیں بلکہ جانتا ہے کہ جو"روم"اس نے منتخب کیا ہے وہ اگر برقرار رہے تو ایک مصرعے کو ایک صفحے تک کھینچا جاسکتا ہے بلکہ آزاد نظم تو ایک طرح سے ایک طویل مصرع ہی ہوتی ہے۔ وہ بہاؤ جو نظم آزاد کے پہلے لفظ سے آخری لفظ تک موجود رہتا ہے،ایوب خاور کے ہاں باقاعدہ ایک فنی اعجاز بن گیا ہے۔نظم آزاد کا پیرایہ اظہار ایوب خاور کے مزاج وافتاد کے عین مطابق ہے اوراگرچہ افواہ ہے کہ اس نے چند نثری نظمیں بھی لکھی ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ نظم آزاد کے وہ امکانات اسے کبھی بھٹکنے نہیں دیں گے جن سے وہ بہت اچھی طرح متعارف ہے۔

ایوب خاور کے موضوع ومواد کی ایک اہم خوبی اس کا مفکرانہ انداز ہے۔ وہ مسائل کی محض سطح پر نہیں منڈلاتا بلکہ ان کی گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے اس لیے اس کے فن میں ایسی گمبھیرتا،ایسا بھرپور پن ہے جو اس کے ہم سن شعرا میں شاذ ہی دست یاب ہے۔ یہ اُردو شاعری میں غالبؔ اور اقبالؔ کی فکری روایات کی توسیع ہے۔ دراصل ہر دور کے اپنے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں اور ہر دَور کا مفکر انھی تقاضوں کے تحت ان مسائل کا فنی تجزیہ کرتا ہے۔یوں ہر نئے دور کی فکر کو گزشتہ دور کی توسیع قرار دیا جاسکتا ہے۔مسائل کا ردِّعمل منفی بھی ہوسکتا ہے اور مثبت بھی۔ایوب خاور کا رجحانِ طبع بیش تر اثبات کا ہے۔اگر اس کے ہاں کہیں کہیں نفی کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے تو یہ شر کی نفی ہے اور شر کی نفی ہی خیر کے اثبات کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ایوب خاور بے کیفیوں،اداسیوں اور شکستوں کا فاتح ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں اور غزلوں میں انتہائی کرب کے موثر اظہار کے باوجود اس افق کی کیفیت مسلسل موجود رہتی ہے جو طلوعِ آفتاب کی پزیرائی کے لیے آہستہ آہستہ منور ہوتا چلا جاتا ہے۔ایوب خاور کا یہ فکری اسلوب اسے اپنے دور کے شعرا میں ایک امتیاز بخشتا ہے اور یہی امتیاز اس کی پہچان ہے۔

ایوب خاور کی غزل بھی اس کی نظم کی طرح تہہ دار ہے۔ ویسے صحیح معنوں میں تو غزل ہوتی ہی تہہ دار ہے کیوں کہ اگر اس میں سے رمزیت کو خارج کر دیا جائے تو وہ ایک کھنڈر سا بن کر رہ جاتی ہے مگر خطرہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں شاعر اپنے عہد کے آشوب اور کرب کو الفاظ میں منتقل کر رہا ہوتا ہے تب غزل عموماً بیانیہ شاعری میں بدل جاتی ہے اور اگرچہ بیانیہ شاعری کی بھی ایک اپنی اہمیت ہے مگر غزل کے لیے بیانیہ اسلوب کسی صورت میں مناسب نہیں سمجھا گیا۔ایوب خاور غزل کے رمزیاتی حسن سے جی بھر کر کام لیتا ہے۔صداقت کی جستجو میں بھی رہتا ہے، وہ بے چین بھی ہوتا ہے،کڑھتا بھی ہے مگر مجال ہے جو اس کے ہاں Narration کا انداز جگہ پاسکے۔

وہ اوّل وآخر شاعر ہے، وہ شاعری کے جملہ مطالبات کا لحاظ رکھتا ہے اور تمام فنی تقاضوں کا احترام کرتا ہے اور وہ اس کے باوجود جدید ہے بلکہ جدید تر ہے۔ علامتوں، استعاروں اور لفظوں کو نئی معنویتوں سے آراستہ کرنے والا شاعر، تیکھا شاعر اور جدید تر کا نمائندہ شاعر۔۔

اختر حسین جعفری

خواب آمیز عالمِ بیداری

ایوب خاور اپنا شعری تجربہ خارج میں موجود معاشرتی تضادات اور شعورِ ذات کے اُن مضافات سے کشید کرتا ہے جہاں آج کا انسان اپنے آپ کو اندرونی سطح پر کئی حصوں میں بٹا ہوا محسوس کرتا ہے۔ یہ مضافات وجود کی دوئی اور عدم اور وجود کی باہم ستیزہ کاری کے مضافات ہیں تاہم فکر کی یہ عمیق رَو اور زندگی کے بارے میں اس کا حکیمانہ طرزِ عمل اُسے اس شعری غنائیت Poetic Lyricism کے قرب و جوار سے دور نہیں لے جاتا جو کسی بھی زبان کی شاعری کا ایک بنیادی اور اہم جزو متصور ہوتی ہے۔

عصری اعتبار سے ایوب خاور کسی دیو مالائی عہد کا متلاشی نہیں۔ وقت کی حیثیت اُس کے شعری عمل میں ادکتاوَ پاز کی زبان میں ساعتِ سیّار کی نہیں، ساعتِ مطلق کی ہے۔ عصر کا تصور اس کے ہاں اپنی کلیت میں ایک ایسے لمحے، ایک ایسے پَل کی صورت میں ملتا ہے جہاں تمام ابتدائیں اور انتہائیں مل کر اُس کے لیے ایک نئی شعری معنویت تخلیق کرنے کا سبب بنتی ہیں، جہاں صداقت اپنے وجود کی نفی سے اپنا اثبات پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک ایسا خواب آمیز عالم بیداری ہے جہاں انسان خود اپنا وجود ہو کہ ذات یا پھر اپنی کوئی تازہ لکھی ہوئی نظم خود اپنے سوادِ حیات میں رکھ کر بھول جاتا ہے۔ یہ احساسِ خود فراموشی، یا برونِ وجود میں زندگی کو یاد رکھنے کا سلسلہ ایوب خاور کے ہاں ملارمے کی تقلید میں اردو نظم لکھنے والے ان شعرا سے یکسر مختلف ہے جن کی علامتیں محض ذاتی اور اُردو شاعری کی مستند عمومی روایت سے منقطع ہونے کے ناتے ایک طرح کے احساسِ تنہائی کا شکار نظر آتی ہیں۔

درونِ ذات کا فساد ہو کہ خارج میں موجود کوئی عصری تضاد، ایوب خاور غیر ضروری مرصع کاری سے اجتناب کرتے ہوئے ایک انقلابی نوعیت کی شعری منطق (Syllogistics) کی بنیاد رکھتا ہے اور اپنے نو بہ نو موضوعات کے صغریٰ، کبریٰ اور نتائج کی منطقی اشکال کو انتہائی فنی مہارت سے آشنا کرتا ہے اور اس طرح نظمِ جدید کی اس عمارت کی تکمیل میں مصروف دکھائی دیتا ہے جس کے بام و دَر سے گزرتی ہوئی تازہ ہَوا میں خود اُس کے اپنے انفاس کی رَو شامل ہے۔

گلزار (ممبئی)

گل زار کی بات

میں شاعری کو ایسے ہی سپ (SIP) کرتا ہوں، دھیرے دھیرے مہکتی ہوئی گرم چائے کی طرح یا برف میں پگھلتی ہوئی وہسکی کی طرح، ہونٹوں کے اُوپر سے سرکتی ہوئی، زبان کو چھوتی ہوئی، حلق سے نیچے اُترتی ہے اور پورے سسٹم (وجود) میں گھلتی چلی جاتی ہے، جسم کا درجہ حرارت مدھم مدھم بڑھنے لگتا ہے۔ میں ایوب خاور کے شعر بھی اسی طرح سپ (SIP) کرتا ہوں، پھونک پھونک کر چسکیاں لے کر حلق سے نیچے اُتارتا ہوں۔

ایوب خاور کا طرزِ اظہار خالص اس کا اپنا ہے۔ ایک شاعر کو جو بات دوسرے شاعر سے الگ کرتی ہے وہ اس کی آواز کا ٹمبر (Timber) ہے۔ بولتے ہوئے ہونٹوں کی بناوٹ سب کی الگ ہوتی ہے۔ چاہے وہ ایک ہی لفظ کیوں نہ بول رہے ہوں لیکن ''محبت'' شعر کے دونوں مصرعوں کی بناوٹ لگتی ہے۔ خیال کو جو چیز نثر سے چھان کر شاعری بناتی ہے وہ کہنے کا ڈھنگ ہے، اس کی اپنی موسیقی ہے، سرتال ہے، ردھم ہے جس پر پاؤں رکھ کر مصرعے چلتے ہیں۔ مجھے ایوب خاور کے مصرعوں کی چال بہت خوب صورت لگتی ہے، لمبے لمبے مصرعے بڑے چھوٹے چھوٹے قدموں سے آگے بڑھتے ہیں۔ ہر بار لگتا ہے مصرع کتھک کی چال چل رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ ایوب خاور کی شاعری میں کلاسیکیت اور جدیدیت کے ایسے بھرپور ذائقے گھلے ہوئے ہیں کہ ان میں سب کو اپنی اپنی طرح کا رَس مل جاتا ہے۔ میں تو اس وقت بھی قطرہ قطرہ اس کے مصرعے سپ (SIP) کر رہا ہوں۔

دل کی چوکھٹ سے لگا بیٹھا ہے تنہائی کا چاند اور اچانک کسی جانب سے اگر تو نکل آئے!

....

آئینہ سامنے رکھیں تو نظر تُو آئے تجھ سے جو بات چھپانی ہو ، کہا کس سے کریں
ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں اب بتا! کون سے دھاگے کو جُدا کس سے کریں

....

بات جو دل میں دھڑکتی ہے محبت کی طرح اس سے کہنی بھی نہیں، اس سے چھپانی بھی نہیں
کچے ایندھن میں سلگنا ہے اور اس شرط کے ساتھ تیز کرنی بھی نہیں آگ بجھانی بھی نہیں

....

یہ جو انصاف طلب لوگ کھڑے ہیں صاحب کیا کریں آپ سے اب آپ کا سر مانگتے ہیں

دل کی رگ رگ نچوڑ لیتا ہے   عشق میں یہ بڑی مصیبت ہے

....

خلوت حسن تغافل کبھی ہم آئیں گے   کنج لب میں سے کوئی نظم چرانے کے لیے

ایوب خاور ٹیلی وژن کا ڈراما پروڈیوسر بھی ہے، اعلیٰ درجے کا ڈائریکٹر ہے اور اس کے کریڈٹ پر بہت مشہور ڈرامے اور سیریلز ہیں۔ اس کی جبلت میں شاعری اور ڈراما کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اللہ اسے نظر بد سے بچائے، دوسری کتاب بہت وقفے سے آئی ہے، تیسری جلد ہی آنی چاہیے۔ مجھے فنون میں اس کی شاعری اور ٹی وی پر اس کے ڈراموں کا انتظار رہتا ہے۔

ڈاکٹر انور سجاد (لاہور)

آہنگِ خاص

80ء کی دہائی میں اپنی پختگی کا احساس دلانے والے شاعروں میں ایوب خاور سب سے نمایاں اور اہم نظر آتا ہے۔ بصری میڈیم سے گہرا تعلق ہونے کے باعث اس کی امیجری انتہائی بصری ہے اور جزئیات سے لب ریز، یعنی اس کی شاعری میں زندگی اپنی پوری باریکی اور تفصیل سے نظر آتی ہے اور یہی اس کے شعری ہنر کا امتیاز ہے اور یہی خاص طور پر اس کی نظم کا وصف بھی۔ ڈراما نگار ہونے کے باعث ایوب خاور کے ہاں اکثر مقامات پر ڈرامائی عناصر بھی اپنی مخصوص اور پوری توانائی سے اظہار پاتے ہیں۔ دعا، مون سُونی رقص کے کچھ منظر، اماوس، ایک منجمد وداعی لمحہ In the Absence of God اور In the Presence of God ایسی نظمیں، اس امر کی گواہ ہیں۔ مجھے اُس کے پہلے مجموعوں ''تمہیں جانے کی جلدی تھی''، اور ''گلِ موسمِ خزاں'' کے منظر ناموں نے بھی بہت متاثر کیا تھا۔ خاص طور پر جو تاریخی جبر کے شکنجے میں سسکتی، تڑپتی جمہوریت کے ناقابل فراموش نوحے اور رزمیے ہیں۔

اس مجموعے ''بہت کچھ کھو گیا ہے'' کی نظم ''لاریب'' میں جس انداز سے زندگی تاریخ و تہذیب کے آئینے میں دیکھی گئی ہے، Epic کی یاد دلاتی ہے۔ موسیقی سے گہری دل چسپی اور سر تال کے ادراک نے ایک خاص آہنگ سے بھی اس کی شاعری ہم کنار کی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ مجموعہ خاص اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اسی لیے میں ایوب خاور کو اس کے ہم عصروں میں ایک غیر معمولی شاعر سمجھتا ہوں۔

عطاء الحق قاسمی (لاہور)

خوب صورت ڈکشن
اور خوب صورت خیال کا شاعر

ایوب خاور کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ کراچی میں اور میں لاہور میں ہوتا تھا اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھی تھی یعنی وہ کیسے اچھے دن تھے! اب گزشتہ چند برسوں سے ہم دونوں ایک دوسرے کو ایک دوسرے کی نظم و نثر سمیت برداشت کر رہے ہیں۔ جب وہ کراچی میں تھا تو میں اس کی غزلیں ''فنون'' میں پڑھا کرتا تھا اور ان سے لطف اندوز ہوتا تھا لیکن جب سے اس کے ساتھ ''دوبدو'' دوستی ہوئی ہے۔ اس کی غزلیں کہیں چھپی دیکھتا ہوں تو پڑھنے کی کوئی اتنی جلدی نہیں ہوتی کہ اپنا ''خوشیا'' ہی تو ہے۔ دراصل مداح اور ممدوح کی جب بھی دوستی ہوتی ہے، بیچارے ممدوح کا انجام یہی ہوتا ہے!

آگے چلنے سے پہلے ایک اعلان ابھی سے کرتا چلوں اور وہ یہ کہ میں دوستوں کے خاکے خاصے مختصر لکھتا ہوں کیوں کہ تفصیلی لکھنے سے وہ ناراض ہو جاتے ہیں، ایوب خاور کے بارے میں اظہار خیال تو مزید مختصر کروں گا کیوں کہ یہ انتہا سے زیادہ شریف آدمی ہے۔ چناں چہ اگر میں نے اس کی شرافت کی تفصیلات بیان کیں تو یہ بھی ناراض ہو جائے گا۔ کون شریف آدمی چاہتا ہے کہ اس کی ریپوٹیشن ایک شریف آدمی کی ہو۔ خاور کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے ''اپنے پرائے'' کی ریکارڈنگ کے دوران ہوا کہ لاہور ٹیلی وژن کے لیے یہ سیریل لکھنے پر مجھے اس نے زبردستی آمادہ کیا۔ یہ ایک علیحدہ کہانی ہے تاہم اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ سیریل کے دوران خاور سے میری لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ جس سے محبت پختہ ہو گئی۔ بہرحال اس عرصے میں اور ظاہر ہے اس سے پہلے بھی جو خاور میرے سامنے آیا، وہ ٹیلی وژن میں رہتے ہوئے بھی خواتین سے دور دور رہنے والا خاور ہے۔ یعنی

بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں!

چناں چہ کام کی طلب گار خوش نما بیبیاں اس کے دفتر کے چکر لگاتی تھیں اور یہ انہیں آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اورینٹل کالج میں میرا ایک دوست عبدالغنی فاروق بھی انتہائی شریف آدمی تھا۔ اُسے لڑکیوں کے جھرمٹ میں جس سے ٹکرانا ہوتا، اُس سے جا ٹکراتا اور یوں اُس کی دیکھا دیکھی ہم لوگوں نے بھی نظریں جھکا کر چلنا شروع کر دیا

تھا۔تاہم اپنا ایوب خاور تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے مگر اس دوران اس کی آنکھوں میں ایک بال سا ہمیشہ موجود رہتا ہے۔جس کی وجہ سے خوب صورت غزلیں کہنے والے اس شاعر نے کتنی ہی غزلیں اپنے دیوان میں شامل ہی نہیں ہونے دیں،حالاں کہ ایک ٹیلی وژن پروڈیوسر کے بارے میں شبہ ہے کہ جب بطور پروڈیوسر اپائٹمنٹ کے بعد اس نے اپنی پہلی تنخواہ وصول کی تو اس نے حیران ہو کر کہا''ہیں!اس کام کی بھی تنخواہ ملتی ہے!''

ایوب خاور کی شخصیت کا دوسرا پہلو اس کا ایمان دار ہونا ہے، کام کے اوقات کے دوران اگر شعر بھی سوجھ رہا ہو تو اسے بھی کان سے پکڑ کر دفتر سے باہر نکال دیتا ہے۔اسی طرح یہ شخص پاگل پن کی حد تک محنتی ہے۔میں نے اسے مسلسل اڑتالیس اڑتالیس گھنٹے کام کرتے دیکھا ہے اور خالی پیٹ کام کرتے دیکھا ہے۔اور شاید اس کی''قابلِ رشک''صحت کا یہی راز ہے۔حالاں کہ شوبزنس سے وابستہ خواتین بھی جنھیں سمارٹ نظر آنا چاہیے۔بہت چٹوری ہوتی ہیں اور ڈائٹنگ وغیرہ کے جھمیلوں میں نہیں پڑتیں۔چناں چہ ایک دفعہ حسن لطیف مرحوم نے ایک محفل میں ملکہ ترنم نور جہاں سے کہا تھا کہ''بی بی کوئی ایسا گانا سناؤ جو تم نے خالی پیٹ گایا ہو؟''اور ایوب خاور کی شخصیت کا چوتھا اور سب سے اہم پہلو اس کا انتہائی تخلیقی ہونا ہے۔یہ شخص جب کوئی پروگرام کر رہا ہو اس میں مکمل طور پر ڈوب جاتا ہے اور اس کی کتنی ہی خوب صورت جہتیں سامنے لاتا ہے حتیٰ کہ اگر اسے''اللسان العربی''والا پروگرام بھی سونپ دیا جائے تو مجھے یقین ہے یہ پروگرام دیکھنے والے''حبیب بینک لمیٹڈ''کو بھی حبیب بینک اَن لمیٹڈ کہنے لگیں گے!

ایوب خاور ہمارے ان شعرا میں سے ہے جن کی ڈکشن یکسر طور پر مختلف ہے اور میرے نزدیک بالکل اچھوتی ڈکشن والے شعرا میں منیر نیازی، اختر حسین جعفری، ثروت حسین، محمد اظہار الحق، اجمل نیازی، زاہد مسعود، علی اکبر عباس اور ایوب خاور شامل ہیں۔اگر اچھوتی ڈکشن ہی سب کچھ ہوتی تو شاید ایوب خاور یا دوسرے شعرا میرے نزدیک اتنے اہم نہ ہوتے، کیوں کہ ڈکشن تو شاعری کا لبادہ ہے اس کا لباس ہے جس طرح کچھ شاعر پھندنے والی ٹوپی پر مالٹا باندھ کر مشاعروں میں کلام سناتے ہیں اور یوں بھرے مجمع میں بھی پہچانے جاتے ہیں، اسی طرح اگر یہ شعرا خالی خولی ڈکشن اپنے سروں پر سجائے پھرتے تو ان میں اور پھندنے والی ٹوپی سر پر سجانے والوں میں کوئی فرق نہ ہوتا مگر جس طرح لباس کے اندر کوئی انسان بھی چھپا ہو، تو اس انسان کی عزت ہوتی ہے، اس طرح ڈکشن کے لبادے میں شاعری موجود ہو تو شاعر صاحبِ عزت کہلاتا ہے۔ایوب خاور میرے نزدیک صاحبِ عزت شاعر ہے کہ اس کے پاس ڈکشن بھی ہے اور خوب صورت خیال بھی ہے یعنی دستار بھی ہے اور دستار کے نیچے سر بھی ہے۔چناں چہ میں اس وقت سے اس کا مداح ہوں جب وہ کراچی میں ہوتا تھا اور اس نے میری اور میں نے اس کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔میں اس زمانے میں اس کی غزلیں پڑھ کر بہت مرعوب ہوتا تھا مگر اب تو وہ میرا دوست ہے، بہت جی چاہتا ہے کہ اس کی بڑائی کا اعتراف کروں لیکن دوستوں کی بڑائی کا اعتراف بھلا کیسے کیا جا سکتا ہے؟

شکیل عادل زادہ (کراچی)

باقی سب ہوس

ایوب خاور شاعر نہ ہوتے تو مصور ہوتے۔یوں کہیے کہ ان کا یہ مجموعہ مصورانہ شاعری کا کمال ہے۔کیسے کیسے مناظر، کس کس زاویے سے انہوں نے مصور کیے ہیں۔سارے کلام، سارے مجموعے میں رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔پہلی شرط تو خیال ہے، مصور ہو، شاعر یا موسیقی کار، پہلی شرط تو خیال کاری و خیال آفرینی ہے۔اس کے بعد آواز کی، اطوار کی، رنگ کی اور پیراہن کی منزل آتی ہے، گویا صناعی و فن کاری کے مرحلے کی۔دونوں منزلوں اور مرحلوں میں ایوب خاور نے بڑی توانائی اور تمکنت سے اپنا وجود باور کرایا ہے۔

میں اپنی بات کروں، آزاد قسم کی اس شاعری سے مجھ بے اماں، بے مایہ کو ایسی کوئی رغبت نہیں ہے لیکن ادھر کچھ عرصے سے اس نوع کی شاعری متواتر اپنا اثر و ہنر اور فکر و سحر منکشف کرنے کے درپے رہی ہے اور بے شک اس شاعری کے تخلیق کاروں میں ایک نمایاں شاعر ایوب خاور ہیں۔وہ میرے ہم جولی بھی ہیں، دوست بھی اور میرے محترم و مکرم بھی۔تعلقِ خاطر اُن سے بہت پہلے کا ہے۔یہ محترم و مکرم کا منصب انہوں نے اپنی شاعری کے طلسم سے جسم و جاں میں قائم کیا ہے۔

ان کی جامع الصفاتی کا کیا احوال، ادیب، کہانی کار، ڈراما نگار، ہدایت کار اور شاعر۔ڈراموں کی ہدایت میں انہوں نے ایک مرتبت حاصل کی ہے لیکن سب سے بڑا ہنر تو اُن کی شاعری ہے اور میں گواہ ہوں، شاعری اُن کے لیے پہلا مسئلہ ہے، باقی تمام معاملات و مشاغل ثانوی اور بہت بعد کے ہیں۔ان دنوں ان کی رفاقت کے مواقع افراط سے واقع ہوتے ہیں۔وہ ایک مضطرب آدمی ہیں۔ان کی شاعری سے ان کے ہیجان و اضطراب کا احساس کچھ سوا ہوتا ہے۔لگتا ہے، کہیں کچھ رہ گیا اور کہیں کچھ کھو گیا ہے جس کی وہ تلاش میں ہیں۔یوں ہر لحاظ سے وہ بڑے کام یاب ہیں مگر کام یابی سے مراد بامرادی نہیں ہے۔جانے کیا خلش ان کے رگ و پے میں اٹک گئی ہے۔کوئی حسرت جو پوری نہیں ہو پاتی۔زندگی بہ ظاہر کتنی ہی مہربان ہو، لگتا ہے روٹھی ہوئی بھی کچھ کم نہیں۔یہی کچھ تمام و نا تمام کی حالت، یہ ناگفتنی انہیں شاعری پر آمادہ کرتی ہے، یعنی شاعری اُن کے لیے ذریعۂ عزت اتنی نہیں جتنی گوشہ اماں کی حیثیت رکھتی ہے یا اس کی حیثیت کسی سپر کی بھی ہے۔یہ پناہ گاہ اور سپر بھی یاں کسے نصیب ہوتی ہے۔یہی سارا کچھ ماجرا دیکھ کے جی کرتا ہے کہ نہاں خانے کی کشاکش ایسی دردناک اور رحم طلب بھی نہیں۔مآل یہ تخلیق کاری، یہ مثال آفریں سخن طرازی و سخن پردازی، یہ دل نشین، نشاط افزا، فکر نما، خیال پرداز شاعری تو......تو ٹھیک ہے، اس کے سوا کیا......باقی سب ہیچ، بے مقدار، ناپائدار......باقی سب ہوس! وما علینا الا البلاغ

امجد اسلام امجد (لاہور)

ایوب خاور کے لیے کچھ لفظ

شاعر دوستوں کی کتابوں پر لکھنا ایک بہت مشکل عمل ہوتا ہے کہ قدم قدم پر انیس کا ''خیالِ خاطرِ احباب'' والا شعر آپ کا قدم روکتا ہے مگر جب کوئی دوست ایوب خاور جیسا غیر معمولی شاعر ہو تو یہی مشکل کام خود بخود آسان ہوتا چلا جاتا ہے کہ آپ جو بھی اسمِ توصیف استعمال کرتے ہیں متعلقہ کتاب کا ایک ایک ورق خود اُٹھ کر اُس کی گواہی دیتا ہے۔ ایوب خاور زمانی اعتبار سے مرحومہ پروین شاکر کا ہم عصر ہے لیکن یہ دونوں مجھے اس قدر عزیز ہیں کہ عمروں کا سات آٹھ برس کا فرق کبھی ہماری دوستی میں حائل نہیں ہوا۔

ہر اچھے شاعر کی طرح ایوب خاور کے اس تازہ شعری مجموعے ''بہت کچھ کھو گیا ہے'' کو پڑھتے وقت آپ ایک خوش گوار اور دلچسپ تجربے سے گزریں گے کہ اس میں وہ ایوب خاور بھی دکھائی اور سنائی دے گا جس کو آپ جانتے اور پہچانتے ہیں اور اُس کی تخلیقی شخصیت کے کچھ ایسے رنگ بھی آپ کا رستہ روکیں گے جو اس سے پہلے شاید ''غنچگی'' کے کسی عالم میں تو نظر آئے ہوں لیکن اُن کا موجودہ مخملِ تر کا سا روپ بالکل نیا اور انوکھا ہوگا جس کی کچھ مثالیں گلزار صاحب نے اپنے دیباچے میں بھی درج کی ہیں۔

ایوب خاور کی شاعری مجھے اس لیے بھی پسند ہے کہ وہ موسیقی سے اپنی طبعی رغبت کی بِنا پر اپنی شاعری میں ایک ایسی نغمگی کی کیفیت ہمیشہ برقرار رکھتا ہے جو نہ صرف شعر کی قرأت کے دوران لطف دیتی ہے بلکہ اپنی معرفت معانی کے بھی کچھ ایسے در وا کرتی چلی جاتی ہے جن کی ایک اپنی منفرد جمالیات ہے اور بہت کم شاعر ہیں جو ایوب خاور کی طرح اس ہفت خواں کو اتنی آسانی اور کامیابی سے طے کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

''بہت کچھ کھو گیا ہے'' بلاشبہ ایک ایسی کتاب ہے جو نہ صرف جدید اُردو شاعری کے مستقبل کے بارے میں بہت سے منفی رجحانات اور تحفظات کا بھرپور جواب دیتی ہے بلکہ آپ اس کھڑکی سے سخن کے اُس روشن آسمان کو بھی دیکھ سکتے ہیں جہاں صرف ایسے ''مغنّیِ آتش نفس'' قیام کرتے ہیں جنھیں ڈھونڈنے کی پیر و مرشد مرزا غالب نے بھی تمنّا کی تھی۔

حیدر قریشی (جرمنی)

''گلِ موسمِ خزاں'' اور ''تمہیں جانے کی جلدی تھی''

ایوب خاور تازہ کار اور خوش فکر شاعر ہیں۔ ٹیلی ویژن کی دنیا کی مصروفیات نے ان کے اندر کے شاعر کے اظہار میں کچھ نہ کچھ رکاوٹیں تو ڈالیں لیکن وہ شاعر نہ صرف زندہ رہا بلکہ اپنی آن بان اور شان کے ساتھ زندہ

رہا۔ اس شاعر کی زندگی کے ثبوت کے طور پر ان کے دو شعری مجموعے ''گلِ موسمِ خزاں'' اور ''تمہیں جانے کی جلدی تھی'' پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ایوب خاور بنیادی طور پر نظم کے نہایت شاندار شاعر ہیں لیکن ان کی غزل بھی اتنی گسی ہوئی اور بھرپور ہوتی ہے کہ انہیں صرف نظم کا شاندار شاعر کہہ دینا ان کی غزل کے ساتھ ناانصافی ہو جاتا ہے۔

ان کی نظم ''ماں'' جدید ادب میں خانپور کے زمانہ میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم کا ایک بڑا اقتباس میری والدہ کے خاکہ ''مائے نی میں کنوں آکھاں'' کے اختتام میں اس طور سمایا ہے کہ اسے اس خاکے سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ شاید اس لیے بھی کہ ہم جیسوں کی مائیں ایک جیسی تھیں۔

میں ایوب خاور کی نظم کا ایسا خاموش قاری ہوں جو خود ہی اس سے لطف کشید کرتا رہتا ہوں۔ ''گلِ موسمِ خزاں'' کی نظم ''گھروں میں ایک گھر ایسا بھی تھا'' پڑھتے ہوئے مجھے لگا کہ اس میں سے چند سطریں غائب ہیں:

''زمانہ ایک بنئے کی طرح چالاک ہے/ہونی کو انہونی میں، انہونی کو ہونی میں کچھ ایسے ہی بدلتا ہے
کہ جس کے دکھ میں آنکھوں کے بھرے ساون پیالے ٹوٹ جاتے ہیں''

ان سطور کے بعد نظم کا یہ حصہ غائب ہے:

''ہوا سوچوں میں گرہیں ڈال دے تو روح کے اندر اترنے والے ساتھی چھوٹ جاتے ہیں''

میں ربع صدی پیشتر پڑھی ہوئی مذکورہ نظم کے بارے میں اپنی یادداشت کے بل پر یہ نشاندہی کر رہا ہوں، ایوب خاور کتاب کے نئے ایڈیشن میں نظم کو دوبارہ چیک کر لیں تو اچھا ہے۔

غزلوں میں سے کسی انتخاب کے بغیر چند اشعار پیش ہیں۔ ایوب خاور کا یہ عمومی انداز بھی بہت خاص ہے۔

ہوا کو اپنے لیے بادبان میں نے کیا — حدِ نظر سے پرے، آسمان میں نے کیا
تیری آنکھیں میری آنکھیں لگتی ہیں — سوچ رہا ہوں کون یہ تجھ سا مجھ میں ہے
وہ نیند اپنے بچپنے کی راہ میں اجڑ گئی — اس آنکھ نے بھی معجزوں کے سو جہان کھو دیئے
تیرے بِنا جو عمر بِتائی بیت گئی — اب اس عمر کا باقی حصہ تیرے نام
یاد رکھنے کے لیے اور نہ بھلانے کے لیے — اب وہ ملتا ہے تو بس رسم نبھانے کے لیے
حُسن اور عشق کے مابین ٹھنی ہے اب کے — اس لڑائی میں کسی ایک کا سر جائے گا

تیسرے مجموعے کی اشاعت کے بعد ایوب خاور تینوں مجموعے ایک جلد میں لائیں تاکہ ان کی مجموعی شعری قدر و قیمت سامنے آ سکے۔

ایوب خاور

کچھ بھی نہیں بدلا

''گل موسم خزاں'' پہلی بار 1991ء میں اسلم گورا نے شائع کی جس میں 1970ء سے 1990ء تک کا میرا کلام

شامل ہے۔دوسری بار صفدر حسین نے اپنے ادارے الحمد پبلی کیشنز کے زیرِ اہتمام 2001ء میں ’’تمھیں جانے کی جلدی تھی‘‘ کے ساتھ ہی شائع کیا۔لیکن محترم اختر حسین جعفری جو ہمارے عہد کے انتہائی قابل ذکر اور منفرد نظم نگار ہیں،اُن کی وہ تحریر جو انہوں نے بہت محبت اور سنجیدگی کے ساتھ میری شاعری کے بارے میں لکھی تھی اور اس کتاب کی پہلی اشاعت میں شامل تھی،گم ہو جانے کی وجہ سے دوسری اشاعت میں شامل نہ ہو سکی اور خود میں نے جو اپنے بارے میں فلیپ کے طور پر پہلی اشاعت کے لیے لکھا تھا وہ بھی ناپید تھا۔خوش قسمتی سے یہ دونوں تحریریں مجھے اپنے پیارے دوست اور بہت اچھے شاعر اور خاکہ نگار اعجاز رضوی کے گھر سے مل گئیں جو اَب ’’گل موسم خزاں‘‘ کی تیسری اشاعت میں شامل ہو گئی ہیں۔ پروف ریڈنگ کے دوران میں نے کچھ نظموں اور غزلوں میں ترمیم و اضافہ بھی کیا ہے،اس خیال سے کہ تخلیقی سفر میں ترمیم و اضافہ بلکہ ردّ و قبول کو بھی شاعر ادیب کے Progressive اور مثبت رویّے کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔میں نے صفدر سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے ادارے کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی دونوں کتابوں کی تقریبِ رونمائی اکٹھی کریں گے مگر تب سے اب تک میں کسی ایسے دن سے ہاتھ ہی نہ ملا پایا جس کی شام اپنے دوستوں کو اکٹھا کر سکتا۔تب سے یہ وقت آ گیا کہ ’’گل موسم خزاں‘‘ کا تیسرا ایڈیشن پریس میں جا رہا ہے۔

زندگی نے ویسے بھی ہمیں ستانے کے لیے اپنی چھاؤں میں کب اتنی جگہ دی ہے کہ تازہ دَم ہو پاتے۔جب میں نہیں تھا اور جب میں بچہ تھا اُس زمانے میں پاکستان کے وجود کے اندر جو شکست و ریخت ہوتی رہی، اُس کا سچ جھوٹ کتابوں میں پڑھا۔1971ء میں آدھا پاکستان ہمارے وجود سے کٹ گیا۔1977ء تک اس آدھے زخمی وجود پر ہمت و جرأت کے پھائے رکھنے میں گزرے، پھر گیارہ سال تک باقی ماندہ پاکستان سے سورج ناراض رہا۔اگلے بارہ چودہ سال تک سیاسی شعبدہ باز ایک نئے رُخ سے اس کے مندمل وجود کے کھرنڈ نوچنے میں لگے رہے۔ پھر 1999ء کے آسمان سے ایک نئی ڈکٹیٹر شپ اُتری اور ہمیں ٹوئن ٹاورز کی طرح زمیں بوس ہوتے ہوتے آٹھ سال لگ گئے ۔اور اب تو شکاری مچانوں سے اُتر کر اور خندقوں سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔اور ہم ایک مجسم سوال کی طرح خود اپنے سامنے کھڑے ہیں۔کچھ بھی نہیں بدلا۔ یہاں میں یکم جولائی 1991ء کے لکھے ہوئے اپنے بارے میں ایک نوٹ جو ’’گل موسم خزاں کے پہلے ایڈیشن کے فلیپ کے طور پر شائع ہوا تھا اس کا آخری جملہ درج کرتا ہوں۔

’’کچھ بھی نہیں بدلا،صرف تبدیلی کی خواہش اس خطے کی آب و ہَوا میں سوکھے بادلوں کی طرح گرجتی رہی ہے۔ ’’گل موسم خزاں، اسی تشنہ کامی اور اسی خواہشِ ناتمام کا پیش لفظ ہے۔‘‘ لگتا ہے ابھی 1971ء نہیں گزرا۔1977ء ابھی تک کال کوٹھڑی میں سسک رہا ہے۔1979ء ابھی تک پھانسی گھاٹ پر لٹک رہا ہے اور گزشتہ آٹھ نو سال ٹوئن ٹاورز کے ملبے تلے دبے کسی معجزے کے منتظر ہیں۔

ایوب خاور (لاہور)

حمدیہ

برگِ گل، شاخ ہجر کا کر دے
اے خدا! اب مجھے ہرا کر دے
ہر پلک ہو نم آشنا مجھ سے
میرا لہجہ بہار سا کر دے
مجھ کو روشن مرے بیان میں کر
خامشی کو بھی آئینہ کر دے
بیٹھ جاؤں نہ تھک کے مثل غبار
دشت میں صورتِ صبا کر دے
میری تکمیل حرف و صوت میں ہو
مجھے پابند التجا کر دے
کون دستک پہ کان دھرتا ہے
تو مرے ہاتھ دل کشا کر دے
اے جمالِ دیار کشف و کمال
موجۂ رنگ کو نوا کرے

ایوب خاور

نعتیہ

یہ کس مقام سے روشن ہوا کہاں ترا نام
چراغ اور اندھیرے کے درمیاں ترا نام
مثالِ موجِ صبا قریۂ نگاہ میں ہے
مرے زمانۂ حیرت کا پاسباں ترا نام
ازل مقام سے پہلے ابد مقام کے بعد
جہاں جہاں پہ خدا ہے وہاں وہاں ترا نام
دلوں کے قفل کھلیں، آنکھ پر کھلیں منظر
حبیبِ رب سحر! جب بھی لے زباں ترا نام
یہی کہ آئینہ خانہ ہے کائنات مگر
صفاتِ آئینہ کو عکسِ جاوداں ترا نام
لبوں سے حرفِ دعا کے بچھڑنے سے پہلے
زوالِ موسمِ جاں پر ہو مہرباں ترا نام
ہوائے مکہ و بطحا کی ہو رِدا سر پر
دلِ شکستہ میں جب بھی ہو ضوفشاں ترا نام
مرا جواز فقط یہ کہ اُمّتی ہوں ترا
ترا جواز کہ ہے وجہِ دو جہاں ترا نام

ایوب خاور

سلام

سرِ دشتِ کرب و بلا ابھی وہی رنگِ ماہِ تمام ہے
وہی خیمہ گاہِ سکینہ ہے وہی سجدہ گاہِ امام ہے
ابھی چشم و دل سے چھٹے نہیں،

ترے صبر و ضبط کے مرحلے

وہی صبر و ضبط کے مرحلے، وہی تیرے قتل کی شام ہے
وہی مشک شانۂ صبر پر، وہی تیر پیاس کے حلق میں
وہی آب جوئے فرات ہے، وہی اس کا طرزِ خرام ہے
وہی شامِ کوفہ ہے چار سو، وہی سطرِ وعدہ لہولہو
وہی نوکِ خنجر تیز ہے، وہی حرفِ حیلۂ خام ہے
وہی ماتمِ مہِ کربلا وہی حاصلِ دلِ مبتلا
یہی رنگ ہے، میرے نطق کا، یہی میرا رنگِ سلام ہے

ایوب خاور

میرے لیے میری بیگم کی طرف سے ایک نظم

نیند نہیں آتی ہے
اندھی، بہری، کالی رات میں رنیند کہاں آتی ہے
نینداور خواب کے بیچوں بیچ ربستر کی ہر سلوٹ میں
عمرِ گذشتہ کے ہر کھٹے میٹھے لمحے کی سرگوشی
چھوڑ نہیں پاتی ہے رنیند نہیں آتی ہے
نیند کہاں آتی ہے
خالی گھر کی دہشت بھری سہولت میں
شاخ سے ٹوٹے پتوں جیسے
زرد دنوں کی روکھی پھیکی فرصت میں
نیند کہاں آتی ہے
ہاتھ سے رگر کر ریکھاؤں کے دریا سوکھتے جاتے ہیں
آتے جاتے لوگ تمھارے بارے پوچھتے رہتے ہیں
گھر کی ہر اِک شے اور بچّے
چپ کی بُکّل مار کے میرے سامنے بیٹھے رہتے ہیں
نیند آ جائے تو اپنے کمروں میں جا کر سو جاتے ہیں
میں صوفے پر رات گئے تک
اک بے وجہ سے بوجھ کی صورت گھنٹوں بیٹھی رہتی ہوں
بیٹھے بیٹھے اُونگھ آ جائے تو
تنہائی کی ٹھنڈی سل کی ٹھنڈک میں
گُھل جاتی ہوں راندر ہی اندر اک جھرنا
دردِ ہجر کا نیلا جھرنا رگوں میں بہتا رہتا ہے
آنے والی عمر کا پل پل
کُھلے ہوئے دروازے کی دہلیز کو تکتا رہتا ہے

ایوب خاور

دعا

مرے مولا!
بہت مدّت سے اپنے خواب لکھنے کا ہنر میں
بھول بیٹھا ہوں
کئی مہتاب، سورج اور ستارے ہیں
کہ جو دیوارِ جاں کے ساتھ ٹوٹے آئینوں کی
طرح سر نیوڑھائے لٹکے ہیں
کسی آئینے کے ٹکڑے میں کوئی وصل کا لمحہ سلگتا ہے
کسی میں ہجر کا زنگار، حرف و سطر کی ترتیب سے عاری
کسی ٹکڑے کی نکڑ میں
برہنہ خامشی اوندھی پڑی ہے اور کسی آئینے کے بے
وزن دروازے
کی چوکھٹ سے لگی بدنام تنہائی، خود اپنے ضبط کے
ٹکڑے چباتی
ہے، نسوں میں سُوکھے جنگل کی ہَواؤں کی طرح سے
سنسناتی ہے
ادھورے، اَن بنے زاویوں سے
دل کی دھڑکن اپنے سَم کو ڈھونڈنے کی سعیٔ لا حاصل
میں
لے کی انتہائی تیز گردش سے الجھ کر رہ گئی ہے، سم نظر آتا
نہیں، اک پل ٹھہرنے، سانس لینے، خود سے کوئی بات
کرنے، سطرِ غم کے سائے میں کچھ دیر اپنی نیند چننے کا
کوئی
موسم نظر آتا نہیں مولا!
کہیں ایسا نہ ہو
میری سماعت کھو گئی ہو
یہ بھی ہو سکتا ہے، لَے، اپنی ہی قائم کردہ قوسیں توڑ کر
بے تال ہوتے ہوتے یک جائی کی کوشش میں کسی ہم
زاد
کا پلّو پکڑتی ہو مگر پلّو پکڑنے میں نہ آتا ہو!
کہیں سَم ہاتھ میں آ آ کے گرتا ہے
کہیں لَے، تال سے ٹکرا کے گھٹتی اور بڑھتی ہے
یہی کچھ ہے
مرے اندر، مرے باہر یہی کچھ ہے
بہت دن سے کوئی شے اپنے سَم پر آ نہیں پائی
ہَوا خوشبو سے
خوشبو رنگ سے اور رنگ، پیراہن سے باہر ہے
عجب اک گردشِ ترتیب و بے ترتیب ہے
جس میں پیالہ اپنی مٹّی میں سلگتا ہے، ہتھیلی پر رکھوں تو
ٹوٹ
جاتا ہے، نظر کے آئینے میں کوئی منظر کاڑھنے سے پہلے
منظر
ٹوٹ جاتا ہے، سمندر ریت کے، اُڑ اُڑ کے چہرے پر
برستے
ہیں مگر آنکھیں چھلکتی ہیں نہ سینے میں کوئی کوندا لپکتا ہے
عجب دل ہے
عجب اک برف کی سِل ہے جو روز و شب کی چکّی میں

مسلسل پس رہی ہے، پھر بھی اپنی ذات میں سیّال
ہونے میں نہیں آتی
اگر سیّال ہو بھی جائے تو میں
اِس کی سیّالی کو کس اظہار کے سانچے میں ڈھالوں!
ربِّ حرفِ مدّعا! مجھ کو تو لگتا ہے مرا اسلوب
چوری ہو گیا ہے اور میں کارِ دگر میں ہوں
میں جس کارِ دگر کی گہری دلدل میں کھڑا خود سے الجھتا
ہوں
وہاں چاروں طرف سورج کی نقّالی ہے
ٹھنڈی چاندنی کی گرم، نیلی روشنی ہے، کیمرے ہیں
اور
کمپیوٹر ہیں، وی سی آر ہیں، کردار ہیں اور مردہ
لفظوں کی جگالی کرنے والے...... بولنے والا ہے کوئی
اور
لکھنے والا کوئی اور ہے، دن...... ایک دن میں اِس
جگہ بے انت دن، بے انت راتیں، دن میں راتیں
رات میں دن، صبح و شامِ زندگی، سب کچھ، سبھی کچھ
اُلٹا پلٹا ہے، ابھی کچھ تھا...... ابھی کچھ ہے
مکھوٹوں سے اُدھر کچھ اور ہے
پردے سے باہر اور ہے، پردے کے پیچھے اور ہے اور
ان
کے بیچوں بیچ اک گرد و غبارِ ہجر میں لپٹی ہوئی
آنکھیں ہیں، چہرا ہے، ہزیمت اور ندامت کی سیہ بُکّل
میں صحراؤں کے صحرا باندھ کر بیٹھے ہوئے، دُوری کے
ٹیلے سے پرے، کچھ خون کے رشتے ہیں اور میں ہوں
مرے دامن میں خوشبو ہے
بہت سی اَن سِلی خوشبو
جسے پیراہنِ رختِ ہنر کرنا ہے
لیکن کیا کروں مولا!
تھکن کی بوندیاں مجھ ناتواں کی زرد مٹّی میں
تسلسل سے ٹپکتی جا رہی ہیں، سَم نظر آتا نہیں
کس زاویے سے خود کو خود سے جوڑ کر دیکھوں
ابھی تو مجھ کو اپنی ان سِلی خوشبو کو سینا ہے
مجھے بھی کچھ کشیدہ کار حرفوں اور کچھ سطروں کے
ریشم کی ضرورت ہے مرے مولا!
مرے مولا!
اگر اِذنِ ہنر دے تو یہ دل
اس دل کی دھڑکن اپنے سَم پر لوٹ آئے اور یہ
جو اِک برف کی سِل ہے، جو روز و شب کی چکی میں
مسلسل پس رہی ہے پھر بھی اپنی ذات میں سیّال
ہونے میں نہیں آتی، اچانک میرے لہجے کی لپک
بن کر ٹپک جائے
مرے اندر کوئی ایسا
سخن انداز ہو جائے جو میری نظم کو شفاف
دریا کی روانی دے، مرے پیرائیہ اظہار کو
گنجِ معانی دے
بہت مدّت سے اپنے خواب لکھنے کا ہنر میں بھول بیٹھا
ہوں

ایوب خاور

ماں

ماں! ترے قدموں تلے
جب راکھ اُڑتی ہے تو سینے میں خلا جیسی کوئی شے
گونجتی ہے
میری بینائی کے حصّے میں تو اب تک صرف تیرے
چپ لبوں کا زہر آیا ہے،
مری بینائی جس نے آج تک تیرے
لہوروتے ہوئے قدموں کے نیچے راکھ دیکھی ہے
بھرے کھیتوں میں فصلیں کاٹنے والی جوانی
زرد پھولوں کی طرح سنسان آنکھوں کی کہانی
کہتے کہتے آج کس منزل پر پہنچی ہے،
مجھے اس کی خبر تو نہیں،
تیرے محبت ڈھونے والے دل نے
اپنی اجرتوں میں اپنے بیٹوں کے علاوہ کیا نہیں پایا
مجھے اس کی خبر بھی تو نہیں،
ہم خشک پتوں کو جلا کر سردیوں میں
اپنے چھوٹے چھوٹے ذہنوں کو بڑے لوگوں کے قصّے
بانٹتے تھے،
ہم کہ تیری جاگتی آنکھوں کی لَو میں خواب جیسی کوئی دنیا
دیکھتے تھے
صبح کاذب کی صدا
چکی کے پاٹوں اور تیرے ہاتھ کے چھالوں کے بیچ
اک گیت کی صورت اُترتی تھی،
وہ گیت اب کھو گیا ہے
تو بھی اب چپ ہوگئی ہے اور خلا ویسے کا ویسا ہے
ماں! مرے سینے میں تیری مامتا کا نور تو اب بھی اُترتا
ہے مگر اقرار کی ساعت ہمیشہ سے اَدھوری ہے، نہ
جانے کون سا کوہِ گراں ہے تیرے ہاتھوں میں کہ اب
تک تیرے ہاتھوں کے لیے چہرا ترستا ہے، تجھے
دیکھوں تو جی یہ چاہتا ہے، تجھ سے پوچھوں
''ماں! یہ کن روگی زمانوں کے
بھروسے پر ابھی تک جی رہی ہو،
کون سے صحراؤں میں اب تک ترے دریا روانی رو
رہے ہیں، کون سے دشت وجبل ہیں جن میں تیری عمر
کا بے رنگ سنّاٹا سفر طے کر رہا ہے اور یہ کن کم زور
دیواروں کے سائے میں تری تقدیر کی
چمپا چمیلی بجھ رہے ہیں''
ماں! یہ تُو ہے یا کوئی خیمہ طنابوں کی شکست آثار مٹھی
سے نکل کر زرد موسم کی ہَوا میں لڑکھڑاتا ہے
یہ میں ہوں یا کوئی سایہ تری ممتا کی
ٹھنڈی روشنی سے ٹوٹ کر پاتال اندر ڈوبتا جاتا ہے
ہم دونوں محبت کی گواہی کی طلب میں
اپنے اپنے دل کی جانب رُخ کیے
اپنے خدا سے پوچھتے ہیں
حشر کب تک آئے گا!

ایوب خاور

کیا نہیں ہے جو سدا رقص میں ہے
مستقل ارض و سما رقص میں ہے
رنگ سے رنگ جدا رقص میں ہے
شاخ در شاخ ہَوا رقص میں ہے
فرصتِ جنبشِ مژگاں ہے محال
کس کا دربار ہے، کیا رقص میں ہے
آئینہ خانۂ وحدت ہے کہ دل
ہر نفس شانِ خدا رقص میں ہے
بامِ دانائی سے فرشِ دل تک
مجھ میں کچھ میرے سوا رقص میں ہے
آب و گل، ابر و شرارہ، مہ و مہر
ہر کوئی اپنی جگہ رقص میں ہے
دیکھ کر ایک پرانی تصویر
یاد کی تیز ہَوا رقص میں ہے
یہ ہتھیلی ہے کہ تختِ گُل ہے
لمس در لمس حنا رقص میں ہے
جسم تو ساکت و جامد ہے مگر
یہ دلِ درد نما رقص میں ہے
کون لَے کار ہے، کس کی لَے پر
ایک زنجیر بہ پا رقص میں ہے
یہ خزاں ہے جو مرے اندر تک
زرد پتوں کی طرح رقص میں ہے
صرف دیوار و در و بام نہیں
گھر میں بچوں کی دعا رقص میں ہے
ایک اِک غنچۂ گُل موج میں ہے
باغ کی ساری فضا رقص میں ہے
اک نظر خود کو بھی تو دیکھ ذرا
تیری ایک ایک ادا رقص میں ہے
تتلیاں ہیں کہ سرِ گل خاور
رنگ در رنگ قضا رقص میں ہے

ایوب خاور

خمارِ ذات کی حدّت سے جھومتا ہوا دیکھ
دیا ہَوا کے سمندر میں تیرتا ہوا دیکھ
نظر اُٹھا سرِ آئینۂ فراق اور پھر
خزاں کا رنگ رگِ گُل میں رینگتا ہوا دیکھ
اب ایسے وقت میں میرے لیے تُو کیا کرے گا!
چل ایسا کر مری سانسوں کو ٹوٹتا ہوا دیکھ
اُڑایا تھا جسے تُو نے فلک کی سمت اے دوست!
پھر اُس غبار کو قدموں میں بیٹھتا ہوا دیکھ
پلٹ کے ایک نظر دیکھ بادباں سے اُدھر
اور اُس کی آنکھ میں کاجل کو پھیلتا ہوا دیکھ
یہ دل ہمیشہ سے آئینہ سا ہے تیرے لیے
سو خود کو عکس بہ عکس اس میں گونجتا ہوا دیکھ
شبِ ستارہ و مہتابِ نیلگوں! کسی وقت
ہمارا چاند بھی پانی سے کھیلتا ہوا دیکھ

ایوب خاور

ایک سے ایک انوکھا ستم ایجاد کیا
تُو نے ہر دل کو نئے ڈھنگ سے برباد کیا

پھر سے کچھ جمع کیے ہم نے ترے خواب، سراب
پھر اُنھیں اِس دلِ مِسمار کی بنیاد کیا

شامِ آوارگی تھی، میں بھی تھا اور میرا رقیب
دیر تک بیٹھ کے پھر ہم نے تجھے یاد کیا

اے دلِ سادہ و رنگیں تری غربت پہ نثار
''جا تجھے کشِ مکشِ دہر سے آزاد کیا''

تیرے عشّاق کے شجرے میں وہ گمنام بھی ہیں
جن کو اس شجرۂ ممنوعہ نے برباد کیا

دیکھ اس سینۂ دل پر یہ ہنر کاریٔ لمس
تُو نے تو ہر سرِ مُو خامۂ بہزاد کیا

پہلے تو دل میں مرے ضم کیا ہرغم کا وفور
زندگی! پھر اُسے تُونے میرا ہم زاد کیا

یہ نظر کا ہی تو دھوکا ہے کہ آئینے نے
مجھے شب زاد کیا اور تجھے شہ زاد کیا

کیا یہی گردشِ دوراں ہے کہ جس نے خاؔور
مجھ کو برباد کیا اور تجھے آباد کیا

ایوب خاور

چھڑائیں کس طرح پیچھا ترے غم سے
یہی تو طے نہیں ہو پائے گا ہم سے

ابھی پہلو سے نکلا تھا کہ پھر آ کر
خیالِ یار دل پر آ گرا دھم سے

تجھے دیکھیں تو کیسے؟ جانِ جاں! اب تک
یہ آنکھیں تر ہیں تیرے ہجر کے نَم سے

یہ تجھ آئینہ رو کے سامنے کیا کیا
نظر آنے لگے اغیار مبہم سے

گزرتا جارہا ہے وقت پے در پے
بچھڑتے جا رہے ہیں رنگ موسم سے

مگر وہ لوگ جن کو نیند پیاری ہے
کھلے گی آنکھ جن کی شورِ ماتم سے

کلائی تھام کر بیٹھے ہیں یادوں کی
اگر ایسے میں آجائے کوئی چھم سے

بس اک لمحے کو اپنی لَے سے ٹوٹی تھی
جھنک پائل کی جُڑپائی نہ پھر سَم سے

ایوب خاور

فقط اک کام کرنا چاہتا ہوں
بس اب آرام کرنا چاہتا ہوں

میں اک چہرے کو ان پوروں سے چھوکر
ذرا گلفام کرنا چاہتا ہوں

ادھورے، ٹوٹے پھوٹے سے ہیں کچھ خواب
جنھیں نیلام کرنا چاہتا ہوں

وہ بات اب تک جو دل کی نبض میں ہے
اُسے کچھ عام کرنا چاہتا ہوں

بہت سے ان چُھوئے، بے دام دن ہیں
میں جن کی شام کرنا چاہتا ہوں

مجھے بھی مل، میں اپنے دشمنوں میں
تمھیں بدنام کرنا چاہتا ہوں

میں اپنی زندگی کی ہر خوشی کو
تمھارے نام کرنا چاہتا ہوں

ایوب خاور

سارا آنگن خوشبو سے بھر جاتا ہے
رات گئے جب کوئی دریچہ کھلتا ہے

خواب کے جھونکے آنکھوں سے ٹکراتے ہیں
نفس نفس اک شعلہ سا لہراتا ہے

ہاتھ دعاؤں سے خالی ہوجاتے ہیں
آنکھوں میں سناٹا سا بھر جاتا ہے

سُرخ گلاب، چنبیلی اور تری خوشبو!
دھیان میں ایک انوکھے گھر کا نقشہ ہے

پیڑوں کی شاخوں میں چڑیا کھو جائے
ہَرے بھرے موسم کا نشہ ایسا ہے

پورے چاند کا جادو اُس کی آنکھوں میں
آدھی رات کا دِیا ہَوا سے کہتا ہے

خاور اُس کے لہجے کی سرگوشی بھی
برف کو جیسے کوئی آگ دِکھاتا ہے

ایوب خاور

منتظر ہیں پنگھٹوں کے راستے
پھول چہرے والیوں کے راستے

موسموں کی پیاس میں بنجر زمیں
دیکھتی ہے بارشوں کے راستے

اِن گھنی، بے چاند راتوں میں کہیں
جاگتے ہیں جگنوؤں کے راستے

جنگلوں کی خوشبوئیں،صبحوں کے رنگ
دیکھتے ہیں تتلیوں کے راستے

جن دنوں کی دھوپ نے سینچا ہمیں
کھو نہ جائیں اُن دنوں کے راستے

رات کچھ ایسی پڑی یادوں کی اوس
دُھل گئے سب منظروں کے راستے

ہر گلی میں تیری خوشبو بچھ گئی
سج گئے تنہائیوں کے راستے

ایوب خاور

زوالِ شب ہے، ستاروں کو گرد ہونا ہے
پسِ نگاہ ابھی ایک غم کو رونا ہے

اب اس کے بعد یہی کارِ عمر ہے کہ ہمیں
پلک پلک میں تری یاد کو پرونا ہے

یہی کہ سلسلۂ نارسائی ختم نہ ہو
سو جس کو پا نہ سکے ہم، اُسی کو کھونا ہے

جو لفظ کھل نہ سکیں آئینے پہ ، مٹّی ہیں
جو بات دل پہ اثر کر سکے وہ سونا ہے

تُو اس کو توڑنا چاہے تو توڑ سکتا ہے
کہ زندگی ترے ہاتھوں میں اک کھلونا ہے

بس ایک چشم سیہ بخت ہے اور اک تیرا خواب
یہ خواب، خواب نہیں اوڑھنا بچھونا ہے

سفر ہے دشت کا اور سر پہ رخت تنہائی
یہ بار بھی اِسی عمر رواں کو ڈھونا ہے

ایوب خاور

ہمیں تھے آبلہ پا، ہم ہی بزم آرا تھے
ترے فراق کی سب منزلوں میں تنہا تھے

گزر کے آئی ہیں جن مرحلوں سے یہ آنکھیں
وہ سب مقام ترے ہجر کا تماشا تھے

گلہ کریں بھی تو کس سے کہ تُو بھی جانتا ہے
اُتر گئے جو رگِ جاں میں، کیسے دریا تھے

بچھڑتے وقت یہ کیا ہو گیا تھا آنکھوں کو
کہ ہم تو تجھ سے فقط نام کے شناسا تھے

صدا بھی دے نہ سکے ڈوبتے ستاروں کو
ہزار رنج طبیعت میں کار فرما تھے

پھر اک مسافت گریہ کا سامنا تھا ہمیں
جلے چراغ تو پھر انجمن میں تنہا تھے

ایوب خاور

کچھ خواب جو نیند کی جان دکھائی دیے
ٹوٹے تو تری پہچان دکھائی دیے
جل تھل تھی لہو سے گلاب نظر سرِ شام
جب دھول چھٹی تو مکان دکھائی دیے
اے حرفِ دعا! مرے سچّے حرفِ دعا
کیوں اجر کے دن سنسان دکھائی دیے
موسم بدلا تو ہَواؤں کے ہاتھ میں بھی
جو پھول تھے تیر کمان دکھائی دیے
جو میرے لیے سب کچھ تھے وہی اک دن
بے آب و گیہہ میدان دکھائی دیے
یہ اس کی نظر کا کمال تھا یا کوئی وہم
سپنے تتلی کی اُڑان دکھائی دیے
تھک ہار کے جب دریا اُترے تو وہاں
اک شہرِ وفا کے نشان دکھائی دیے
جب نہرِ فرات کو ہوش آیا تو اُسے
نیزوں پہ چڑھے قرآن دکھائی دیے
خاور اب کس سے کہوں کہ مجھے اک روز
اُس آنکھ میں دونوں جہان دکھائی دیے

ایوب خاور

گھر سے نکلے، تری راہ گزر کے ہوئے
ہم لوگ تو بس اِسی ایک سفر کے ہوئے

پھر اپنی خاک بھی شہرِ ہَوا کی ہوئی
جب رنج مرے کسی دوسرے گھر کے ہوئے

یہ باغ، بغیچے، رنگ محل اُس کے
صحرا و سراب اِس دیدۂ تر کے ہوئے

اک چھاؤں نے میری نیند سے خواب چنے
وہ خواب بھی پھر اُسی چھاؤں، شجر کے ہوئے

پہلے پتواریں ٹوٹ گریں سرِ آب
پھر لشکرِ جاں کے علم بھی بھنور کے ہوئے

پاتال کے اندر بھی ہیں سو پاتال
یہ راز تو وا پانی میں اُتر کے ہوئے

تم اپنی ذات میں شرمندہ ہو تو کیا
رسوا ہم بھی تو محبت کر کے ہوئے

اب اُن کا سمٹنا سہل نہیں خاور!
وہ رنگ کہ جو تصویر بکھر کے ہوئے

ایوب خاور

ایک نظم

شہزادی!
اِک روز کہیں
تیرے روپ کی سوہنی کیاری میں
میرے جادوگر ہونٹوں کا فسوں کئی لاکھ گلاب کھلا دے گا
مرے عشق چراغ کی لَو تجھ میں
سو طرح کے دِیپ جلا دے گی
مرے لمس کا صد رنگا ریشم
تری رگ رگ میں
کئی کھربوں چم چم کرتے ہوئے ایسے جو
جگنو دہکا دے گا
جو بند ہیں میری اور تری آنکھوں کے راز دریچوں میں
جو پھوٹ رہے ہیں تیرے لمس کی خوشبو سے
جو چھوٹ رہے ہیں
میرے خواب کی مٹھی سے

ایوب خاور

In the Absence of God

تمہیں نے تو یہ کہا تھا مجھ سے
مجھے بھی اس بات پر یقیں تھا
تمھارا دل بھی اِسی سبک راز کا امیں تھا
کہا تھا تم نے کہ
وہ ہمیشہ ہمارے مابین
سانس لیتا ہے
دیکھتا بھی ہے
سنتا بھی ہے
وہی گواہ ہے
ہمارے ہر وعدۂ وفا کا وہی گواہ ہے
ہماری ہر بات
اور ہر لفظ
اور ہر لمس
اور نظر کے ہر ایک لحظے کا وہ گواہ ہے
قریب ہو ہو کے دور ہونے
خموشیوں کی زباں میں دل اور روح کی
بے انتہائیوں تک کو پار کرنے
لپٹ کے رونے
سسک سسک کر بدن کے ہر ہر مسام تک
میں ہماری وحشت کا راز داں ہے
مگر مجھے اب پتا چلا ہے
کہ جس خدا کو گواہ کر کے، تمھاری آنکھوں نے
ہم کو اس رشتۂ مقدس میں باندھ رکھا تھا وہ تو پچھلے کئی
برس سے طویل چھٹی پہ ہے، کسی اور ہی زمانے
میں رہ رہا ہے
تمھارا ذاتی خدا تمھیں خود بتا گیا تھا
کہ کچھ دنوں میں یہاں نہیں ہوں
میں کچھ برس کے لیے کسی اور ہی زمانے
میں جا رہا ہوں
میں چھٹیوں پر ہوں
تم کسی کو بھی
جس کو دل چاہے اُس کو سادہ ورق کے مانند پھاڑ ڈالو
جسے بھی چاہو اُجاڑ ڈالو
تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا
سوا اپنے ذاتی خدا کی ان دو برس کی Absence میں
یہ تم نے جو مرے دل اور روح تک کو نچوڑ کر
بے حسی کی زنگ ساز جالیوں میں بہا دیا ہے
بتاؤ اب اس کا کیا کرو گے!
میں کیا کروں گا!
جو کارِ دنیا اور اس محبت کی بے ثباتی کے درمیاں
ایک گیلے صحرا میں دھنس گیا ہوں،
مرے مساموں کی خالی قبروں میں میرے خوابوں کی
ریت چپ چاپ دانہ دانہ اُتر رہی ہے
یہی بتا دو!
یہ خالی پنجر لیے لیے اور کہاں کہاں، کون کون
لمحوں سے اپنے بے رخت و بے ثمر سانس کے

لیے میں تمھارے عکسوں کے کانچ مانگوں!
یہی بتادو
یہی بتادو!
خدا جب اپنی طویل چھٹی سے واپس آئے گا
اس کو میرے وجود کے بے اماں مساموں کے کون سے
گوشۂ لحد میں اماں ملے گی، ہر اک لحد میں تو میرے
ذلت گزیدہ اور سر بریدہ خوابوں کی
زردکائی جمی ہوئی ہے
ارے مری جاں!
یہی بتادو!
طویل مدت کی چھٹیوں سے پلٹنے والے، تھکے ہوئے
اُس خدا کو میں کیا جواب دوں گا!

In the Presence of God

خدا اور اس کا یوں چھٹی پہ جانا!
کس قدر یہ لغو اور کتنا یہ بیہودہ تصور ہے
اور پھر ذاتی خدا!
کس کا!
جسے تُو چاہتا ہے اور تجھے ملتا نہیں!
صرف اس کی خاطر
تیری کم ہمت محبت نے، خدا کے چھٹیوں پر
یوں چلے جانے کا یہ بودا تصور
تیرے دل کے گوشت میں پیوست کر ڈالا
ارے بھائی
خدا انسان کے کچے کسیلے گوشت میں
کب سانس لیتا ہے
وہ تو ہر انسان کی ہر ہر رگِ جاں میں دھڑکتا ہے
یہ تُو ہے
جس کی کم ہمت محبت
وسوسوں اور کارِ دنیا کے جھمیلوں میں الجھ کر
تجھ کو ایسے ہشت پہلو راستے تک کھینچ لائی ہے
جہاں تُو ریزہ ریزہ ہو رہا ہے
جہاں تیری نظر کے زاویوں میں ٹیڑھا پن سا آ گیا ہے
اور اس ٹیڑھے پنے میں،
تیری کم ہمت محبت، لالٹینوں میں
لگائے جانے والے گھٹیا شیشوں کی طرح سے ٹوٹ کر
بے عکس ٹکڑوں کی طرح،
اس ہشت پہلو راستے کی دلدلی
مٹی کا حصہ بن رہی ہے
تری آنکھوں کی دونوں پتلیوں میں
موتیے کی تہہ جمی ہے
ایسا کر
سب سے پہلے جا، کسی درویش کی کٹیا میں جا کر
اس کے پاؤں پڑ
صبر مانگ
عشق کی سچائی مانگ
اور اگر مل جائے تو پھر اس کی دھیمی آنچ پر یہ موتیا پگھلا
نظر آنے لگے تو یہ سمجھ
(جس کے بارے میں جو تُو یہ کہہ رہا ہے ''دو برس کی

چھٹیوں پر ہے'')
اس نے تجھ کو اور تیرے جہل کو بھی کر دیا ہے در گزر
اور اگر ایسا نہ ہو پائے
تو پھر بدقسمتی کی کالی گٹھڑی اپنے اندر سے اُٹھا
اور دھوبیوں کے گھاٹ پر جا
صابن اور سوڈا ملے پانی کے جیسے آنسوؤں میں
اپنے دل اور روح کی میلی چکٹ خلعت بھگو
عجز کی سل پر پٹخ
اس کو نچوڑ اور پھر پٹخ
اور پھر پٹختا جا...... نچوڑے جا......
پٹختا جا...... نچوڑے جا
یہاں تک کہ
پھر اس خلعت کے اصلی رنگ جھلکیں
اور چمکیں...... تیرے، مٹی سے بھرے سینے کے
اندر سے نکلتے نقرئی سورج کی کرنوں سے
اُسے پھر گیان کی رسّی پہ ڈال
بیٹھ جا پھر عجز کی سِل پر
دعا کر
بس دعا کرتا چلا جا
ساری دنیا کے اُن انسانوں کی خاطر
جن کی کم ہمت محبت
وسوسوں اور کارِ دنیا کے جھمیلوں میں الجھ کر
اُن کو ایسے ہشت پہلو راستے تک کھینچ لاتی ہے
جہاں آنکھوں کی دونوں پتلیاں اور
موتیا اک دوسرے کو بھینچ لیتے ہیں

ایوب خاور

کچھ اور ہو بھی تو رائیگاں ہے

ہوائیں بھی
بادباں بھی میرے
سمندروں کے سکوت میں
بے لباس صدیوں کے ریزہ ریزہ جمال کے سب

نشاں بھی میرے
مرے شکستہ وجود کی لڑکھڑاتی عجلت پہ
گرنے والی شفیق شبنم میں ریت کے آسماں بھی میرے
قدیم نظموں کے غم میں بے حال منظروں کے
جہاں بھی میرے، ستارۂ دل کی وسعتوں میں
گھنے گھنے جنگلوں کے اسرار...... واہمے بھی
گماں بھی میرے
گلاب چہروں پہ
زرد آنکھوں کے رت جگوں میں
نجاتِ غم کی شکستہ خواہش کی راکھ بھی اور بجھے ہوئے
کارواں بھی میرے
جو کھو گئے
اور جو آنے والے دنوں کا دکھ ہے
وہی مرے بے وجود چہرے، ستارۂ دل کا
پاسباں ہے
کچھ اور ہو بھی تو رائیگاں ہے

ایوب خاور

انتظار

[اپنے ہم زاد کے لیے]

جانے کب اُس کھڑکی میں اک صبحِ سبز کی آنکھ کھلے
اور کنجِ خواب سے باہر آ کر وصل کا پھول کھلے
اُس آنچل میں خوشبو ٹانکے
اُن آنکھوں کے پیچھے چھپ کر رنگ لباس اُتاریں
اُن ہونٹوں کے خواب کنارے چھو کر بات بنا لیں
جانے کب، کس وقت، صبا کی زنجیریں کھل جائیں
اک خوشبو کی بارش ہو تو آئینے دُھل جائیں

اندیشہ

تم کہتے ہو
نظم لکھو
اور اپنی اس اک بات کو خاورؔ
مصرعوں میں زنجیر کرو
میں کہتا ہوں
درد میں لپٹی
سوگ میں ڈوبی
روگ کی روگی اس اک بات کے کتنے معنی نکلیں گے
کیا تم نے یہ سوچا ہے؟

ایوب خاور

گریہ

[فیض صاحب کے لیے]

فیض صاحب!
یہ کیا کہ اپنے لیے
دمِ رخصت سرِ دیارِ لحد
اک عددان سِلی قبا کے سوا
آپ نے کچھ نہ انتخاب کیا
ہم بھی تھے/اور ہماری آنکھیں بھی
آنسوؤں میں گندھی ہوئی آنکھیں
ہم بھی تھے
اور ہماری سانسیں بھی
ہچکیوں سے بندھی ہوئی سانسیں
ہم بھی تھے/اور یہ لبِ اظہار
لبِ اظہار پر کھلی سرسوں
ماتمی دل بھی اور اس دل کے
آئینہ خانۂ ملال میں تھے
کتنے موسم صفِ چراغ میں تھے
مگر اک شمعِ تعزیت کے سوا
آپ نے کچھ نہ انتخاب کیا
اب جو یہ باقیاتِ گریہ ہیں
کس کی آنکھیں بہم کریں گی اِنھیں!
کس کی پلکیں رقم کریں گی اِنھیں!

کتاب گھر

کتاب میلہ تعارف: حیدر قریشی

پرواز (شاعری) **شاعر: عزیز الرحمن سلفی**

صفحات:184 **قیمت**:120 **روپے** **ناشر**: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی

جناب عزیز الرحمٰن سلفی کا شعری مجموعہ ان کی زندگی بھر کی شعری کمائی ہے۔اس میں عزیز الرحمٰن سلفی صاحب کی زندگی کی ساری چہل پہل اور دکھ درد یکجا ہو کر دکھائی دیتے ہیں۔مسجد و مکتب سے اپنے گہرے تعلق کے باعث ان کی شاعری میں حمد و نعت کی ایک قابلِ ذکر تعداد ہونا ہی تھی۔تاہم ان کی شاعری کے اس حصہ میں حرمین شریفین سے لے کر ہند کی مساجد و مدارس تک کے حوالے سے بھی منظومات مل جاتی ہیں۔شاہ فیصل اور شاہ فہد کے حوالے سے ان کی نظموں کو دیکھ کر ان کے مسلک و فکری میلان کا آسانی سے اندازہ ہو جاتا ہے۔

عزیز الرحمٰن سلفی صاحب کی کتاب کے دوسرے حصہ میں اردو کے حوالے سے اور قومی و ملی نوعیت کی شاعری شامل ہے۔اپنے قریبی عزیزوں، دوستوں کی شادی کی تقریبات پر وہ فراخدلی سے اپنے خوشی سے لبریز نیک جذبات کا اظہار کرتے ہیں تو بعض وفیات پر اپنے دکھ اور درد کا بھی برملا اظہار کر دیتے ہیں۔

کتاب کا تیسرا اور ایک اہم حصہ ان کی ان قلبی کیفیات کا آئینہ دار ہے جو غزل کی روایت سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔اس حصہ میں رباعیات اور نظموں کو بھی پیش کیا گیا ہے تاہم سلفی صاحب کا بنیادی مزاج غزل ہی کا ہے۔عزیز الرحمٰن سلفی صاحب غزل کی قدیم روایت کے امین ہیں۔اساتذہ کے بعد کے ادوار کی شاعری کی ہلکی ہلکی پرچھائیاں تو ان کے ہاں مل جاتی ہیں تاہم ان کا مزاج کلاسیکی روایت سے ہی زیادہ استفادہ کرتا ہے۔بظاہر وہ قدیم و جدید کے زمانی دوراہے پر کھڑے ہیں لیکن ان کا واضح جھکاؤ قدیم کی طرف ہے۔یہ سب کچھ ان کے مزاج اور ان کی فطرت کا نتیجہ ہے۔

مجموعی طور پر عزیز الرحمٰن سلفی صاحب کی شاعری ان کی ذاتی زندگی کا عکس ہے۔وہ زندگی جس میں خدا اور رسولؐ سے لے کر عام زندگی میں ملنے جلنے والے نمایاں کردار اور حالات و واقعات اور جذبات و کیفیات اپنی اپنی اہمیت کے مطابق موجود ہیں۔ایک بزرگ و محترم شاعر کی زندگی بھر کی اس شعری کمائی کو یکجا پیش کیے جانے پر اور کتابی صورت میں شائع کیے جانے پر میں اپنی دلی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے، اس مجموعہ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

بالا دست (افسانے) **افسانہ نگار: نوشابہ خاتون**

صفحات: 160 **قیمت**:150 **روپے** **ناشر**: دثالث پبلیکیشنز۔شاہ کالونی۔مونگیر

نوشابہ خاتون کے افسانوں کا مجموعہ ''بالا دست'' اپنے موضوعات کے لحاظ سے میرے لیے خاصی دلچسپی کا موجب بنا ہے۔کچی عمروں کے نیک پاک احساسات سے لے کر رومانوی جذبات تک پھیلی ہوئی جو کہانیاں ہیں ان میں ایک خاص نوع کی اور خواتین سے مخصوص رومانی کیفیت تو ملنا ہی تھی۔تاہم نوشابہ خاتون نے ان موضوعات سے آگے بڑھ کر کئی اہم سماجی و اخلاقی مسائل پر بھی اپنے انداز میں بات کی ہے۔انہوں نے جھونپڑی کے باسیوں کی زندگی بھی قریب سے دکھائی ہے اور حویلیوں کے اندر بھی جھانکا ہے۔گھریلو زندگیوں میں آنے والے اتار چڑھاؤ اور دکھ کی حالت میں امید کا دامن تھام کر آگے بڑھنا، ان کی کہانیوں کا خاصہ ہے۔تاہم کہیں کہیں ان کی کہانیوں کا کوئی کردار اپنے دکھ سے ہار کر خودکشی بھی کر جاتا ہے۔عملی زندگی میں بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے۔اس لحاظ سے نوشابہ خاتون کی کہانیاں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی بھی کرتی ہیں اور ایک مثالی زندگی کا احساس بھی دلاتی ہیں۔

سماجی مسائل میں نوجوان بیوہ کی شادی اور اس سے متعلق دنیا والوں کی باتیں نوشابہ نے اچھے پیرائے میں بیان کی ہیں۔یہاں اخلاقی مسائل سے بچنے کی احسن صورت ہے تو ایک اور طرف نانا جان کی نوجوان لڑکی سے شادی کے نتیجہ میں ''دور کے رشتہ میں نواسے'' کے ساتھ اخلاقی مسئلہ کو بھی بڑی دلیری کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔

امارت اور غربت کے بڑھتے ہوئے فرق کو بھی نوشابہ خاتون نے اپنے انداز سے دیکھا اور دکھایا ہے۔غریبوں کے باہمی تنازعات کی اس وقت آخری حد آجاتی ہے جب دو گداگر بھیک مانگنے کے لیے زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر قبضہ کرنے کے لیے گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ایک گداگر اپنی بیٹی کو جہیز میں دینے کے لیے بھیک مانگنے کا اڈہ دینا چاہتا ہے تاکہ پھر وہاں اس کا داماد اپنا بھیک مانگنے کا کاروبار جاری رکھ سکے۔ہے نا مزے کی بات! تو نوشابہ خاتون کی کہانیوں میں ایسی مزے مزے کی باتیں بھی موجود ہیں۔

کچے پکے جذبات و احساسات اور رومانوی دنیا سے گزرتے ہوئے نوشابہ خاتون نے عملی زندگی کے مختلف النوع حقائق کو اپنے اظہار کا موضوع بنایا ہے۔اس ایک مجموعے میں ان کی افسانہ نگاری کے سفر کا یہ مرحلہ پورا ہو گیا ہے۔

نوشابہ خاتون کے اس مجموعہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے میں اس امید کا اظہار کرتا ہوں کہ ادبی دنیا میں ان کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔اور یقین رکھتا ہوں کہ ان کا اگلا افسانوی مجموعہ اپنے اظہار کی پختگی کے ساتھ زندگی کے مزید موضوعات کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہوگا۔موضوعات کے حوالے سے مجھے کوئی مشورہ نہیں دینا کہ اس کے چناؤ میں نوشابہ خاتون بذاتِ خود نہ صرف بہتر صلاحیت رکھتی ہیں بلکہ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہیں۔میں ان کی ادبی کامیابیوں کے دعا گو ہوں!

کسک(ناول) **ناول نگار: آر ۔کے ۔نیازی**

صفحات: **قیمت:** **ناشر:** مثال پبلشرز ۔رحیم سنٹر، پریس مارکیٹ ۔فیصل آباد

محترمہ آر کے نیازی گورنمنٹ کالج برائے خواتین میانوالی میں اردو پڑھاتی ہیں۔تاہم اردو سے ان کی وابستگی محض پروفیشنل سطح تک نہیں ہے۔انہوں نے اردو کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بھی بنایا ہے۔''کسک''ان کے تخلیقی اظہار کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔

عنیزہ کا کردار پختون علاقہ کی بے شمار مجبور لڑکیوں کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔اس کی کہانی دراصل کئی ایسی لڑکیوں کی کہانی ہے جو اپنے ماحول کی گھٹن میں سانس لینے پر مجبور ہیں اور جب گھٹن بہت بڑھ جاتی ہے تو ان کا دَم گھٹ جاتا ہے۔عنیزہ ایک طرف اپنے قبیلے کی شان کا بھرم رکھتی ہے، دوسری طرف اپنی محبت کو اپنے دل میں زندہ رکھتی ہے اور تیسری طرف اپنے پیار کرنے والے شوہر اور گھر کی عزت کو مجروح نہیں ہونے دیتی۔لیکن ان سارے تضادات سے لڑتے لڑتے وہ اپنی زندگی کی بازی ہار جاتی ہے۔حقیقتاً وہ کسی ریاکاری کا ارتکاب نہیں کرتی۔اپنے قبیلے، خاندان اور ماحول کے جبر کو اپنے دنیاوی احترام کے ساتھ قبول کرتی ہے، لیکن اپنے اندر کی کشمکش کے باعث خود ہی اس احساس سے دوچار ہو جاتی ہے کہ جیسے اس نے ریاکاری کی ہے۔اور پھر اس الزام کے جواب میں خود کلامی کی صورت میں عنیزہ کے یہ دلائل اپنی جگہ ایک تلخ سماجی حقیقت کے سامنے آئینہ بن جاتے ہیں۔

''میری ریاکاری کے اسباب معلوم ہیں تمہیں ؟؟؟؟ میں بتاتی ہوں ۔۔۔۔کہیں مفتیوں کے فتوے، کہیں خانوں کی پگیں، کہیں ملکوں کی شان، کہیں سیدوں کی سیادت ۔۔۔۔۔کہیں جبر، کہیں تشدد، کہیں موت کا خوف اور کہیں رشتوں کی کھلے عام بلیک میلنگ، ساری عمر کے لئے ناطہ توڑ لینے کی دھمکیاں ۔۔۔۔میری ریاکاری تو تمہیں نظر آرہی ہے۔میری دیوانگی کا تو تم ہنس ہنس کا مذاق اڑا رہے ہو۔لیکن اس دیوانگی کے اسباب پر کبھی غور کیا ہے؟اس کے سدباب کے لئے کچھ سوچا؟ کچھ کیا؟''

اس ناول میں آر کے نیازی صاحبہ نے دو مردوں میں بٹی ہوئی محبت کے کچے جذبوں کو پختہ زبان میں بیان کیا ہے۔جذبات کے کچے پن، اور الفاظ کی پختگی نے اس ناول کو ایک دلچسپ انداز عطا کر دیا ہے۔سماجی جبر کے سامنے عورت کی مظلومیت کی المناک داستان ہونے کے باعث اسے خانہ داری کے امور میں بہت زیادہ مصروف گھریلو خواتین اور کالج کے طلبہ تو دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے ہی، تاہم اس ناول کو سنجیدہ اور پختہ عمر کے لوگ بھی یکساں دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے۔محبت کی داستان اتنی پرانی ہے جتنی آدم اور حوا کی داستان، اور یہ قصہ اتنا ہی تازہ ہے جتنا آج کی کسی بھی سچی محبت کا کوئی قصہ تازہ ہوسکتا ہے۔دراصل ہر داستان میں اپنی مقامیت کے باعث اور اپنی اپنی نفسیات کے باعث ایک انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے جو اس اجتماعی روداد کے اجتماعی کردار کے باوجود اس میں ایک انفرادی اور نفسی واردات پیدا کر دیتی ہے۔آر کے نیازی نے اپنے معاشرے کے گھٹے ہوئے ماحول میں محبت کی ایسی ہی نئی داستان اس ناول میں پیش کی ہے۔ناول کے مرکزی کردار عنیزہ کی داستان مکمل ہونے پر قاری اس کے لیے گہری ہمدردی اور محبت کے جذبات محسوس کرنے لگتا ہے۔(**ناول میں بطور پیش لفظ شامل**)

اُس گلی میں(افسانے) **افسانہ نگار: سید علی محسن**

صفحات: 120 **قیمت:** 120روپے **ناشر:** ہم خیال پبلشرز، فیصل آباد، لاہور

سید علی محسن نوجوان افسانہ نگار ہیں۔''اُس گلی میں''ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے، جس میں گیارہ افسانے شامل ہیں۔ان افسانوں میں زندگی کے نشیب وفراز کئی صورتیں بدلتے ہوئے قاری پر منکشف ہوتے ہیں۔سید علی محسن کو ایک کامیاب داستان گو کی طرح اپنی بات جاری رکھنے اور قاری کی دلچسپی کو قائم رکھنے کا ہنر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جہاں انہوں نے غیر ضروری طور پر علامتی کہانی (اُس پار) بُننے کی کوشش کی، کامیاب نہیں ہوئے لیکن جہاں انہوں نے اپنے فطری بہاؤ میں کہانیاں پیش کیں وہاں سیدھے بیانیہ میں بھی ایک مجموعی علامتی تاثر نمایاں ہوتا چلا گیا۔اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں سید علی محسن کے اسی فطری بہاؤ کی کہانیاں ہیں۔''بند مٹھی میں خواب''جنوبی ایشیا سے مغربی دنیا میں پیسہ کمانے کے لیے آنے والوں کی کمال کی کہانی ہے۔کہانی میں متضاد سیاسی رنگوں کو ابھارے بغیر محبت بھرے انسانی رشتوں اور ان رشتوں سے منسلک جذبات ونفسیات کی جو کہانی سید علی محسن نے بیان کی ہے، مجھے مغربی دنیا میں اقامت پذیر اردو کے افسانہ نگاروں میں اس موضوع سے متعلق اس معیار کی کہانی کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔''اُس گلی میں''سید محسن علی کی بحیثیت افسانہ نگار ایک شناخت قائم کرتا ہے اور ان کے آئندہ امکانات کی طرف واضح اشارہ بھی کرتا ہے۔

کھانی کوئی سناؤ، متاشا(ناول) **ناول نگار: صادقہ نواب سحرؔ**

صفحات:224 **قیمت:**175 **روپے** **ناشر:** ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۔وکیل سٹریٹ، دہلی ۔٦

صادقہ نواب سحر کا یہ ناول اپنی کہانی اور کردار نگاری کے لحاظ سے بہت عمدہ ہے۔پھیلاؤ کے باوجود کہانی پر ناول نگار کی گرفت اور جملہ کرداروں کی نفسیات کا خیال رکھنا ناول نگار کے خصوصی امتیاز قرار دیئے جاسکتے ہیں۔متاشا کا کردار جو ناول کا مرکزی کردار ہے بیک وقت کئی متضاد صفات اور تجربات کا حامل ہے۔تضادات کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اس کے نتیجہ میں یہ متاشا کی شخصیت کے تنوع کو ابھارتے ہیں۔زندگی کے تلخ وشیریں حالات وواقعات اور دکھوں اور خوشیوں سے لبریز نشیب وفراز سے گزرتی ہوئی متاشا کی کہانی قاری کو اپنے سحر میں گرفتار رکھتی ہے۔تاہم ناول کے اسلوب پر اردو سے زیادہ ہندی فکشن کا اثر دکھائی دیتا ہے بلکہ بعض جگہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے یہ ہندی میں لکھا ہوا ناول ہے جسے صرف اردو اسکرپٹ میں پیش کیا گیا ہے۔صادقہ نواب سحر کی ایک خوبی جس کی نشان دہی ضروری ہے کہ نسائی ادب کی طرف جھکاؤ رکھنے کے باوجود اور ایک عورت کی دکھ بھری داستان بیان کرنے کے باوجود انہوں نے اپنے ناول کو کسی خاص فریم میں بند نہیں ہونے دیا۔کسی ایک طبقہ کو برا بھلا کہنے کی بجائے زندگی میں کیا برا بھلا پیش آرہا ہے، اس پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔مجموعی طور پر یہ بہت اچھا ناول ہے۔

منشا یاد (اسلام آباد)

جھاڑیاں اور جگنو

اکبر حمیدی شاعر اور خاکہ نگار کے طور پر بھی اپنی تخلیقی صلاحیت اور حیثیت منوا چکے ہیں اور انشائیہ نگاری میں بھی وہ صف اول کے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے انشائیوں کے دو مجموعے ''جزیرے کا سفر'' اور ''تتلی کے تعاقب میں'' شائع ہو چکے ہیں اور ادبی پارکھوں سے تحسین پا چکے ہیں۔ ''جھاڑیاں اور جگنو'' ان کا تیسرا مجموعہ ہے۔

اکبر حمیدی انشائیے کی فنی اور تکنیکی ضرورتوں اور اس کے مزاج سے بخوبی آگاہ ہیں۔ میرے خیال میں ایک عمدہ انشائیے کی اولین خوبی یا ضرورت اس کی عمدہ نثر ہے۔ انشائیہ نگار محض کسی خیال یا بات کا سادہ زبان میں اظہار و بیان نہیں کرتا اسے ادبی نفاست اور تخلیقی خوشبو بھی عطا کرتا ہے اور جس طرح سمندر قطروں سے مل کر سمندر بنتا ہے اسی طرح کوئی فن پارہ لفظوں اور جملوں سے وجود میں آتا ہے۔ اس لیے بنیادی طور پر انشائیہ نگار کو شاعر اور افسانہ نگار کی طرح لفظوں کے بہترین استعمال کا سلیقہ ہونا چاہیے اور انشائیہ تو ایک بھی ڈھیلے ڈھالے جملے بلکہ کسی ایک لفظ کے بے محل استعمال کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ذرا سی کوتاہی غفلت یا تن آسانی مخمل میں ٹاٹ کا پیوند ثابت ہو سکتی ہے۔ اکبر حمیدی لفظ آشنا ہے اور خوبصورت تخلیقی جملہ لکھنے پر قادر۔ چنانچہ اس کی نثر زندہ رواں دواں اور تکلف و تصنع سے پاک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے انشائیے دل میں اترتے اور اس کے جملے قلب و نظر کو روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی سا بھی موضوع ہو اس کی نثر کہیں سپاٹ یا بے رنگ نہیں ہونے پاتی۔ اپنی ادبی اور تخلیقی شان برقرار رکھتی ہے۔ ضرورت اور موقع کے مطابق وہ بیانیہ، علامتی یا استعاراتی تمثیلی لہجہ اور اسلوب اختیار کر لیتے ہیں جیسے ''نئی اور پرانی گاڑیاں'' میں وہ جسم کو گاڑی قرار دے کر زندگی اور اس کے پیچ در پیچ سارے سفر کو تا گاڑی ہی کے حوالے یا استعارے میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں جس سے تحریر میں دلکشی اور دوہری معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔

''خاندان، معاشرے، ملک اور قو میں بھی ایسی گاڑیاں ہیں جو لمحہ بہ لمحہ حالِ دل بیان کر رہی ہیں۔ پڑھے لکھے معاشروں کے لوگ ان کی زبان سمجھ لیتے ہیں اور حادثہ پیش آنے سے قبل ہی گاڑی کے نقائص دور کر لیتے ہیں جب کہ ان پڑھ اور نیم خواندہ لوگ اس زبان کو نہ سمجھ سکنے کے باعث حادثوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔''

اسی طرح اونچی ناک، باورچی خانہ، جامن کا پیڑ اور ریلوے پھاٹک محض سامنے کی چیزیں نہیں رہتیں۔ اپنے لغوی معنی سے اوپر اٹھ کر تمثیل اور علامت کا روپ دھار لیتی ہیں اور وسیع تر معنی اور مفاہیم کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ ناک شخصی اور قومی تفاخر، حمیت اور خودی و خودداری کے دروبست کھولتی چلی جاتی ہے اور باورچی خانہ زندگی کی رنگا رنگ اشیائے خورد و نوش کے حوالے سے تفہیم کراتا ہے۔

''زندگی بھی مجھے ایک ایسا ہی باورچی خانہ دکھائی دیتی ہے۔'' ''جامن کا پیڑ'' جو مصنف کے گھر کے صحن میں موجود ہے اور پھل نہیں دیتا ہے۔ اس کو کاٹ دینے کی بحث ہو رہی ہے۔ دیکھیے مصنف ہمیں کس نتیجے پر لے جاتا ہے۔

''کیا پھل صرف وہی ہو سکتا ہے جس سے ہم پیٹ بھر سکیں؟ کیا اس کے سرسبز و شاداب پتے پھل نہیں ہیں؟۔ کیا اس کا خنک سایہ پھل نہیں ہے؟ کیا دل میں پھول کھلانے والی خوشبو پھل نہیں ہے اور کیا وہ حسن و زیبائش پھل نہیں ہے جو جامن کا پیڑ ہمیں فراوانی سے دے رہا ہے۔''

''ریلوے پھاٹک'' اکبر حمیدی کے بہترین انشائیوں میں شمار ہوتا ہے۔ مصنف کو بچپن میں جب وہ گاؤں میں رہتا تھا کئی میل دُور واقع ریلوے پھاٹک پر جا کر ریل گاڑی دیکھنے کا شوق تھا۔ پھاٹک کے اس پار شہر کی چمڑہ منڈی تھی جس کی بدبو دُور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس طرف گندم یا چاول کی لہلہاتی فصلیں، اکا دُکا آہستہ خرام بیل گاڑیاں اور پرندوں کی چہکار۔ پھاٹک کے اس پار دُھول اُڑاتا شور مچاتا شہر۔ ریل گاڑی جس کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔ یہ دیہاتی بچہ صرف اسے گزرتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہے۔ اس میں سوار ہونے یا شہر میں داخل ہونے کی خواہش نہیں رکھتا۔ ریلوے پھاٹ دراصل دو تہذیبوں کا سنگم ہے۔ پہلی اسے عزیز ہے کہ وہ خود اس کا حصہ ہے اور اسے فطرت کے قریب تر محسوس کرتا ہے۔ دوسری تہذیب کا تعلق شہر صنعت اور مشین سے ہے جسے وہ دیکھنا ضرور چاہتا ہے مگر اس کا حصہ بننا پسند نہیں کرتا اور اب کہ اسے شہر میں رہتے کئی برس گزر گئے ہیں تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ:۔

''جیسے اب بھی میں شہر سے ادھر ریلوے پھاٹک پر کھڑا ہوں دُھول اڑاتی دوڑتی دھاڑتی گاڑیاں میری آنکھوں میں کنکر مٹی اُچھالتی میرے سامنے سے گزرتی چلی جا رہی ہیں۔ سارا منظر وہی ہے۔ سب کچھ وہی۔ بس اتنا سا فرق ہے کہ اب یہ گاڑیاں میرے اندر سے گزر رہی ہیں اور ریلوے پھاٹک میرے باہر ہے''۔

دراصل پھاٹک کے اس طرف یا اُس طرف ہونا دو رویے ہیں۔ اور اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ اب پھاٹک کس طرف ہے............ اصل مسئلہ تو رویے کا ہے آپ ادھر رہ کر بھی فطرت کو اپنے قریب محسوس کر سکتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں انشائیے میں عنوانات افسانے کے برعکس زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اگر رکھتے بھی ہیں تو اکبر حمیدی کے انشائیوں میں ان کی حیثیت اور اہمیت ثانوی ہے۔ عنوان یا موضوع تو دراصل بات شروع کرنے کا

بہانہ ہے۔اور باتوں کا ان کے پاس انبوہ ہے۔مگر اکبر حمیدی کو اس انبوہ سے کام کی باتیں چن کر ایک فن پارے کے روپ میں پیش کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔

اکبر حمیدی کے انشائیے دراصل اس کی اپنی باتیں ہیں جو اس پر گزریں،اس نے سنیں، سہیں،سوچیں یا اسے سوجھیں۔یہ اس کی اپنی باتیں ہیں مگر ایسی کہ پڑھنے والے کو بھی اپنی لگیں۔میٹھی رسیلی باتیں۔بات سے بات نکلتی ہے۔مگر نکلتی ہی نہیں چلی جاتی ہے۔مضمون نگاری کے برعکس جس میں ہر پہلو اور مخفی گوشے کو کھنگالا اور اس کا تجزیہ کیا جاتا ہے کسی لطیف نکتے کی دریافت کے ساتھ ہی اپنا چھوٹا سا تخلیقی دائرہ مکمل کر لیتی اور ختم ہو جاتی ہے۔

''دراصل انسانی ذہن کے لیے توازن ایک ایسی بیماری ہے جو کبھی اسے غیر معمولی درجے تک نہیں بیٹھنے دیتی۔غیر معمولی مقام پر تو ایسے ذہن فائز ہوتے ہیں جو توازن کی بیماری کا شکار نہیں ہوتے بلکہ عدم توازن کا جوہر دکھاتے ہوئے بہت غیر معمولی باتیں سوچتے ہیں۔غیر معمولی خیالات تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔معمولی ذہنوں کو یہ باتیں بہت عجیب لگتی ہیں حالانکہ عجیب تو وہ ذہن ہیں جو ساری زندگی کوئی عجیب بات نہیں سوچ سکتے۔

''روشنی کا غبارہ'' یا اس قسم کے معقولوں ایسے خوبصورت جملے جن سے اس کے انشائیے لبالب ہیں۔ بیک وقت دماغ کے ساتھ ساتھ دل کو بھی موہ لیتے ہیں اور یادداشت کا حصہ بن جاتے ہیں۔

''ماضی تو ماں کی طرح ہوتا ہے جب چاہیں اس کی آغوش میں سر رکھ کر سو جائیں۔''

''جتنے ڈالر کا بارو عراق پر گرایا گیا تھا اگر امریکہ اتنے ڈالر عراق کو نقد دے دیتا تو وہ کویت پر قبضہ بڑی خوشی سے چھوڑ دیتا۔''

''رفاقت کہیں نہ کہیں ختم ہو جاتی ہے باقی سفر تو اکیلے ہی طے کرنا پڑتا ہے۔خواہ کتنا بڑا ہجوم ہمراہ ہو۔''

''باتوں کو سوچنا اور سوچتے رہنا اکثر مفید ثابت ہوتا ہے۔''

''خدا نے مجھے انسان پیدا کیا تھا اور میرا خیال ہے واپسی پر وہ مجھ سے صرف یہی پوچھے گا کہ میں انسان رہا ہوں کہ نہیں۔''

''سورج بنانے والے نے سورج کا دیا اپنی حیثیت کے مطابق بنایا ہے کہ جتنا بڑا وہ خود ہے اتنا ہی بڑا اس کا گھر اور دیا۔''

''میرا خیال ہے ہر دس سال بعد فرد کی زندگی کا منظر نامہ تبدیل ہو جاتا ہے۔''

''ترجیح تو باسکٹ بال کی گیند ہے جو ہمیں اس لیے دی جاتی ہے کہ ہم اسے آگے دوسروں کی طرف بڑھا دیں۔گیند کو اپنے ہاتھوں میں روکے رکھنا فاؤل ہے۔''

''جھاڑیاں میرا ماضی ہیں۔جگنو مستقبل اور حال میں خود ہوں۔''

اکبر حمیدی خیر اور حُسن کا سفیر ہے۔کوئی شخص ایسی زندگی کا تصور نہیں کر سکتا جس میں اول سے آخر تک

خیر ہی خیر ہو لیکن برے یا برا محسوس ہونے والے لوگوں، رویوں اور خیالات سے دل برداشتہ ہونے اور خود کو اذیت و کوفت میں مبتلا کرنا کسی طرح صحت مند رویہ نہیں۔ چنانچہ اکبر حمیدی منفی باتوں اور رویوں کے مثبت پہلو دریات کرتا اور انہیں اور زندگی کو قابل برداشت بنانے کی سعی کرتا ہے۔

''خدا کے فضل سے میں ایک بگڑا ہوا بچہ ہوں............ یہ بگڑا ہوا بچہ ہر انسان کے اندر موجود ہوتا ہے مگر اکثر پسماندہ معاشروں اور پابند تہذیبوں میں خوف ترغیب تعلیم تہذیب تربیت اور اخلاقی قدروں کے بے پناہ دباؤ کے ذریعے اس بچے کو قتل کر دیا جاتا ہے۔تب معاشرہ خود غرض اور منافق کرداروں تلے دب جاتا ہے اور ننگا بادشاہ شہر بھر سے اپنی جامہ زیبی کی داد وصول کرتا رہتا ہے۔

اکبر حمیدی کا اسلوب دوستانہ ہے اس کی سوچ روشن اور سائنٹیفک ہے۔اس کا مشاہدہ لسبیط اور تجربہ شہری اور دیہی زندگی پر محیط ہے۔ پڑھتے ہوئے ذہن میں کھلبلی سی مچی رہتی ہے۔اس کا نظریۂ حیات زندگی کو ارفع سطح پر دیکھنے کی آرزومندی ہے۔ اس نے ہر قسم کے خیالات کے لیے دروازے کھلے رکھے ہیں۔ یادوں کے حوالے سے ساری یادوں کو اندر آنے دیتے ہیں وہ الگ بات ہے بعض کو کرسی بعض کو کھری چارپائی اور بعض کو صوفے پر بٹھاتے ہیں۔ان کے پہلے دو مجموعوں میں بھی ایسے انشائیے فراوانی سے شامل تھے جن کو ہم پرنسپل ایسے کہتے ہیں۔زیر نظر مجموعے میں ان کی تعداد اور زیادہ ہے۔یعنی ایسے انشائیے جن کا مواد یا خمیر اپنی ذاتی زندگی اور احوال سے لیا گیا ہے۔یوں زندگی کے معاملات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ مصنف کی سوانح کے بارے میں بھی دلچسپ اور مفید معلومات فراہم ہوتی جاتی ہیں۔

موضوعات کی رنگا رنگی اور تنوع اظہار و اسلوب کی دلکشی، نکتہ آفرینی، بصیرت افروزی اور گہری معنویت اور سب سے بڑھ کر زیریں سطح پر شگفتگی اکبر حمیدی کے انشائیوں کو کامیاب اور بڑا بناتی ہیں اور انہیں ایک معقول اور صف اول کا انشائیہ نگار اگر آپ خورد و نوش کی لطافتوں سے آگاہ ہیں تو آپ نے یقیناً روح کیوڑہ کی خوشبو سے مہکتا، برف کی کرچیوں کا قلفے کی ملائی میں گھلا ملا، شیرینی میں ڈوبا دودھیا سطح پر تیرتی تخم ملنگاں والا فالودہ ضرور کھایا یا پیا ہوگا۔نازکی دیکھیے کہ کھانے کی چیز ہے جسے پی بھی سکتے ہیں۔لیکن کیا آپ نے کبھی فالودہ بنتے بھی دیکھا ہے۔میں نے ایک بار دیکھا تھا۔چاولوں کے آٹے کی گاڑھی گاڑھی پی کو ایک چھلنی سے گزار کر ٹھنڈے پانی کے مٹکے میں ڈالتے جاتے تھے اور بھدے گرم قوام سے لمبی لمبی اجلی اور نرم نرم سویاں بنتی اور تہہ نشین ہوتی جاتی تھیں۔ مجھے اکبر حمیدی کی انشائیہ نگاری فالودہ بننے کے عمل اور اس کا مطالعہ فالودہ نوش کرنے کے مصداق لگتے ہیں۔وہ زندگی معاشرت مشاہدہ تحریر علم فلسفہ سائنس اور آرٹ کو ملا کر ایک قوام تیار کرتے ہیں۔پھر اس ملغوبے کو فن کی چھلنی سے گزارتے اور ادب کے مٹکے میں ڈال دیتے ہیں۔ پڑھتے وقت آپ کو فالودہ پینے کی لذات اور شیرینی کا احساس ہوتا اور روح کیوڑہ کی مہک آتی رہتی ہے۔

پروفیسر سحر انصاری (کراچی)

''نوبیل ادبیات'' پر ایک نظر

میرا خیال ہے دُنیا میں ہر تعلیم یافتہ فرد الفریڈ نوبیل کے نام سے واقف ہے۔ نوبیل کا پورا نام الفریڈ برنہارڈ نوبیل (1833-1896) تھا۔ ان کا تعلق سویڈن سے تھا اور انھوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی سے اپنی دل چسپی کے نتیجے میں ڈائنامائٹ اور دیگر آتش گیر آلات ایجاد کیے۔ ان کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ کوہ کنی اور ارض شکنی میں سخت جاں فشانی کرنے والوں کے لیے سہولت مہیا کی جائے لیکن قابیل کی اولاد جس نے پتھر کو بھی مہلک ہتھیار بنالیا تھا، کہاں باز آتی ہے؟ ڈائنامائٹ کو تخریب کاری اور جنگ آزمائی میں استعمال کیا جانے لگا۔ نوبیل کو اپنی ایجاد کی بے وقعتی اور غلط استعمال پر شدید ملال ہوا۔ چناں چہ انھوں نے یہ وصیت کی کہ ان کے مالی اثاثوں کا فائدہ اُن اہلِ دانش کو پہنچے جنھوں نے انسان کی فلاح و بہبود کے کسی شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہوں۔

10 / دسمبر 1896ء کو نوبیل کا انتقال ہوا۔ اُن کے مرنے کے بعد یہ طے پایا کہ چھ شعبوں (1) فعلیات یا طب، (2) طبیعیات، (3) ادب، (4) کیمیا، (5) امن اور (6) معاشیات میں کوئی اہم کارنامہ سر انجام دینے والی شخصیت کو ایک خطیر رقم کے ساتھ طلائی تمغا دیا جائے۔ یہ انعام نوبیل کے نام سے موسوم ہے۔ نوبیل انعامات کا اجرا 1901ء میں ہوا۔

سویڈش اکیڈمی آف سائنس (اسٹاک ہوم) ہر سال 10 / دسمبر کو نوبیل کی برسی کے موقعے پر ان انعامات کا اعلان کرتی ہے۔ نوبیل انعام کی بڑی وقعت ہے۔ نوبیل انعام یافتگان کو انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ دیگر شعبوں کے مقابلے میں ادب کے ضمن میں دیے جانے والے نوبیل انعام کا چرچا کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے کئی بار یہ شوشہ چھوڑا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو نوبیل انعام سیاسی وجوہ کے تحت دیا گیا ہے۔ بعض نوبیل انعام یافتگان نے تو انعام واپس بھی کیے ہیں۔ ان میں بورس پاسترنک اور ژاں پال سارتر جیسے ادیب بھی شامل ہیں۔

نوبیل انعام کی تقریب شان دار طریقے سے منعقد کی جاتی ہے۔ اس موقعے پر انعام یافتہ شخصیت کو ایک خطبہ بھی پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ خطبہ عموماً خیالات، اسلوب اور لفظ و بیان کا شاہ کار ہوتا ہے۔

اردو کے معروف شاعر اور ادیب باقر نقوی جو کئی کتابوں کے مصنف ہیں، نے یہ سوچا کہ ان خطبات کا اردو

میں ترجمہ ہونا چاہیے۔ باقر نقوی صاحب اس سے قبل ''مصنوعی ذہانت'' اور ''ای ایف یو ایک تحریک'' جیسی کتابیں اردو دُنیا کو پیش کر چکے تھے۔ ان کی شاعری کا رنگ و آہنگ بھی جدا ہے۔ اُن کا یہ شعر تو عہدِ نو کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے:

نہ جانے کون سا کس وقت کام آجائے　　　سو ایک جیب میں بُت ایک میں خدا رکھنا

باقر نقوی مہذب، شائستہ، ملنسار اور خوش اخلاق انسان ہیں۔ وہ اپنے فرائضِ منصبی کے ساتھ ساتھ ایسے گوشے تلاش کرتے رہتے ہیں جو انسانی معاشرے میں روشنی اور آگہی کے فروغ کا سبب بنیں۔ ان کی شاعری اور تخلیقی مصروفیت تو ان کے لیے لازمۂ حیات ہے ہی، لیکن ترجمے سے بھی انھیں خاص شغف ہے۔ ہمارے یہاں ترجمے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی، حالاں کہ بسا اوقات ترجمہ تخلیق سے زیادہ مشکل اور محنت طلب ہوتا ہے۔ ادبیاتِ عالم کی تاریخ میں تراجم کے بعض ایسے ادوار گزرے ہیں جن کے بغیر ادب اور زبان، علوم و فنون کی ترقی شاید اس معیار کی نہ ہوتی جو تراجم کے بعد ممکن ہوئی۔

ترجمے کی اہمیت کے پیشِ نظر بعض بین الاقوامی ادارے ترجمے پر کانفرنسیں اور سیمینار منعقد کرتے ہیں۔ ان میں یونیسکو ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ چوں کہ اس وقت تذکرہ نوبیل ادبیات کا ہے اس لیے یہ امر باعثِ دل چسپی ہوگا کہ خود نوبیل فاؤنڈیشن اپنے نوبیل سمپوزیم فنڈ کے ذریعے تراجم کے باب میں سمپوزیم منعقد کرتی اور اس کی روداد، کارروائی کی تفصیل کے ساتھ ان میں پیش کیے جانے والے مقالات بھی کتابی شکل میں شائع کرتی ہے۔ اس ضمن میں سویڈش اکیڈمی بھرپور تعاون کرتی ہے۔ ان اجتماعات میں علومِ انسانی، فنونِ لطیفہ اور سائنس کے موضوعات بہ طورِ خاص زیرِ بحث آتے ہیں۔ ترجمے کی زبان، اصطلاحات اور زبان و ذہن کے تعلق پر عالمانہ افکار و خیالات اجاگر کیے جاتے ہیں۔ باقر نقوی کا یہ سارا شغف Labour of Love کے سوا اور کچھ نہیں۔ انھوں نے کئی علمی، سائنسی اور ادبی متون کے کامیاب ترجمے کیے ہیں۔ ان کا کوئی منصوبہ کمرشل نوعیت کا نہیں ہوتا۔ انھوں نے یہ طے کیا کہ بیسویں صدی میں ادب کا نوبیل انعام پانے والوں کے نوبیل خطبات کا ترجمہ کیا جائے۔ یہ خیال بجائے خود نہایت اہم لیکن جاں کاہ تھا۔ مجھ سمیت کئی دوستوں نے باقر نقوی کے اس خیال کو نہ صرف سراہا بلکہ مسلسل اصرار کرتے رہے کہ اس منصوبے کو مکمل کر کے ہی دم لیں۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند　کے مصداق باقر نقوی نے گویا میر تقی میر کی زبان میں مسئلہ حل کر دیا:

سب پہ جس بار نے گرانی کی　　　اس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

باقر نقوی اپنے جثّے میں ناتواں دکھائی دیتے ہوں گے لیکن عزم و ارادہ اور ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے وہ ہرگز ناتواں نہیں۔ میں باقر نقوی کی اس کاوش کو صمیمِ قلب سے کیوں سراہ رہا ہوں؟ اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مجھے معلوم ہے کہ یہ خطبات بہت غور و فکر کے بعد دنیا کے بڑے ذہنوں نے عطا کیے ہیں۔ ان کا اسلوب، ان کی فکر اور

موضوعات کو ادبی لوازم کے ساتھ اردو زبان میں منتقل کر دینا آسان کام نہیں۔ اس سے قبل اس نوعیت کے بعض تراجم میری نظر سے گزرے ہیں۔ مجھے افسوس ہوا کہ مترجمین نے صحافیانہ انداز میں جیسے خبروں کا ترجمہ کرتے ہیں، ان کے ساتھ مکمل انصاف نہیں کیا۔ باقر نقوی نے اردو زبان کے کلچر کو برتتے ہوئے ان خطبات کی ادبی شان کو برقرار رکھا ہے۔ یہی ان کا کارنامہ ہے۔

باقر نقوی نے نثر کے ساتھ ساتھ نوبیل خطبات میں شامل شاعری کے بھی منظوم تراجم کیے ہیں جو بلاشبہ قابلِ ستائش ہیں۔ میں نے اس رُخ پر توجہ دینے کے بعد باقر صاحب سے گزارش کی ہے کہ عالمی سطح کے شعرا کا ایک انتخاب اپنے منظوم تراجم کے ساتھ شائع کریں گویا: پھر ''انھیں'' دے دیا گیا ایک دیا بجھا ہوا

نوبیل ادبی خطبات کا ایک اور زاویہ اس طرح بھی اجاگر ہوتا ہے کہ انعام پانے والے ادیب اور شاعر کسی ایک زبان یا ایک ملک اور ثقافت سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان میں اگر ایک طرف اناتول فرانس اور جارج برنرڈ شا ہیں تو دوسری طرف رابندر ناتھ ٹیگور اور ٹونی مورسین ہیں۔ گویا پورا گلوب اپنے اپنے دانش ور کی گواہی کے لیے موجود ہے۔ جرمنی کے گنتر گراس نے داستان گوئی اور قصّہ نگاری کو تاریخ کے تناظر میں دیکھا اور پیش کیا ہے۔ داریوفو کا خطبہ کیسے ڈرامائی انداز میں شروع ہوتا ہے:

''اگرچہ میرے ہاتھ میں کوئی جام نہیں پھر بھی میں عالی مرتبت ملکہ کرسٹینا کی یاد میں، جو ماضی میں آپ کی ملکہ تھیں، جام نوش کرنا چاہتا ہوں''۔

ونسٹن چرچل، ٹامس مان، ہنری برگساں، ٹی ایس ایلیٹ، ڈیرک والکاٹ، رڈیارڈ کپلنگ کے خطبات اپنا ایک جداگانہ فکری اور ادبی رُخ رکھتے ہیں۔ ناڈین گوڈیمر نے اپنے ہم وطن شاعر کے چند مصرعے اپنے خطبے میں درج کیے تھے ان کا خوب صورت ترجمہ باقر نقوی نے یوں کیا ہے:

ہم ادب کے متوالے
زندگی کی وادی سے سر نکال کر گویا
سامنے کے چہروں کو دیکھتی نگاہوں کو
صفحہ صفحہ پڑھتے ہیں، جھانک جھانک پڑھتے ہیں
اور یہ ہنر ہم نے
بار بار جی کر ہی زندگی سے سیکھا ہے

سلواتورے کازمیدو نے اپنے خطبے میں بعض نہایت بلیغ نکات بیان کیے ہیں جن پر غور و فکر اور مکالمے کی گنجائش ہے۔ وہ کہتے ہیں: ''آفاقیت کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے نہ تھا، ایک انسان دوسرے انسان کے لیے اس کا اضافہ کرتا ہے''۔

بودلیئر نے ''بدی کے پھول'' کو علامت بنایا۔ وان گو نے مصوری میں تصورِ حسن کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔ کازمیدو بھی شاعری کے باب میں ایک انوکھا نقطۂ نظر رکھتے ہیں:

''میرے نزدیک حسن صرف مطابقت یا ہم آہنگی میں ہی نہیں بلکہ ناہمواری اور بے ڈھنگے پن میں بھی ہوتا ہے اس لیے کہ کبھی کبھی ناہمواری بھی درست شعری پیکر کا روپ بھر لیتی ہے''۔

تمام نوبیل خطبات یہ اور اس طرح کے متعدد فکر انگیز مسائل سے معمور ہیں۔ ان کے مطالعے سے ہماری نئی نسل خصوصیت کے ساتھ نقد و نظر کے نئے زاویے تلاش کر سکتی ہے۔ یہ چراغ اس قدر روشن ہیں کہ ان سے متعدد ذہنوں میں اُجالے کی بنیادیں استوار کی جا سکتی ہیں۔

نوبیل ادبیات کی نسبت سے ایک اور پہلو پر بھی مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ اور وہ ہے نوبیل ادیبوں کے کوائف کی فراہمی۔ باقر نقوی نے جس کتاب یا کتابوں سے یہ خطبات منتخب کیے ہیں ان میں یہ کوائف شامل نہیں تھے۔ یہ ایک مکمل ریسرچ کا کام تھا جو باقر نقوی نے بڑی محنت توجہ اور دیدہ ریزی سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ گویا معلومات کو ریزہ ریزہ جمع کر کے ایک شکل دینے کا مرحلہ تھا جس سے باقر نقوی بہ حسن و خوبی گزرے ہیں۔

باقر نقوی کی شخصیت کا ایک رُخ اُن کی ادبی دیانت داری ہے۔ عزیز حامد مدنی کے بعد یہ دوسری مثال میرے سامنے ہے جنھوں نے متعلقہ ادارے سے اجازت حاصل کر کے ان تراجم کی اشاعت ممکن بنائی۔ اس ضمن میں باقر صاحب کو بھی مدنی صاحب کی طرح بے شمار مسائل اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ایک صحت مند روایت کو اپنانے کی خاطر وہ اس منزل سے بھی سلامت روی کے ساتھ آگے بڑھ گئے۔ اردو ادب کے سرمایے میں باقر نقوی نے کیسا اہم، معیاری اور دل کش اضافہ کیا ہے۔

۸۷۷ صفحات پر پھیلی ہوئی یہ دلچسپ کتاب اکادمی بازیافت، اردو بازار، کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

''کائنات کو بے نقاب کرنے کے لیے تا حال انسان نے تین تجربے کئے ہیں۔ منطقی تجربہ، عارفانہ تجربہ اور جمالیاتی تجربہ۔ ایک تجربہ عقل و خرد سے عبارت ہے۔ دوسرا معرفتِ ذات سے اور تیسرا تخلیقی عمل سے۔ اس آخری تجربے کے امکانات سے ابھی انسان پوری طرح آگاہ نہیں ہے۔ اسے ابھی اس بات کا کماحقہ احساس نہیں ہے کہ جمالیاتی تجربہ میں عارفانہ تجربہ کی isness کا رنگ بھی ہے اور منطقی تجربے کے thatness کا بھی۔ مگر یہ ان کا آمیزہ نہیں ہے بلکہ ایک اپنا الگ وجود رکھتا ہے، جس کا کام isness کو thatness میں اس طرح متشکل کرنا ہے کہ بات ''جاننے'' اور ''کھولنے'' سے آگے بڑھ کر ''تخلیق کرنے'' کے مدار میں آجائے۔''

(**ڈاکٹر وزیر آغا۔ اوراق** شمارہ جنوری، فروری ۱۹۹۷ء کے اداریہ **پہلا ورق** سے اقتباس)

ڈاکٹر نذر خلیق (راولپنڈی)

اقبال۔فکر و عمل پر ایک نظر

پروفیسر فتح محمد ملک کی کتاب ''اقبال۔فکر و عمل، پر ایک نظر'' اقبالی تنقید میں ایک اہم کتاب ہے۔اس کا اولین ایڈیشن جون ۱۹۸۵ء میں ۱۱۰۰ کی تعداد میں شائع ہوا اور ہاتھوں ہاتھ بک گیا اس کتاب میں چھ(۶) مقالے اور دو(۲) ضمیمے شامل ہیں۔ پروفیسر فتح محمد ملک اردو تنقید و تحقیق میں ایک معتبر حوالہ ہیں۔فتح محمد ملک اپنی بات استدلال اور بنیادی مآخذ کے ساتھ کرتے ہیں۔اس کتاب میں فتح محمد ملک نے اقبال کی تفہیم کے لیے دلائل واستدلال کا سہارا لیا ہے۔کتاب میں شامل مضمون ''مجموعہ اضداد یا دانائے راز'' ایک اہم مضمون ہے جس میں پروفیسر فتح محمد ملک نے ان ترقی پسند ناقدین کو جواب دیا ہے۔ جو اقبال پر ایجڈ پسندی ،تنگ نظری اور تعصب کا الزام لگاتے ہیں۔ان ترقی پسند ناقدین میں مجنوں گورکھ پوری ، اختر حسین رائے پوری ،علی سردار جعفری، ممتاز حسین وغیرہ شامل ہیں۔

پروفیسر فتح محمد ملک لکھتے ہیں۔

''یہ اعتراضات اقبال کے فنی اور فکری مسلک سے زیادہ اقبال کے سیاسی مسلک اور عملی سیاسی جدو جہد کے خلاف ردعمل سے پھوٹے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے ترقی پسندوں نے جس استدلال کے سہارے اقبال کی آفاقیت کی نفی کی ہے۔بالکل اسی استدلال کے ساتھ اقبال کی عظمت کا اثبات کرتے ہیں۔ چنانچہ نکولائی آئی کیف نے اقبال کے فلسفہ خودی پر اپنے تازہ مقالہ میں لکھتے ہیں۔

''ان ترقی پسندوں اور نام نہاد ترقی پسندوں کو ہدف تنقید بنایا ہے۔جو اقبال کے فکر و فن پر صرف اس وجہ سے رجعت پسندی اور قدآمت پرستی کا الزام دھرتے ہیں۔کہ اقبال نے بقول ان کے صرف مسلمانوں سے خطاب کیا ہے۔ اور ان نظریات ،استدلال اور مشرقی بے داری کے تصورات قرآن سے پھوٹے ہیں۔''

نکولائی آئی کیف کے نزدیک بہ حیثیت فلسفی اقبال کی عظمت کا راز انسان کے ازلی، ابدی مسائل کو تجرید اور ماورائیت کی دھند سے نکال کر اپنے ماحول اور اپنے عہد کے سیاق وسباق میں سمجھنے اور اپنی قومی نشاۃ ثانیہ کے تقاضوں کی روشنی میں بیان کرنے میں مضمر ہے۔'' ص۶،۷

پروفیسر فتح محمد ملک نے بجا کہا ہے کہ ترقی پسند اقبال کے فنی اور فکری پہلو کی طرف توجہ نہیں دیتے اور نہ ہی حال کے اظہار کے اسلوب پر توجہ دیتے ہیں بلکہ اپنے سیاسی نظریے کی عینک سے دیکھتے ہیں۔حالانکہ خود ان کے اس نظریے کو مسترد کر دیا گیا ہے۔اور بجا کہا ہے کہ اقبال انسان کے ازلی، ابدی اور آفاقی مسائل کو عصر حاضر کے تناظر میں بیان کرتا ہے۔ جو قرآن اور اسلام کے آفاقی بیانات کی روشنی میں کرتے ہیں اقبال کے نزدیک مسلمان ہی انسانی مسلک کا حامل ہوسکتا ہے۔کیونکہ اسلام خود ایک انسانی آفاقی اور روئے زمین پر بسنے والے تمام لوگوں کا نہ صرف مذہب ہے بلکہ دین بھی ہے۔

اقبال نے ملائیت، برہمنیت اور ملوکیت کو مسترد کیا ہے۔کیونکہ یہ شخصیت کے وہ روپ ہیں جو انسانیت میں تفریق پیدا کرتے ہیں حالانکہ ملائیت، برہمنیت اور ملوکیت کی جڑیں برصغیر پاک و ہند میں گہری رہی ہیں۔اقبال مثالیت سے زیادہ حقیقت پر یقین رکھتا ہے۔اقبال کا مسلک انسانیت ہے لیکن افسوس کہ ترقی پسند نقادوں نے اقبال کے متعلق غلط فہمیوں کو ہی ابھارا۔مثلاً ممتاز حسین کے حوالے سے پروفیسر فتح محمد ملک نے ایک اقتباس درج کیا ہے۔

''کوئی بھی شاعر کسی مذہبی یا سیاسی تحریک کی بنا پر اور بالخصوص ایک ایسی مذہبی تحریک کی بنیاد پر جس کا ماضی بھی رہا ہو اور جس نے سینکڑوں قوموں سے ٹکر لی ہو جس کے دشمن اور رقیب بھی ہوں آفاقی شاعر نہیں ہوسکتا۔اقبال نے ایک ایسے مرد مومن کے کردار کو جنم دیا ہے۔ جو ایک مخصوص شریعت کا پابند ہے۔آج دنیا سے مذہبی مشن کا زمانہ اٹھ چکا ہے اور یہ خیال کرنا کہ ہم کسی مذہبی نظام فکر کے ماتحت پوری دنیا کو متحد کر سکتے ہیں۔ایک فعل عبث۔'' ص۶

پروفیسر فتح محمد ملک نے ممتاز حسین کی کتاب نقدِ حیات سے جو اقتباس منتخب کیا ہے اس سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نقادوں کا ایک مخصوص طبقہ غور و فکر کرنے کی بجائے محض اقبال شکنی پر کمر بستہ رہا ہے۔ ورنہ اقبال کا مرد مومن ایسا مومن تھا جو بے شک اسلامی شریعت کا پابند تھا مگر اس کے عملی فوائد عالم انسانیت کے لیے تھے اور یہ کہ مذہبی نظام فکر کو رد کر کے کبھی بھی انسانی فوائد حاصل نہیں کیے جا سکتے ۔ابتدا سے ہی مختلف اقوام کے درمیان کشمکش بھی ایک حقیقت رہی ہے۔قوموں سے ٹکر لینا کسی قوم کو محدود نہیں کر سکتا۔اقبال کے نظریات کو جس انداز سے غلط زاویے سے پیش کیا گیا ہے اس کے لیے پروفیسر فتح محمد ملک کی کتاب اقبال فکر و عمل ایک اہم کتاب ہے اسی کتاب میں دوسرا مقالہ اثبات نبوت اور تصور پاکستان بھی ایک اہم مقالہ ہے۔جس میں اقبال نے واضح کیا ہے کہ اثبات نبوت سے ہی تصور پاکستان پھوٹا اسی کتاب ،اسی کتاب میں تیسرا مقالہ اقبال اور سرزمین پاکستان ، چوتھا مقالہ پاکستان اور مشکلاتِ لا الہ پانچواں مقالہ اقبال اور ہماری ثقافتی تشکیل نو ، چھٹا مقالہ اقبال اور ہماری تشکیل نو اہم ترین اور تفہیم اقبال میں ممد و معاون ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ان مقالات کی روشنی میں پروفیسر فتح محمد ملک نے نہ صرف یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان مسلمانوں کا ملک ہے بلکہ اس کی تخلیق ثقافتی تشکیل نو اور ادبی تشکیل نو

کے لیے ہوئی ہے۔اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

''پروفیسر فتح محمد ملک نے ان مضامین میں عالمگیر انسانیت کے تصور وطنیت اور اسلامیت حقیقی اسلام اور مروجہ تصور اسلام کے تضادات دین محمد اور دین ملوک جمیعت اسلامی سے جمعیت انسانی تک کے سفر اور زمین سے اقبال کی عدم وابستگی کے الزامات کو بھی موضوع بنایا ہے۔اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اقبال کے نزدیک اسلام میں نہ شہنشائیت ہے نہ ملوکیت ، نہ جاگیرداری ہے اور نہ ہی سرمایہ داری کہ یہ سب نظام اسلام کی بنیادی تعلیمات کے خلاف ہیں۔'' ص ی

اپنی کتاب کے سلسلے میں پروفیسر فتح محمد ملک ابتدائیہ میں لکھتے ہیں۔

''ہم نے علم وعمل کی دنیا میں فکر اقبال سے تخلیقی اکتساب کی بجائے شعوری انحراف کی راہ اپنا رکھی ہے۔۔۔۔ یہ مضامین اقبال کی تفہیم کے ساتھ ساتھ ہماری عصری زندگی کی تنقید بھی ہیں۔'' ص ا

پروفیسر فتح محمد ملک کی کتاب فکر وعمل پڑھنے اور سمجھنے کے لائق ہے اس کتاب پر تبصرہ کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ آج بھی اقبال کی تفہیم کے لیے اس کتاب سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔

لا الٰہ الااللہ

خودی کا سرِّ نہاں لاالٰہ الااللہ — خودی ہے تیغ فساں لاالٰہ الااللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے — صنم کدہ ہے جہاں لاالٰہ الااللہ
کیاہے تونے متاعِ غرور کا سودا — فریبِ سود و زیاں لاالٰہ الااللہ
یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند — بتان وہم و گماں لاالٰہ الااللہ
خرد ہوئی ہے زمان ومکاں کی زناری — نہ ہے زماں، نہ مکاں، لاالٰہ الااللہ
یہ نغمہ فصلِ گل ولالہ کانہیں پابند — بہار ہو کہ خزاں لاالٰہ الااللہ

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں ، لاالٰہ الااللہ

(علامہ اقبال)

ڈاکٹر حامد اشرف (انڈیا)

سپنوں کا میلہ

چاہتوں کے امین: امین بابر کے ماہیے

جس طرح انسانی زندگی تجربات وحوادث کی رہ گزر پر پل پل رنگ بدلتی ہے' اسی طرح شعروادب کا خمیر بھی تغیرات وتبدیلات کی مٹی سے گوندھا گیا ہے۔یہی سبب ہے کہ شعراء وادباء نے بدلتے دور کے تقاضوں کے تحت نثر ونظم میں ہیئتی اور موضوعاتی تجربے کیے۔نتیجے میں انگریزی' ہندی' اطالوی' فرانسیسی' جاپانی اور پنجابی اصنافِ سخن سے اردو شاعری کا دامن بھر گیا اور بتدریج 'تھا جو ناخوب وہی خوب ہوا' کے مصداق نظمِ معریٰ' آزاد نظم' نثری نظم' سانیٹ' ترائیلے' آزاد غزل' نثری غزل' غزلیہ' موشح نما غزل' ہائیکو' ثلاثی یا تثلیث' کہہ مکرنی' تروینی' تکونی' دوہا' چھلا' چھے بولے' اور ماہیا نگاری جیسی شعری اصناف آسمانِ ادب پر روشن ہوئیں۔جن میں نظمِ معرّیٰ اور نظمِ آزاد کے بعد سب سے زیادہ مقبول صنف سخن 'ماہیا' ثابت ہوئی۔ماہیا پنجابی ادب بالخصوص لوک ادب کی مقبول صنف ہے' جس میں تین مصرعے ہوتے ہیں۔بعد میں صحیح وزن کے طور پر ایک سبب (دوحرف) کم کر کے پونے تین مصرعوں کو ماہیے کے لیے مختص کر دیا گیا۔

امین بابر کے ماہیوں کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس فنّی تخلیق کا محرک اُن کے وہ افکار وتجربات ہیں' جن میں عصری شعور اور حسّی آگہی کا ادراک پنہاں ہے۔جس کے سبب حیلہ جو زندگی' بہانہ ساز زمانے اور مطلب پرست احباب کے سلوک پر وہ مجروح ہو جاتے ہیں اور اپنے ماہیوں کے ذریعے معاشرے کی افسوسناک کوتاہیوں پر غور کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

شکوہ نہ شکایت ہے
روگ جدائی کا
اپنوں کی عنایت ہے

پہچان کو بدلا ہے
وقت کی گردش نے
انسان کو بدلا ہے

گو چاند سے مکھڑے ہیں
دل میں مگر اُن کے
کتنے ہی دکھڑے ہیں

سادہ وسلیس اندازِ بیان' الفاظ کی نرم جذباتی سطح' خود کلامی کی دل میں اُتر جانے والی کیفیت اور عاشق ومعشوق کی معاملہ بندی کے امتزاج سے امین بابر نے اپنے ماہیوں کا منظر نامہ ترتیب دیا ہے۔جس میں ہمہ رنگی' ہمہ جہتی اور ہمہ گیری کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔جس کا اندازہ درجِ ذیل ماہیوں سے بخوبی ہوتا ہے۔

دل ایسا پرندہ ہے
پیار کی خوشبو سے
جو آج بھی زندہ ہے

دُکھ اُس نے اٹھایا ہے
آس کے پنچھی کو
جس نے بھی اُڑایا ہے

شب خون وہ مارے ہے
اپنی شبیہہ میری
آنکھوں میں اُتارے ہے

اُسلوب نکھارا جائے
تیری شباہت کو
کاغذ پہ اُتارا جائے

ملنے کو ترستا ہے
یاد کا ساون جب
اس دل پہ برستا ہے

جینے کا سہارا ہے
تیری رفاقت میں
جو وقت گزارا ہے

امین بابر کے ماہیے کہیں کہیں شعری روایات کی پاسداری کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔تاہم بیشتر ماہیوں میں پیش کردہ اُن کے تجربات اُنہیں صاحبِ بصیرت ثابت کرتے ہیں اور اُن کے تجربات ہمارے تجربے میں شریک ہو کر تاثر و تاثیر کی نئی جہتیں روشن کرتے ہیں۔بطورِ مثال چند ماہیے پیش ہیں۔

ہر سمت اُجالا ہے
اچھا رویہ بھی
نفرت کا ازالہ ہے

نفرت کو مٹائیں ہم
دیپ محبت کے
ہر دل میں جلائیں ہم

من پنچھی چہکتا ہے
پھول محبت کا
جس وقت مہکتا ہے

اردو شعر و ادب میں تقریباً ایک صدی سے نئے اسالیب اور نئی ہیئتوں کی تلاش جاری ہے۔جدتِ اُسلوب اور تازہ کاریٔ خیال نے ماہیے کو وجود بخشا ہے۔پونے تین مصرعوں کی اس صنفِ سخن میں اختصار کے باوجود پیکر تراشی اور خیال کی مکمل پیش کشی کو اہمیت حاصل ہے۔امین بابر کے ماہیے بھی انہی اوصاف کی ترجمانی کرتے ہیں۔

کچھ عین جوانی میں
مرتے دیکھے ہیں
کردار کہانی میں

شعلہ یا جوالہ ہے
روپ ترا سجنی
چاہت کا حوالہ ہے

جو دل کے اندر ہے
لامتناہی سا
اک درد سمندر ہے

عید کی خوشی کسے نہیں ہوتی۔اپنوں سے ملاقات کسے نہیں بھاتی۔عید اصل میں اپنے چاہنے والوں کی دید کا نام ہے۔چاہت کی ڈور سے بندھے بندھن ہجر میں دھوپ اور وصال میں چاندنی بن جاتے ہیں۔امین بابر کے جذبوں کی زبان بھی یہی کہتی ہے۔

اک آہ و زاری ہے
تیرے بنا ساجن
کیا عید ہماری ہے

پھر عید نہیں ہوگی
چاند سے مکھڑے کی
جب دید نہیں ہوگی

کیا خوب سماں ہوگا
عید کے موقع پر
جب تو بھی یہاں ہوگا

پروفیسر آر کے نیازی (میانوالی)

نعیم فاطمہ علوی کا

سفرنامہ ہندوستان

اردو میں سفرنامے کی روایت تقریباً ڈیڑھ سو سال پرانی ہے۔یوں تو مرد تمام اصناف ادب کو اپنی قلمرو میں شمار کرتے ہیں لیکن سفرنامے پر تو گویا ان کی اجارہ داری ہے۔سفرنامہ نویسی میں چند ایک پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں تاہم ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خواتین کے لئے تفریحی سفر پر جانا ہی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے چہ جائیکہ سفری یادداشتوں کو کتابی شکل میں مشتہر کیا جائے۔معلومات کے لحاظ سے سفرنامہ کو دیگر اصناف ادب پر ایک گونہ فوقیت حاصل ہے کہ سفرنامہ نگار اپنے مشاہدات و تاثرات کو ایسے انداز میں نوک قلم پر لاتا ہے کہ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔یہی قلمی تصویر کشی سفرنامہ کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا سبب ہے۔ہندوستان میں موجود مسلم تہذیب کے فقید المثال ورثہ سے مسلمان میں بالخصوص اور اقوام عالم میں بالعموم گہری دلچسپی پائی جاتی ہے۔ہندوستان جلال و جمال سے مزین ایک پراسرار دیس ہے جس کی کشش سے انکار ممکن نہیں۔لہٰذا اس کے سفرنامے ہمیشہ شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

106 صفحات پر مشتمل جو پیٹر پرنٹرز۔اسلام آباد کا شائع کردہ نسیم فاطمہ علوی کا سفرنامہ ہندوستان ”سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے“ کی عملی تصویر نظر آتا ہے۔علی گڑھ کے منتظمین کی مسافر نوازی کتاب کے ہر صفحے سے عیاں ہے۔میرے خیال میں اس کتاب کا نام ”علی گڑھ کے مہمان“ ہونا چاہئے تھا۔مصنفہ نے سلسلہ واقعات اور روداد سفر کو تسلسل کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔زبان عام فہم ہے جس سے عام قاری بھی بھرپور استفادہ کر سکے گا۔سفرنامے کی شروعات پاکستان کی سیاسی تاریخ کے بہت بڑے سانحے سے ہوتی ہے۔اس حادثہ فابعد اور مابعد کے واقعات سے مصنفہ جس کرب سے گذریں اس کا بھرپور عکس نظر آتا ہے۔ایسے غیر یقینی حالات میں دیار غیر کو رخت سفر باندھنا مصنفہ اور ان کے رفقائے سفر کے عزم صمیم کا پتہ دیتا ہے۔معلوم ہوتا ہے کہ مصنفہ ہندوستان سے متعلق بزرگوں کی کہانیوں سے اس دیس کے بارے میں خیالی دنیا آباد کر چکی تھیں۔اور اس دنیا میں درود کے بعد پہلے پہل ان کا ماتھا اس وقت ٹھنکا جب حوائج ضروریہ کے لئے انھیں باتھ روم جانا پڑا۔وہاں کی منظر کشی مصنفہ کی ژرف نگاہی کی گواہی دیتی ہے۔مشرقی پنجاب کے سفر کے دوران سفرنامہ نگار قیام پاکستان کے اعلان کے بعد اور نقلمکانی کے دوران پیش آنے والے دردناک واقعات کی تکلیف سے گزرتی رہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ بیتی بیان کر رہی ہوں۔جالندھر شہر سے جذباتی وابستگی چھلکتی نظر آتی ہے۔اپنے آباؤ اجداد کی میراث کے نقوش

ڈھونڈنے کی کوشش میں مصنفہ کی بے قراری اپنے عروج پر نظر آتی ہے اور حویلی ریسٹورنٹ سے جھلکتا دیہاتی کلچر کی پسندیدگی مصنفہ کی اپنے کلچر سے وابستگی کا ثبوت ہے۔ البتہ انھیں دہلی کا رونق پیلس، آوارہ کتے اور میان راہ مرے ہوئے دو موٹے موٹے چوہے پسند نہ آئے اور مصنفہ کو ان پر پھلانگنے کی زحمت اٹھانا پڑی۔ اس منظر کشی سے چوہوں پر ہاتھی کا گماں ہوتا ہے۔

چونکہ بنیادی طور پر یہ سفر علی گڑھ یونیورسٹی کی دعوت پر ارینج ہوا تھا لہٰذا سفرنامے کا بڑا حصہ علی گڑھ کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے جس میں سرسید کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ البتہ یہ سمجھنے میں دقت محسوس ہوتی ہے کہ آیا مصنفہ نے براہ راست سرسید کی کتابوں سے ان کا نقطۂ نظر سمجھنے کی کوشش کی ہے یا سرسید کے سوانح نگاروں کی تحریروں سے استفادہ کیا ہے۔ اسی طرح علی گڑھ یونیورسٹی کی عمارت، ہاسٹل، طلباء اور اسٹاف کے اعداد و شمار، وائس چانسلر اور منتظمین کی مہمان نوازی کا نقشہ خوبصورتی سے کھینچا ہے۔

آگرہ اور جے پور کے محلات اور شاہی زنان خانوں سے وابستہ کہانیاں سنانے والے قصہ گویوں کی صداقت پر مصنفہ کو یقین نہیں آتا۔ آپ کا خیال ہے کہ سب فرضی کہانیاں لوگوں نے گھڑ رکھی ہیں۔ آگرہ قلعہ، اس کے اطراف میں خندق، خندق میں پانی اور مگرمچھوں کی موجودگی میں زنجیر عدل تک رسائی کے واقعہ پر مصنفہ کا سوال بہت خوب ہے جو مصنفہ کی اصول روایت کے ساتھ اصول درایت سے آشنائی کا آئینہ دار ہے۔ ہندوستان کی سیاحت کے دوران تاج محل کی سیر کو نہ جانا محالات میں سے ہے لہٰذا مصنفہ نے تاج محل کی روداد بھی قدرے طوالت سے بیان کی ہے اور سفرنامے کو محل کی مختصر تاریخ سے بھی مزین کیا ہے۔ اسلوب تحریر کے ساتھ ساتھ خوب صورت رنگین تصاویر کے اضافے نے سفرنامے کی دلکشی کو دوچند کر دیا ہے۔ البتہ چند پہلو ایسے ہیں جن کی نشاندہی بہت ضروری ہے۔ کمپوزنگ میں رہ جانے والی اغلاط کو پروف ریڈنگ کے دوران درست نہیں کیا گیا۔ مثلاً صفحہ نمبر 8 پر گتھم گتھا، صفحہ نمبر 12 پر دہشت گر، صفحہ نمبر 14 پر طلسمانی، صفحہ نمبر 25 پر حقہ بقدر جسہ، صفحہ نمبر 31 پر دھلی، صفحہ نمبر 38 پر ریلورے سٹیشن، صفحہ نمبر 39 پر راجستان وغیرہ اسی طرح کمپوزنگ میں ذ اور ز کے فرق کا خیال نہیں رکھا گیا۔ مثلاً صفحہ نمبر 11 پر وقع پزیر جبکہ یہاں ز کی جگہ ذ ہونا چاہیے تھا۔ کہیں کہیں متضاد آراء کا تاثر بھی پایا جاتا ہے مثلاً صفحہ نمبر 60 پر عمومیت کت ساتھ لکھا کہ ''ہندوستان میں ہمیں کہیں بھی کوئی خوبصورت عورت نظر نہیں آئی'' جبکہ صفحہ 85 پر درج ہے ''مہارانی گائیتری دیوی ابھی تک حیات ہیں اور وہ آج بھی حسین ہیں''۔ صفحہ نمبر 62 پر شاہ جہاں کو اکبر کا پوتا اور صفحہ 71 پر بیٹا لکھا گیا ہے۔

سرسید کا صرف دستخط کی حد تک انگریزی جاننا بھی محل نظر ہے کیونکہ دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ ان پڑھ ہونے کے باوجود عربوں اور انگریزوں سے میل ملاپ کے نتیجے میں عربی اور انگریزی سے واقفیت پیدا کر لیتے ہیں۔ سرسید ایسے نابغۂ عصر سے بعید ہے کہ وہ اتنے طویل عرصے انگریزوں سے رابطے اور ملازمت کے باوجود انگریزی زبان سے کورے رہے ہوں۔ ہاں زبان پہ عبور نہ ہونا ایک دوسری بات ہے۔ اسی طرح صفحہ نمبر 50 پر درج ہے '' یہ سب قبریں یونیورسٹی کی جامعہ مسجد کے احاطے میں ہیں۔ یہ سینٹرل مسجد مغلیہ طرز پر بنائی گئی ہے

۔۔۔۔ اس کے متعلق ہمیں بتایا گیا کہ یہ یاقوت رمن ڈیزائنر نے ڈیزائن کی تھی۔ یہ تاج محل کا ڈیزائنر تھا جسے سرسید نے خاص طور پر بلایا تھا ۱۸۷۷ء میں یہ مسجد تیار ہو گئی تھی'' جبکہ صفحہ نمبر 63 پر تاج محل کا سن تکمیل 1648 تحریر کیا گیا ہے۔ اس طرح 1648 اور 1877 کے درمیان 229 سال کا فرق ہے لہٰذا اتنی طویل مدت یاقوت رمن ڈیزائنر کا زندہ رہنا ممکن نہیں اس مقام پر مصنفہ نے راوی پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا اور فن درایت سے صرف نظر۔

مجموعی طور پر سفرنامہ ہندوستان ایک کامیاب کوشش اور مصنفہ نسیم فاطمہ علوی مبارکباد کی مستحق ہیں۔ امید ہے یہ سفرنامہ اردو ادب میں اس صنف کی روایت کو آگے بڑھانے میں مددگار رہے گا اور خصوصاً خواتین کو سفرنامہ نویسی کی طرف راغب کرنے میں سنگ میل ثابت ہوگا۔

رات کے کسی پہر ریل گاڑی اپنی منزل کی جانب جا رہی تھی۔ ڈبے میں اندھیرا تھا اور ہر کوئی اپنی جگہ پر دُبکا ہوا یا لیٹا ہوا تھا کہ اچانک دروازے کی جانب سے شور و غوغا بلند ہوا جس میں کسی عورت کے چیخنے چلانے کی آواز بھی شامل تھی۔ مَیں چند لوگوں کے ساتھ اُس طرف گیا۔ ایک ہندوستانی عورت، جس کے چہرے سے خوں بہہ رہا تھا، فرش پر نیم غشی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی اپنے ہاتھ پاؤں ہلا رہی تھی۔ ایک عورت نے اس کا خوں پونچھتے ہوئے اسے سنبھالا دیا جب کہ وہ ''میرا ہار۔۔۔ میرا ہار۔۔۔'' بڑبڑائے جا رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ دو اُچکے، جو اُس کی گھات میں تھے، موقع ملتے ہی اس کے گلے میں پڑی سونے کی ایک زنجیر اور ایک ہار پر جھپٹ پڑے تھے۔ اس نے استقامت سے اپنے زیورات پر اپنی گرفت برقرار رکھی تھی تو اُچکوں میں سے ایک نے، اُسے غافل کرنے کے لیے، اُس کے چہرے پر کسی تیز دھار آلے سے حملہ کیا تھا اور پھر وہ اس کی آہ و بکا سُن کر چلتی گاڑی میں باہر کو کہیں نکل گئے تھے۔ اس عورت کو سہارا دے کر اس کی سیٹ پر لایا گیا۔ اس کی مجموعی حالت میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا اور وہ بڑبڑاتی ہوئی کہہ رہی تھی کہ اس کا ہار ٹوٹ گیا ہے۔ ایک آدمی نے حاضرین سے پوچھا کہ کیا کسی کے پاس زخم پر لگانے کے لیے دوائی یا پھر آفٹر شیو لوشن ہوگا جس سے عورت کے بہتے خون کو بند کیا جا سکے۔ خوش قسمتی سے اسی ڈبے میں ایک لیڈی ڈاکٹر بھی تھی جو دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح اَب خود بھی اٹھ بیٹھی تھی۔ اُس نے اپنی دواؤں کا بکس نکالا اور اس کی مرہم پٹی کر دی۔ جب مضروبہ کے ہوش ٹھکانے آئے تو اس نے بتایا کہ وہ ٹوائیلٹ کو گئی تھی اور اس دوران ریل گاڑی، غالباً سرخ سگنل ہونے کی وجہ سے، رُکی ہوئی تھی۔ جونہی ریل نے حرکت کی وہاں کھڑے دو آدمی اس پر پل پڑے تھے۔ وہ اس کا ہار اور زنجیر چھیننا چاہتے تھے، مگر وہ مضبوطی سے اُنھیں پکڑے رہی تھی۔ ان میں سے ایک نے اس کے چہرے پر کسی شے سے وار کیا تھا اور اپنی ناکامی پر وہ دونوں باہر چلے گئے تھے۔ عورت نے اپنا ہار اور زنجیر، جنھیں اس نے اَب اپنے ایک ہاتھ میں چھپا رکھا تھا، اپنے صندوق میں ڈالے اس نے اپنی انگلیوں میں پہنی دو انگوٹھیوں کو بھی وہیں رکھا اور اسی میں سے نائیلون کی ایک ڈوری اور پکی مٹی کا گھگھو گھوڑا قسم کا ایک چھوٹا ٹکرا نکال کر ایک عارضی ہار ترتیب دیا اور اسے پہننے کے بعد اپنے برتھ پر چت لیٹ گئی۔

(**فاروق خالد** کے سفرنامۂ ہند ''**پہیے کے اندر**'' سے اقتباس)

آپ کے خطوط، ای میلز، تاثرات

I am thankful to you for sending me J-A regularly,your urdu journal is not only worth reading it deserves to be keptsafe in the library for reference purposes. ever yours
Nida Fazli ندا فاضلی

جدید ادب کی آن بان دیکھی ہی نہیں جاتی۔آپ نے اسے وہاں لا کھڑا کیا ہے، جہاں کے خواب دوسرے لوگ ساری زندگی دیکھتے ہی رہتے ہیں۔

''جدید ادب'' سے میرا کیا رشتہ ہے یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔مجھے آپ نے ہمیشہ عزت دی، مقام دیا لیکن کبھی احسان نہیں جتایا۔یہ آپ ہی تھے کہ آپ نے ''جدید ادب'' کے ایک گوشے میں لا کر مجھے نمایاں کیا اور آپ نے یہ کام جرمنی میں بیٹھ کر کیا۔یہ کام پاکستان میں بیٹھ کر زیادہ آسانی سے ہو سکتا تھا لیکن ہمارے معیارات یہاں ذرا مختلف نوعیت کے ہیں۔مرعوب لوگوں کی کیمسٹری کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔یہاں ہم عزت انہی لوگوں کو دیتے ہیں جو۔۔۔۔۔قسم کے ہوتے ہیں۔اللہ آپ کو خوش رکھے کہ آپ نے اردو ادب کو اس طرح کے ''نابغوں'' سے نجات دلانے کے کام کا آغاز کر دیا ہے۔

چند روز قبل مجھے آپ کی نثری و شعری کلیات ''عمر لاحاصل کا حاصل'' موصول ہوئی۔سرسری ورق گردانی ہی کے دوران میں میرے سامنے وہ صفحات آ گئے جن میں آپ نے میرا تذکرہ کیا ہے۔میں نے ایک عجیب عالمِ سرشاری میں یہ سب کچھ پڑھا اور پھر دیر تک یہ سوچتا رہا کہ آپ نے مجھ سے درگزر کیا۔۔۔۔میں اس عنایت کے لیے آپ کا ممنونِ احسان ہوں۔میں اس بات پر بھی آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے ''جدید ادب'' میں میری کتاب ''صفحۂ خاک'' پر نہایت محبت سے اپنا تبصرہ شامل کیا۔میں کس کس بات کا ذکر کروں۔آپ کے احسانات بے شمار ہیں اور میں۔۔۔۔۔بس یہی کہ آپ کی محبت۔۔! **احمد حسین مجاہد** (ایبٹ آباد)

مجھے گوشۂ ہمت رائے شرما میں شامل سبھی مضامین بہت پسند آئے۔**فضیل جعفری**۔(ممبئی)

جدید ادب میں آپ کی جولانیاں اور انٹرنیٹ پر آپ کی کامرانیوں کے جلوے دیکھتا اور خوش ہوتا ہوں۔خداوند قدوس آپ کو اسی طرح بلندیوں کی طرف محوِ پرواز رکھے۔آمین۔ **مظفر حنفی** (دہلی)

جدید ادب جرمنی کا شمارہ نمبر۱۴ ریلیز ہو گیا

حیدر قریشی کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی جریدہ جدید ادب جرمنی کا شمارہ نمبر چودہ (بابت جنوری تا جون ۲۰۱۰ء) دسمبر کے مہینہ میں ہی ریلیز ہو گیا ہے۔۳۶۰ صفحات پر مشتمل یہ ضخیم شمارہ پہلے شمارہ سے بھی ایک قدم آگے نکلا ہوا ہے۔اپنی تخلیقی، تحقیقی و تنقیدی پیش رفت کی طرح حیدر قریشی ادارتی سطح پر بھی خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہیں۔

گفتگو کے زیرِ عنوان اداریہ مدیر کی علمی بصیرت کا آئینہ دار اور مابعد جدیدیت و مخصوص ''مشرقی شعریات'' کی حقیقت کی طرف واضح نشاندہی کرتا ہے۔حمد و نعت کے باب میں ناصر نظامی، حفیظ انجم، م۔ت۔ذکی، احسان سہگل، رؤف خیر، قدرت علی قدرت کے گلہائے عقیدت کھلے ہوئے ہیں۔مضامین کے حصہ میں عامر سہیل، معید رشیدی، محمد شفیع بلوچ، ڈاکٹر حامد اشرف، اویس سنبھلی اور کوثر فاطمہ کے مضامین نئے مباحث کے امکانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔مقصود الٰہی شیخ کا ناصر نظامی کے نام ایک دلچسپ خط بھی اس حصہ میں شامل کیا گیا ہے۔

اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما اور معروف و ممتاز شاعر حمایت علی شاعر کے لیے ایک ایک گوشہ مخصوص کیا گیا ہے۔ہمت رائے شرما کے گوشہ میں فراق گورکھپوری، ڈاکٹر خلیق انجم، مالک رام، ظ۔انصاری، خواجہ احمد عباس، یوسف ناظم، حیدر قریشی، یونس اگاسکر، شان الحق حقی، مظہر امام اور بعض دیگر کے مضامین اور تاثرات سے ہمت رائے شرما کی شاعری، افسانہ نگاری اور مزاح نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔''اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما'' کے عنوان سے منزہ یاسمین اور صبیحہ خورشید کے دو مضامین گوشہ میں شامل ہیں۔منزہ یاسمین نے مذکورہ نام سے حیدر قریشی کی کتاب کا جائزہ پیش کیا ہے جبکہ صبیحہ خورشید نے اپنے مضمون میں اپنے موضوع کو اس کے زیادہ وسیع پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔یوں ہمت رائے شرما کی وفات کے بعد نہ صرف ان کی فراموش شدہ ادبی خدمات کو یاد کیا گیا ہے اور ان کی اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے بلکہ اردو ماہیا کے بانی کی حیثیت سے ان کے اعزاز کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔

حمایت علی شاعر کا گوشہ ان کی کلیات کے سات مجموعوں کے تعارف پر مبنی ہے۔اس میں کلیاتِ شاعر'' میں شامل سارے مجموعوں کے پیش لفظ یکجا کر کے کلیات سے ایک اہم شعری انتخاب بھی دیا گیا ہے۔یہ ایک غیر روایتی انداز کا گوشہ ہے جس کا مقصد قارئین ادب کو 'کلیاتِ شاعر' کی اہمیت کا احساس دلا کر اس کے مطالعہ کا اشتیاق پیدا کرنا ہے۔

غزلوں کے باب میں غالب احمد، کرامت علی کرامت، اکبر حمیدی، صادق باجوہ، احمد حسین مجاہد، رشید ندیم، رفیع رضا، جگدیش پرکاش، رؤف خیر، ناصر نظامی، راجہ محمد یوسف، حیدر قریشی و دیگر کی غزلوں کے ساتھ ایوب خاور، عبداللہ جاوید، شہناز نبی، معید رشیدی، ارشد کمال، خالد ملک ساحل، مبشر سعید اور ضمیر طالب کی چار سے نو تک غزلیں شامل کی گئی ہیں۔افسانوں کے سیکشن میں جوگندر پال، عبداللہ جاوید، شہناز خانم عابدی، ڈاکٹر بلند اقبال، اقبال حسن آزاد، طالب کشمیری، مسعود علی تماپوری، فیاض احمد وجیہہ اور حیدر قریشی جیسے سینیئر اور نئے لکھنے

والے ایک ساتھ موجود ہیں۔

نظموں کے سیکشن میں ستیہ پال آنند، غالب احمد، احمد صغیر صدیقی، پروین شیر، فیصل عظیم، سید ماجد شاہ، خالد ملک ساحل، ارشد خالد، عاطر عثمانی، سلیمان جاذب، حیدر قریشی اور دیگر کی نظمیں شامل ہیں۔ان نظم نگاروں کے دوش بدوش ایوب خاور، عبداللہ جاوید، تنہا تماپوری، انوار احمد اور مبشر سعید کی چار سے لے کر دس تک نظمیں شامل ہیں۔خصوصی مطالعہ کے حصہ میں احمد ہمیش، فہیم شناس کاظمی اور انجلا ہمیش کی نثری نظمیں شامل ہیں۔تاہم اس حصہ کا بھی اور جدید ادب کے اس شمارہ کا بھی سب سے اہم مضمون حسن جعفر زیدی کا نہایت فکر انگیز مقالہ ہے جو ہماری تاریخ فہمی اور ہمارا فکری و سیاسی بحران'' کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔موجودہ عالمی اور مسلم ملکوں کی صورتحال میں یہ فکر انگیز مقالہ بہت سی خوش فہمیوں سے نکال کر ہمیں حقائق کی دنیا میں لے آتا ہے۔

جدید ادب کا سرورق مصطفیٰ کمال پاشا کے کمالِ فن کا نمونہ ہے۔ ہر شمارہ اپنے سرورق پر ایک خوبصورت ماہیا لاتا ہے تو اندر کے صفحات پر بھی بہت سارے ماہیے شامل کیے جاتے ہیں۔اس بار امین خیال، نذیر فتح پوری، ناصر نظامی اور جیم فے غوری کے ڈھیر سارے ماہیوں کے ساتھ ساتھ کلیم شہزاد، رفیق شاہین، شاذ رحمانی، مبشر سعید اور امین بابر کے ماہیے شامل ہیں۔کتاب گھر میں رختِ ہنر (غالب احمد)، پچیس (جوگندر پال)، شاہ دولہ کا چوہا اور دوسری نظمیں (ساقی فاروقی)، شگاف (جگدیش پرکاش)، پہلا پتھر (نذیر الدین خان) نئے تنقیدی مسائل اور امکانات (کرامت علی کرامت) تری خوشبو (سلیمان جاذب)، کائناتِ فکر و نظر (ڈاکٹر رضیہ حامد) پر حیدر قریشی کے تبصرے شائع کیے گئے ہیں۔اسی حصہ میں تفصیلی مطالعہ کے تحت ایوب خاور کے شعری مجموعہ پر گلزار کا، اکبر حمیدی کے فن پر لکھا ہوا رفیق سندیلوی کا اور انل ٹھکر کی کتاب پر لکھا ہوا عبدالرب استاد کا تفصیلی مطالعہ شامل ہے۔قارئین کے تاثرات کے سیکشن میں شمس الرحمٰن فاروقی، افتخار عارف، عتیق احمد عتیق، احمد صغیر صدیقی، ارشد خالد، جیم فے غوری، علی احمد فاطمی، ناصر نظامی، جعفر ساہنی، کاوش پرتا پگڈھی، عبداللہ جاوید، ارشد کمال، صادق باجوہ، رئیس الدین رئیس، حفیظ انجم، معید رشیدی، رؤف خیر، مسعود علی تماپوری، مرتضٰی اطہر، فاروق خالد، شہناز خانم عابدی، سہیل اختر، عبداللہ جاوید وغیرہا کے خطوط کو شامل کیا گیا ہے۔مجموعی طور پر جدید ادب کا شمارہ ۱۴، ایک بھرپور علمی و ادبی جریدہ ہے۔جس کے کئی مندرجات پر دیر تک گفتگو ہوتی رہے گی۔ **ارشد خالد** (اسلام آباد)

(یہ خبر urdu_writers@yahoogroups.com سے ۱۲ر دسمبر ۲۰۰۹ء کو ریلیز کی گئی اور بعد ازاں ۱۵ر دسمبر ۲۰۰۹ء کو اسے ایک صاحب نے Facebook پر بھی جاری کیا، جس پر ستیہ پال آنند نے لکھا:
''اس تاریخ ساز رسالے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے'')

ایک عرصہ کے بعد جدید ادب کے دو شمارے ایک ساتھ پا کر دلی مسرت ہوئی۔بیحد شکریہ۔گوشے عمدہ ہیں، اندر کے مضامین دیکھ کر جی خوش ہوا۔۔۔۔آپ کی محنت اور جرات کا میں پہلے بھی قائل تھا اور اب تو اور بھی ہو گیا ہوں۔خدا آپ کو سلامت رکھے۔ **پروفیسر علی احمد فاطمی** (الہٰ آباد)

جدید ادب کے شمارہ ۱۴ نے صرف ''چاہت کے خزانوں'' کو ہی نہیں بل کہ علم و دانش کے خزانوں کو بھی ہماری دسترس میں کر دیا۔حسن جعفر زیدی نے ''ہماری تاریخ فہمی'' کے تراشیدہ بت پر دلائل و براہین سے کاری ضرب لگانے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن **عظیم شخصیات** کے جس بت خانے میں ناول کو تاریخ اور فسانے کو حقیقت قرار دینے والے نام نہاد مفکر اور دانشور اپنے شاندار ماضی کا منتر جپ رہے ہوں؛ حسن جعفر زیدی کے پیش کردہ شواہد کو اسد اریب اور منشا یاد جیسے گنے چنے باشعور افراد ہی قابل اعتنا سمجھیں گے۔دنیا کے ٹھیکیدار تو عظمتِ رفتہ کے حصول کی خاطر مغرب کو تباہ کرنے کی کوشش میں سب کو برباد کرنے میں لگی ہوئے ہیں۔

اردو شاعری پر ایک الزام یہ بھی ہے کہ یہ صرف اشرافیہ کی فکر کی ترجمانی کرتی تھی۔ یہ الزام کسی حد تک درست ہے جس کی جڑیں ہندستان کے طبقاتی نظام میں دیکھی جا سکتی ہیں۔اگر چہ رویے بہت حد تک بدل چکے ہیں لیکن انیسویں صدی کے اختتام تک ہندوستان کے طبقاتی نظام کے زیر اثر اردو شاعری صرف فکرِ اشرافیہ کی عکاسی کرتی تھی جس میں عامۃ الناس کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔اس دور کے معروف تذکرہ نگار غلام مصطفیٰ خان شیفتہؔ نے نظیرؔ اکبر آبادی کا ذکر کرتے ہوئے طنزاً ان کے اشعار کے سوقین کی زبان پر جاری ہونے کا ذکر کیا۔جس کے ردِ عمل میں پسے ہوئے طبقات کی علم بردار ترقی پسند تحریک نے نظیرؔ کو آسمان پر چڑھا دیا۔تاہم ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے متعدد اہلِ قلم کے فلم انڈسٹری سے ہو کر فلمی کہانیاں مکالمے اور نغمے لکھنے کے باوجود اشرافیہ کی سوچ ذہنوں پر اتنی چھائی ہوئی تھی کہ ترقی پسند نقادوں نے بھی فلمی کہانی اور فلمی گیت کو عامیانہ سمجھتے ہوئے انھیں دائرہ ادب میں داخل نہ کیا۔ ہماری نام نہاد اشرافیہ تا حال اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھتی۔مغرب کی یونی ورسٹیوں کے نصاب میں تو فلمی ادب اور فن کا با قاعدہ مطالعہ شامل ہے۔اگر چہ دنیائے اردو کے دوسرے ادبی جرائد میں بھی کبھی کبھار فلمی شاعری پر مضامین شائع ہو جاتے ہیں لیکن جدید ادب میں انھیں زیادہ پذیرائی ملتی ہے جس کے نتیجے میں امید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل قریب میں سبھی انھیں ایوان ادب میں داخل کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔اس منزل کے حصول کی خاطر جدید ادب اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

دورانِ گفتگو آپ نے دریدا کی فکری اساس کا ذکر کرتے ہوئے جن متعصّبانہ قوانین کی نشاندہی کی بدقسمتی سے ایسے متعصّبانہ قوانین اور رویے دنیا کے اکثر ممالک اور معاشروں میں پائے جاتے ہیں جن سے گزر کر عظیم شخصیات بھی سامنے آتی ہیں لیکن بالعموم ان کے اثرات فرد اور معاشرے دونوں کے حق میں انتہائی مضر ہوتے ہیں۔ان رویوں کو سہتے سہتے فرد کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے جس کی سزا بھی اسی کو ملتی ہے البتہ معاشرے کو بھی اس کے نتائج بھگتنا پڑتے ہیں۔دریدا کے حسن بن صباح کی فکر سے استفادہ کرنے کی نشاندہی پر مجھے خیال آیا کہ بظاہر مغلوب قومیں غالب تہذیب سے دانش حاصل کرتی نظر آتی ہیں جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی ہے۔ ہر دور کی مغلوب تہذیب وقتی کمزوری کے باعث اپنی دانش کو مربوط طریقے سے پیش کرنے سے قاصر ہوتی ہے۔جس کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے غالب قوم، مغلوب کا مادی استحصال کرنے کے ساتھ ساتھ فکری استحصال کرتے ہوئے ان کی دانش کو اپنی سوچ کے مطابق ڈھالنے کے بعد اپنا بنا کر پیش کرتی ہے۔

مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں ایران و یونان کی دانش کو اسلامی فکر کا جزو بنایا اور آج اگر مغرب یہی کر رہا ہے تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں کیونکہ آپ کا یہ فرمانا سو فیصد درست ہے کہ ''علمی و فکری لہروں کا سفر مشرق اور مغرب سے مشرق کی طرف صدیوں سے جاری و ساری ہے۔'' البتہ ان دانشوروں کو کیا کہیے جنہیں احساسِ کمتری کے باعث دانش مغرب کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا یا جو 'پدرم سلطان بود' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے سمجھتے ہیں کہ مغرب کی ترقی ہماری عطا ہے۔ **مبشر احمد میر**۔(گجرات، پاکستان)

جدید ادب کا تازہ شمارہ ملا تو جی خوش ہو گیا۔ جرمنی میں بیٹھ کر بھی آپ ماشاءاللہ اتنا ضخیم رسالہ بڑی آسانی سے نکال لیتے ہیں۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے۔ ہمت رائے شرما کے سلسلے میں آپ کے حوالے سے صبیحہ خورشید، منزہ یاسمین کے مضامین خوب ہیں۔ آپ نے بہر حال ہمت رائے شرما کو ماہیے کا بانی منوا کر ہی چھوڑا۔ چلئے اردو میں ایک صنف کا اضافہ تو ہوا، بھلے ہی ہمت رائے شرما ماہیے کے بانی ہوں، اس کے احیا اور نشاۃ ثانیہ کا سہرا تو آپ ہی کے سر بندھتا ہے۔ آپ کی جو خدمات ہیں وہ سب پر روشن ہیں۔

جناب حمایت علی شاعر سے حیدر آباد میں ملاقات ہوئی تھی۔ آپ نے تازہ جدید ادب میں ثلاثیوں اور دیگر تخلیقات کے ساتھ جو خاص گوشہ شائع کیا وہ حمایت علی شاعر جیسے شاعر کے شایانِ شایان ہی ہے۔ اسی طرح ان کے کئی مجموعوں کی منتخب تخلیقات پڑھنے میں آ گئیں۔ اس طرح یہ ایک دستاویزی نوعیت کا رسالہ ہو گیا۔

آپ کا ایک مطلع تو کئی لوگوں کی زندگی کا عکاس ہے۔

اسی طریقے سے دونوں گزارا کرتے ہیں   ہم ان کو اور ہمیں وہ گوارا کرتے ہیں

معید رشیدی کا مضمون اچھا ہے مگر ایک غزل میں غالباً کتابت کی غلطی در آئی ہے۔

دشت میں وہ در و دیوار اٹھانا چاہتے ہیں   اور اک ہم ہیں کہ گھر بار اٹھانا چاہتے ہیں

''چاہتے ہیں'' کے بجائے غالباً ''چاہیں'' ہوگا۔

حسن جعفر زیدی (لاہور) کا مقالہ ''ہماری تاریخ فہمی اور ہمارا فکری و سیاسی بحران'' حیرت ناک ہے۔ انہوں نے بڑی محنت سے تمام عالمی صورتِ حال کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کی بیشتر باتیں صداقت پر مبنی ہیں۔ ''اسلامی اتحاد و اخوت کی بنیاد پر مسلم امّہ کا تصور بھی تجریدی تصور ہے'' بہت خاص نقطۂ نظر ہے۔ یہ مضمون کتابی شکل میں آنا چاہیے۔ **رؤف خیر**۔(حیدر آباد، دکن)

جدید ادب شمارہ ۱۴ ضخامت اور معیار کی اساس پر اردو جرائد میں مثالی اور نمائندہ حیثیت کا حامل ہے۔ قریب قریب تمام مشمولات پڑھنے کے لائق ہیں۔ افسانوں کے شعبے میں جوگندر پال کے افسانچے خاص طور پر 'آج کے لوگ'، 'محض'، 'نہیں رحمٰن بابو' پڑھنے کے دوران کم وقت لیتے ہیں۔ لیکن بعد میں پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اقبال حسن آزاد کا 'الیوژن' طاقتور افسانہ ہے۔ اس کے بیانیے اور جزئیات نگاری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ بھی

بیشتر افسانے اچھے لگے۔ آپ کا 'نیک بندوں کی بستی' ایک اہم مرکزی خیال کے ابلاغ میں فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ کامیاب افسانہ ہے۔ آپ نے میرے افسانے 'خواب کا رشتہ' کو جگہ دی آپ کا بہت شکریہ۔ 'جدید ادب شمارہ ۱۴' کو ہمارے ہاتھوں تک پہنچانے کے سلسلے میں ہم سب آپ کے شکر گزار ہیں۔ اللہ حافظ۔

شہناز خانم عابدی۔کینیڈا

شمارہ ۱۴ میں دریدا پر ''گفتگو'' کرتے ہوئے آپ نے حسن بن صباح کی 'التونت' کی گیند قارئین کے کورٹ میں پھینک دی ہے۔ کاش! کوئی تحقیق کا بندہ اس کو کامیابی کے ساتھ لوٹائے۔ دیکھتے ہیں۔! میری غزلیں، نظمیں، خطوط اور افسانہ 'برزخی' کو جگہ دے کر آپ نے بڑی عنایت فرمائی۔ شکریہ۔ **عبداللہ جاوید**۔کینیڈا

(نوٹ: دریدا کے دو بنیادی نکات کے ماخذ کے طور پر تو میں نے حسن بن صباح کے خیالات کو فاطمی عقائد کے تناظر میں وضاحت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ ''التونت'' کے ملنے سے تو مزید پرت کھلنے کی امید ہے۔ ح۔ق)

جدید ادب کا تازہ شمارہ محترم ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کے دستِ شفقت سے تبرک کی طرح ملا جس میں آپ کے خلوص کی مہکار نمایاں تھی۔ جدید ادب کا فرنٹ ٹائٹل اُن دیکھے جہانوں کی خوبصورت بشارت لگی اور اُن دیکھے جہانوں کے سفر میں یہ ماہیا زادِ سفر معلوم ہوا:

؎ اَن دیکھے جہانوں تک
دل نے پہنچنا ہے
چاہت کے خزانوں تک

مصطفیٰ کمال پاشا، کا اعلیٰ تخیل جب سمٹے تو ایسا ہی شاہکار تخلیق ہو سکتا تھا۔ غزل چونکہ من پسند صنف ہے اسی لیے سب سے پہلے غزلیں ہی پڑھیں۔ جدید ادب میں شامل تمام غزلیں دل پر اثر کرنے والی معیاری شاعری کا نچوڑ لگیں۔ مگر خالد ملک ساحل، سلمان جاذب، شہناز نبی، معید رشیدی، ارشد کمال، مبشر سعید، حمیدہ معین رضوی، ضمیر طالب، کا کلام بامِ عروج پر تھا مگر یہ چند اشعار ایسے ملے جو صرف ذوق کو ہی نہیں سوچ کو بھی اپنا گرویدہ بنا گئے،

؎ جتنے دکھ درد تھے دل میں ہی ڈبو ڈالے ہیں   ہم نے فریاد کبھی کی نہ دُہائی دی ہے
اُن فقیروں کے لیے ایک خدا کافی ہے   اہلِ دنیا کو جنہوں نے یہ خدائی دی ہے   **(حیدر قریشی)**

؎ پھر نئی ہجرت کوئی درپیش ہے   خواب میں گھر دیکھنا اچھا نہیں
سر بدن پر دیکھئے جاوید جی   ہاتھ میں سر دیکھنا اچھا نہیں   **(عبداللہ جاوید)**

وہ اور تھے کہ ہوا جن پہ التفات و وصال   وہ ہم تھے جن کو ہمیشہ فراق میں رکھا
عدو سے رغبتِ پیہم ہے یار کو لیکن   ہمیں ہے ثانیۂ اتفاق میں رکھا   **(حنیف تمنا)**

جوگندر پال صاحب کے افسانچے 'نہیں رحمٰن بابو' بے حد بصیرت افروز تھا اسکا ایک ایک جملہ اپنے اندر بے پناہ

وسعت لیے ہوئے ہے۔مندرجہ ذیل جملہ تو سوچ کے کئی در وا کر گیا ''ہر کسی کو اپنی اپنی بساط کا ہی خدا ملتا ہے''۔نظموں میں ستیہ پال آنند کی نظم ''بھوکا رہنے سے کوئی مرتا نہیں؟''،حیدر قریشی کی نظم ''بوند بھر زندگی''ارشد خالد کی نظم ''ازل سے ابد''سلمان جازب کی نظم ''بولتی آنکھوں والی گڑیا'' مبشر سعید کی نظم ''یاد کا دکھ''۔ابھی ''جدید ادب''اور ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' مطالعہ جاری ہے ۔ایک بار پھر دل کی گہرائیوں سے ''جدید ادب''اور بہترین شاعری اور معیاری تصانیف سے آراستہ ''عمرِ لاحاصل کا حاصل'' سے نوازنے کا شکریہ۔ **فوزیہ مغل** (لاہور)

جدید ادب کا تازہ شمارہ بھی حسبِ معمول دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔خصوصی مطالعہ کے ذیل میں ''ہماری تاریخ فہمی اور ہمارا فکری وسیاسی بحران'' مبسوط موجز ہی نہیں،شمارے کا شاہکار مضمون بھی ہے۔اس کے مصنف جناب حسن جعفر زیدی نے نہایت دقت نظر اور جانکاہی سے عباسی و امیہ دور کا محاکمہ کیا ہے۔ماضی بعید و ماضی قریب میں اسلامی اتحاد اور جہاد کے بارے میں رائج من گھڑت تاویلات ومفروضات کے رخ سے پردہ اُٹھایا ہے۔وقت کا یہی تقاضا ہے۔

کلیاتِ شاعر میں شامل حمایت علی شاعر کے تحریر کردہ پیش گفتاروں اور دیباچوں کی یکجائی سے ان کے حالاتِ زندگی اور ادب کے متعلق ان کے افکار ونظریات کو سمجھنے میں آسانی ہوئی۔کچھ عرصہ قبل حمایت علی شاعر کے ہم وطن اور اردو کے نامور قلم کار اثر فاروقی صاحب نے اپنے موقر رسالہ ''قومی محاذ'' کا ایک شمارہ حمایت علی شاعر کو مختص کرکے اورنگ آباد کے اس بطلِ جلیل کو بھر پور خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔منظومات چیدہ چیدہ دیکھ سکا ہوں۔مندرجہ ذیل اشعار نے خصوصیت کے ساتھ متوجہ کیا۔

کرے گا کس طرح ہم پر عنایت　　کرم اس کا بہانہ ڈھونڈتا ہے **(کرامت)**

ایک امید ہے زندہ اب بھی　　راکھ میں جیسے شرارہ چمکے **(اکبر حمیدی)**

ستارے جس پہ نچھاور تو کہکشاں ہو فدا　　ہم ایسی دھرتی پہ سورج کو وارا کرتے ہیں **(حیدر قریشی)**

کروں کیا آرزوئے سرفرازی　　کہ جب نیزے پہ ہر پل میرا سر ہے **(ارشد کمال)**

کیسے آئے مرے گلشن میں بہار　　دشت میں آبلہ پا بیٹھی ہے **(عبداللہ جاوید)**

غلام مرتضیٰ راہی (فتح پور،یوپی)

آپ کی علالت کی اطلاع اپنے عزیز دوست معید رشیدی سے ملی،بارگاہ رب العزت میں آپ کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہوں۔اپنے افسانے کی اشاعت کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔

چند باتیں 'جدید ادب' (شمارہ-۱۴) کے تعلق سے......حمد ونعت کی ترتیب وتہذیب کا فن آپ کو آتا ہے،ناصر نظامی،احسان سہگل،قدرت علی قدرت اور رؤف خیر وغیرہ نے اس صنف کی نازک مزاجی کا بھرپور خیال رکھا ہے۔اس صنف میں طبع آزمائی کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔اداریہ میں آپ نے حسن بن صباح کے

تعلق سے جو اشاریہ فراہم کیا ہے،اس سے آپ کی گہری فکر ونظر کا اندازہ ہوتا ہے۔یہ متن اگر کہیں موجود ہے تو اس کی بازیافت ضرور ہونی چاہیے۔شمارہ صوری اور معنوی دونوں اعتبار سے ضخیم ہے،مضامین کے باب میں فکری تنوع کا احساس ہوتا ہے۔عامر سہیل نے بعض کتابوں کے چیدہ چیدہ اقتباسات کی روشنی میں اقبال کے فکری نظام کا تجزیہ کیا ہے،ان کی یہ کوشش قابل تعریف ہے لیکن اقبال کے فکری احوال کو براہ راست ان کی شعریات میں مرتب کرنے کی صورت زیادہ ثمر آور ہو سکتی ہے۔معید رشیدی کا مضمون 'عروض،معروض اور شعری بوطیقا' اپنے افہام وتفہیم کے انداز کی وجہ سے متاثر کن ہے۔ان کی وضع کردہ Thesis میں مبادیات شعر کے پہلو جہاں روشن ہیں،وہیں اس کے ہیئتی نظام کے داخلی اور خارجی حوالے کی چھان پھٹک میں بڑی گہری باتیں بھی کہی گئی ہیں۔اس مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس کے خشک ترین حوالے بھی قاری کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں،ایک اہم نقطہ یہ ہے کہ انہوں نے شعر کی قواعد کا مطالعہ اس کی روایات کے تسلسل میں کیا ہے اور اہم ترین حوالوں کو نشان زد کیا ہے۔ان کی یہ بات بے انتہا اہمیت رکھتی ہے کہ 'ایک صنف پر دوسری کو فوقیت دینا حماقت ہے۔ہر صنف کے اپنے تقاضے ہیں۔اس لیے اس کی شعریات کی روشنی ہی میں اس کا فیصلہ ہونا چاہیے۔' (ص-۳۲) ان کے اس روشن خیال میں بزرگ نقادوں کی عبرت کا خوب سامان ہے۔شفیع بلوچ کا مضمون بھی اپنے مندرجات کی وجہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ہمت رائے شرما اور حمایت علی شاعر کا گوشہ کئی معنوں میں یادگار ہے۔حمایت علی شاعر نے اپنی فلمی شاعری کے تعلق سے جو معلومات فراہم کی ہیں،وہ محفوظ رکھنے کے لائق ہیں۔ان کی شاعری کا انتخاب بھی نہایت عمدہ ہے۔غزل کے باب میں کافی رنگا رنگی ہے،لیکن میں شاعری (غزل) کے مطالعہ میں ذرا محتاط رہتا ہوں۔نظم اور افسانہ کسی بھی معیار کا ہو پڑھتا ضرور ہوں۔آپ کی ادارت پر بھروسہ کرکے میں نے اکثر غزلوں کا مطالعہ کیا اور مجھے بہت زیادہ مایوسی نہیں ہوئی۔اکبر حمیدی،مظفر حنفی،احمد صغیر صدیقی،رؤف خیر،جعفر ساہنی اور حیدر قریشی کے کئی اشعار پسند آئے۔آپ کا یہ شعر خاص طور پر دل میں اتر گیا:

تمام خواہشیں حیدرؔ کبھی کی چھوڑ چلے　　کہو تو خود سے بھی اب ہم کنارا کرتے ہیں

ایوب خاور،شہناز نبی،معید رشیدی اور ارشد کمال کی مٹھی بھر شاعری میں موضوعی تنوع نمایاں ہے،بالخصوص شہناز نبی کے ہاں عصری تناظر کے بعض حوالے بے حد روشن ہیں۔ان کی غزلوں میں قصہ کہنے کا انداز ان کے شعری کردار کو بڑا بناتا ہے۔ان کے ہاں تانیثی آگہی کسی فیشن کے بہ طور نہیں ہے بلکہ وجودی اظہار کے پیچھے کا ایک پورا عمل اس میں شریک ہے۔ان کا یہ مصرعہ: غزل میری حدیث عشق بنتی جارہی ہے۔ان کے شعری کردار کے تمام تر جذبات ومحسوسات کا اہم ترین حوالہ ہے۔ان کی غزلوں میں الگ الگ حوالوں سے کئی اشعار متوجہ کرتے ہیں۔معید رشیدی کی غزلیہ شاعری کا بھی اپنا ایک مخصوص سیاق ہے۔ان کے ہاں شاعری زندگی کی Meta physics سے ہم کلام نظر آتی ہے تو بعض غزلوں کا بیانیہ عالمی منظر نامہ کو روشن کرتا ہے۔ان کی غزل وجودی احوال وکوائف سے اجتماعی شعور اور لاشعور کا سفر کامیابی کے ساتھ طے کرتی ہے۔افسانوں میں شہرۂ آفاق تخلیق کار جوگندر پال کا بے حد مقبول سیریز شائع کرکے آپ نے قاری کے ذہن کو پھر سے تازہ کر دیا ہے۔بلند

اقبال کے اسلوب سے میں کسی قدر مانوس ہوں لیکن اس باران کے افسانے (؟) شاید غیر مشروط ذہن کے ساتھ میں اس کا مطالعہ نہیں کر پایا۔ ’فرشتے کے آنسو‘۔ کے افسانے آج بھی مجھے بے چین کرتے ہیں۔ اقبال حسن آزاد نے فن وفکر کی دوئی کو اپنے مخصوص رنگ میں دریافت کیا ہے۔ الیوژن، میں انہوں نے علاقائی اسلوب کو بڑی کامیابی سے برتا ہے، اور ایک مخصوص سائیکی کو عصری تناظر کا حوالہ بنایا ہے۔ حیدر قریشی کے افسانہ ’نیک بندوں کی بستی‘ میں نیکی کا اصل تصور بڑی خوبی کے ساتھ متشکل ہوا ہے۔ ستیہ پال آنند کی نظم ’بھوکا رہنے سے کوئی نہیں مرتا(؟) اس اعتبار سے اچھی ہے کہ انہوں نے فرانز کافکا کے خیالات کی تعبیر وتصریح میں اپنے شعری کردار کو احتجاج کا نمائندہ بنا دیا ہے۔ پروین شیر نے اپنی نظم ’کشمکش‘ میں دو کھڑکیوں کے استعاراتی مفہوم میں عشرت جسم اور عشرت جاں کے فلسفہ کو بہت وسیع معنی پہنا دیا ہے۔ اس فلسفہ کی ایک صورت رئیس الدین رئیس کی نظم ’اماں‘ میں نظر آتی ہے، لیکن ان کا نظریہ دوٹوک ہے۔ پروین کے ہاں جو کشمکش ہے وہ تارکین وطن کی سائیکی شاید ہو، لیکن زندگی کو دیکھنے کا یہ نظریہ ہی زیادہ فطری معلوم ہوتا ہے۔ ایوب خاور میرے پسندیدہ نظم گو شاعر ہیں، آپ نے ان کی کئی نظمیں شائع کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ انجلا ہمیش کی نظم ’محبت‘ ایک نوع کے کرب کا اظہاریہ ہے، لیکن اس میں اپنی انا کو سنبھالے رکھنے کا انداز ہی اس کا فن ہے۔ چنانچہ نظم کے آخری حصہ میں ان کا طنزیہ لہجہ زندگی کے فطری اسلوب کا درشن ہے۔ احمد ہمیش کی نظمیں اپنے فلسفیانہ رنگ وآہنگ کا ثبوت ہیں، ان کا افسانہ ’جدید ادب‘ کے کسی قریبی شمارے میں شائع کیجیے۔ رفیق سندیلوی نے اکبر حمیدی کے فن پر کئی حوالوں سے گفتگو کی ہے، اور تجزیہ وتنقید کا حق ادا کیا ہے۔ ماہیے کو ’جدید ادب‘ میں بے انتہا اہمیت حاصل ہے، میں نے ذاتی طور پر محسوس کیا ہے کہ اس صنف میں ٹھیٹ اردو سے مخصوص ’’تہذیبی سیاق اور ثقافتی مظاہر‘‘ بہت توانا صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس بار امین خیال، نذیر فتح پوری، ناصر نظامی اور جیم فے غوری کے ماہیے موضوعی تنوع کے باوجود اس ٹھیٹ تہذیبی سیاق کو روشن کرتے ہیں، شاید اس لیے اس صنف کا چہرہ اور بدن کسی قدر مانوس لگتا ہے۔ سرورق پر آپ کا ماہیہ زمین اور آسمان کے درمیانی خلاء میں پریم کی نئی کہانی کی سچی تعبیر ہے۔ اس صنف کی ’’کوملتا‘‘ ہی اس کی تروتازگی اور توانائی کا باعث ہے۔ (**پس نوشت**) آپ کا شکریہ مجھ پر واجب ہے کہ وزیر آغا کے تعلق سے آپ نے اپنی کتاب مجھے عنایت کی، اس کتاب کے ذریعہ مجھے کئی Refrences تک رسائی میں مدد مل رہی ہے۔ وزیر آغا کی تنقید کے حوالے سے میرا کام بہت پھیل گیا ہے۔ آپ کے حوصلے کی داد دینے کا یہ دوہرا موقعہ ہے کہ اتنی دور رہ کر بھی آپ رسالہ کی ترتیب وتہذیب میں فعال ہیں، اور اردو کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں۔ **فیاض احمد وجیہہ** (دہلی)

جدید ادب ۱۴ دیکھ کے خوشی ہوئی۔ آپ تو بیک وقت کتنے معرکے کر رہے ہیں، شکر گزار ہوں بابا، اپنی اور فہیم کاظمی کی تخلیقات شائع ہونے پر۔ اگر ممکن ہو تو تازہ شمارے کی ۲ کاپیاں پوسٹ کیجیے گا۔ **انجلا ہمیش** (کراچی)

جدید ادب کے تازہ شمارہ میں حسن بن صباح کے سلسلہ میں آپ کا اداریہ بہت اہم ہے۔ کیونکہ ایک تو یہ ہے کہ ریکارڈ درست ہوتے رہنا چاہئیے اور سب سے اہم بات یہ کہ نئی نسل اس طرح کی تحقیق سے کافی مستفید

ہوسکتی ہے۔ ارشد خالد کی مختصر سی نظم ’’انتظار‘‘ اور ضمیر طالب صاحب کی غزل ’’اسی لئے مجھے زنجیر کرنا مشکل ہے‘‘ اچھی لگیں۔ اور احمد ہمیش کی ’’لاکی کگار پر‘‘ بہت عمدہ ہے۔ بے شک جی ’’عدم تفہیم کی مار پڑنے والی ہے‘‘۔

حسن جعفر زیدی صاحب کا مضمون ’’ہماری تاریخ فہمی اور ہمارا سیاسی وفکری بحران‘‘ بہت شاندار ہے۔ ایک بات تو بالکل درست ہے کہ تاریخ کو کبھی بھی مذہب سے نہیں جوڑنا چاہیے ورنہ صحیح تحقیق نہیں ہوسکتی۔ اور اس مضمون کے مطالعہ کے بعد تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ کربلا* کے بعد مسلم دنیا میں جتنے معرکے ہوئے اُس میں کوئی بھی ظالم اور دوسرا مظلوم نہیں تھا بلکہ ہر طرف ظالم ہی تھے بس جس کو جب موقع ملا اُس نے ظلم کیا۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی خاص وقت میں مظلوم کہلائے جانے والے کو جب بعد کے حالات میں موقع ملا تو اُس نے معاشرے میں سدھار کیا بلکہ اُس نے بھی بگاڑ ہی کیا۔

* ویسے تو میری رائے میں تو واقعہ کربلا ظالم ومظلوم کا معرکہ نہیں تھا بلکہ یہ حق اور باطل کی لڑائی تھی۔ بے شک حسین نے یزید کی بیعت نہ کر کے حق کو باطل سے الگ رکھا اور اپنی قربانی دے کر اُس پر قائم رہے اور تاریخ کو ایک نیا انقلابی موڑ دیا۔ **انجلاء ہمیش** (کراچی)

۳۶۰ صفحات میں آپ نے اتنا سارا مواد پیش کر دیا ہے کہ سبھوں کے ساتھ انصاف کرنا مشکل ہے۔ لیکن جس طرح خدا کی الگ الگ مخلوق دنیا میں اپنی اپنی پسند کا رزق چن لیتی ہے اسی طرح ہر قاری بھی اپنی اپنی پسند کی تحریریں چن لیتا ہے۔ زیر نظر شمارے میں میری دلچسپی ’’جدید ادب‘‘ کے گوشہ نشینوں تک محدود رہی۔ ہمت رائے شرما اور حمایت علی شاعرؔ فلمی شاعر ہونے کے علاوہ اہم ادبی حیثیت کے بھی مالک ہیں۔ ہمت رائے شرما کے فکر وفن پر فراق گورکھپوری، ڈاکٹر خلیق انجم، مالک رام، ظ۔ انصاری، خواجہ احمد عباس، یوسف ناظم، حیدر قریشی، صبیحہ خورشید اور منزہ یاسمین کی تحریریں خوب ہیں۔ ہمت رائے شرما کی شاعری کا انتخاب بھی عمدہ ہے۔

حمایت علی شاعر پر گوشہ مختلف نوعیت کا ہے۔ اس میں حمایت علی شاعر کے تحریر کردہ پیش لفظ اور دیباچے شامل ہیں۔ اس گوشے کی سب سے اہم تحریر ’’میں اور میرا فن‘‘ ہے۔ اس میں دلچسپی کے ساتھ ساتھ کئی اہم معلومات بھی شامل ہیں۔ دوسرا اہم مضمون ’’میری فلمی شاعری‘‘ ہے۔ یہ دونوں مضامین شاعرؔ کی زندگی اور کارناموں کو درشاتے ہیں اور قارئین کے لئے دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ خصوصی مطالعہ کے تحت احمد ہمیش کی نظمیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ **اقبال حسن آزاد** (مونگیر)

جدید ادب پہ لکھنے کے لئے ذرا وقت درکار تھا۔ خوب اطمینان سے پڑھا اور اب لکھ رہی ہوں۔ سب سے پہلے تو مبارکباد قبول کیجئے کہ اس رسالے کو پڑھ کر اوراق کا معیار یاد آگیا ہے۔ آپ واقعی ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اور میں سخت مرعوب ہوئی ہوں، خدا کرے یہ سلسلہ چلتا رہے اور مخالفین اسے نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اداریہ میں آپ نے جس پریشانی کا ذکر کیا ہے اس کے لئے میرا مشورہ ہے کہ آپ ڈاک خرچ ضرور لیجئے

اور سچ کا ساتھ دیتے رہئے خواہ کچھ ہو۔ مضامین کا حصہ بہت مفید معلومات سے بھرا ہوا ہے۔ پروفیسر مسعود حسین کے بارہ میں معلوماتی مضمون لائقِ تحسین ہے۔ فکرِ اقبال کو مسلسل عام کرتے رہنے کی ضرورت ہے، کیونکہ سعودی عرب نے ایک ایسی مہم چلا رکھی ہے جس میں محض جسم اہم رہ گیا ہے اس سے آگے ہر چیز بدعت کہلانے لگی ہے اور آج کی نسل بری طرح اس جھانسے میں آئی ہوئی ہے۔ تصوف، مراقبہ، روحانی ارتقا، وغیرہم، سب بدعات ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مصنوعی، پھڈے باز پیروں نے ہر چیز کو بدنام کر دیا ہے۔ جبکہ انساں صرف جسم نہیں ہے، تصوف اور طریقت، اعلیٰ درجے کا ایمان ہے جو صرف شریعت پہ سو فیصد عمل کے بعد کارآمد ہوتی ہے۔ صرف شریعت پہ عمل ہر عام انسان کی استعداد کے اندر ہے اور فرض ہے مگر وہ لوگ یہ سمجھنے کے بجائے سرے سے طریقت کا استرداد کر رہے ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی کہ کرناٹک میں بھی اتنے نابغۂ روزگار لوگ موجود ہیں رفیق شاہین ''روح کا عالمی تصور،، کتاب پہ تبصرہ، بہت خاطر خواہ تبصرہ ہے صرف مجھے یہ حیرت ہوئی کہ سید رضی الدین نے مغربی اور مشرقی بہت سی کتابوں کا ذکر کیا ہے مگر عربی کی ایک بہت اہم کتاب کا ذکر نہیں کیا ہے، وہ ہے علامہ حافظ ابنِ قیم کی کتاب 'کتاب الروح، جس میں انھوں نے قرآن، احادیث، صحابہ کے نظریات واقوال اور روحانی تجربات کی روشنی میں رُوح کی حقیقت سے بحث کی ہے اس کا اردو میں ترجمہ بھی موجود ہے جسکو مولانا راغب رحمانی نے کیا ہے۔ ابنِ قیم صرف عالم ہی نہیں فلاسفر بھی تھے، میں نے اس کتاب کا ذکر اسلئے کر دیا کہ جسے اس موضوع سے دلچسپی ہو پڑھ سکتا ہے۔ نفیس اکیڈمی کراچی نے اردو ترجمہ شائع کیا ہے۔

اطہر معز کا مضمون بھی اچھا لگا۔ ماہیا اور حیدر قریشی کا چولی دامن کا ساتھ ہو گیا ہے میں نے کسی سے جدید ادب کا ذکر کیا تو وہ کنفیوز ہوئیں ''کون حیدر قریشی؟'' پھر اچھل پڑیں۔ ارے ماہیا والے حیدر قریشی۔ ایسے کہونا۔ تو جناب اب آپکو ''ماہیے والے حیدر قریشی'' کہا جانے لگا ہے، مبارک ہو۔ درست وزن کے ماہئے میرے نزدیک نئی معلومات سے ہے۔ مرتضٰی اطہر کا مضمون بھی اچھا ہے اور فہمیدہ کی شاعری کو سمجھنے میں معاون ہے۔ تبصرے سے لوگوں کے نظریات معلوم ہوتے ہیں اور تبادلۂ خیالات کا موقع فراہم ہوتا ہے۔

سلطان جمیل نسیم بہت معروف اور پرانے لکھنے والے ہیں، میں ان کو برسوں سے پڑھ رہی ہوں، انکے بعض افسانے کبھی نہ بھولنے والے تھے جن میں ایک تو سچ کے سوا کچھ نہیں، تھا۔ دوسرا کھویا ہوا آدمی تھا اور کئی افسانے جنکی کہانی یاد ہے نام ذہن میں نہیں ہے۔ اس میں دی گئی دونوں کہانیاں بہت عمدہ ہیں، اکرام بریلوی کی ان پہ لکھی ہوئی کتاب بھی پڑھنے کو ملی اور نیا افسانوی مجموعہ بھی۔ یہ میرے لئے بڑا اعزاز ہے، انکو کچھ ذاتی پریشانیوں کے باعث ابھی کچھ لکھا نہیں ہے۔ انشاءاللہ جلد وقت نکالوں گی، سلطان جمیل صاحب کو شاید یاد نہ ہو مگر ان سے شرفِ ملاقات حاصل ہوا تھا اردو مرکز میں، جب افتخار عارف یہاں تھے۔ ان سے بھی اور انتظار حسین سے بھی۔ یہ میری جہالت ہے کہ عبداللہ جاوید کے کلام کا مطالعہ کا موقعہ کم کم ہی ملا۔ انکا تعارف بعد میں پڑھا شاعری پہلے پڑھی بہت متاثر ہوئی بڑی پختگی ہے بڑی دلکشی ہے۔ کئی کئی دفعہ پڑھا۔ انکا کلام ایسا ہے کہ انسان کا دل ٹھہر جاتا ہے پھر سوچ ابھرتی ہے۔ افسانہ سب سے آخر میں پڑھا عبداللہ جاوید ان لوگوں میں نہیں جو ہر رسالے میں موجود ہونا ضروری سمجھتے ہیں

چاہے قاری کے لئے کوئی اہم تخلیق انکی زنبیل میں ہو یا نہ ہو، تیسرے نمبر پہ میں نے افسانہ پڑھا۔ وہ بھی فنی لحاظ سے کامیاب افسانہ ہے میں اسکا فنی تجزیہ بھی کر سکتی تھی مگر خط طوالت کا شکار ہو جائے گا۔ انکی بیگم کی باتیں بھی پسند آئیں اصل انسانی خوبیوں کی سند صرف بیوی دی سکتی ہے، ہمارے مسجد میں ایک امام ہیں مراکش سے انکا تعلق ہے عورتوں کے حقوق کے علمبردار، یہ انکا کہنا ہے کہ اگر کسی انسان کی بیوی بغیر کسی غرض، دھونس اور لالچ کے شوہر کی انسانی خصوصیات کی تعریف کرتی ہے تو وہ صحیح معنوں میں قابل قدر انسان ہے ورنہ لاکھ بڑھانکے، خودستائی کے علاوہ کچھ نہیں۔ سو عبداللہ جاوید صاحب مستند اچھے انسان ہیں۔ سند موجود ہے۔

جوگندر پال کا افسانہ بھوک پریت معاف کیجئے گا بے حد طویل ہی نہیں گرفت میں نہیں لگا، ایک لکیر کی صورت جس کے پیچھے ہم فقیر قاری چلے جا رہے ہیں بے منزل۔ جدت اچھی چیز ہے مگر تھوڑا قاری کا بھی تو خیال ہونا چاہئے میں نے اپنے کاندھوں پہ سوار ہو کر یہ افسانہ خود سے پڑھوایا۔ ڈیرہ بابا نانک اچھا افسانہ ہے۔ جاگیردار، کچھ اخباری سا افسانہ ہے۔ اس دفعہ رشید امجد نے بڑا بامعنی افسانہ لکھا، خوشی ہے کہ افسانہ اکہرا نہیں اور بامعنی ہے۔ سلیم آغا قزلباش کا افسانہ اس اشاریت اور علامت کا حامل ہے، 'قدریں کس بری طرح اوندھی ہو چکی ہیں نظمیں سب بہت اچھی لگیں مگر کچھ نظمیں کمزور لگیں ممکن ہے کمپیوٹر کی مہربانی ہو۔ ناصر صاحب سے متعلق تمام مضامین بڑے خلوص سے لکھے گئے ہیں اور موصوف کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں۔ شوکت صدیقی سے مجھ ناچیز کو بھی ایک بار ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ اپنے افسانوں کے تیسرے مجموعے کے سلسلے میں انھوں نے کسی پبلشر کا پتہ دیا تھا۔ فون پہ بات ہوئی تھی۔ پہلی بات کہ وہ فوراً مجھے پہچان گئے بلکہ میرے ایک دو افسانوں کا بھی ذکر کیا جو انھیں بطور، خاص پسند تھے اور اپنے دولت کدے پہ بلایا بھی۔ بڑی اچھی علمی گفتگو رہی۔ میرا چھوٹا بچہ ساتھ تھا وہ پریشان کرنے لگا تو واپس آنا پڑا۔ مگر انکی شفیق بشخصیت یادوں میں موجود ہے۔ افسوس کہ زندگی کی ذمہ داریوں نے پھر مہلت نہ دی نوکری ایسی تھی کہ چھٹیاں بہت کم ملتیں۔ یقین نہیں آتا پچیس برس گزر گئے، اس بچے کی اب شادی بھی ہوگئی، انکے بارہ میں مضامین پڑھ کر خوشی ہوئی۔ کتابوں پہ تبصرے جانے کس نے لکھے ہیں مگر سلیقے سے لکھے ہیں۔ **حمیدہ معین رضوی**۔ (لندن)

''جدید ادب'' کا شمارہ نمبر ۱۴ (جنوری تا جون ۲۰۱۰ء) دیکھا اور پڑھ کے بے حد محظوظ ہوا۔ آجکل کے زمانے میں بھی، جب کہ لوگ عام طور پر فلموں اور ٹی۔ وی کی جانب زیادہ راغب دکھائی دیتے ہیں، اس قسم کے ادبی جرائد اپنی افادیت برقرار رکھے ہیں اور قارئینِ اردو ادب اسکا بھرپور استفادہ کر رہے ہیں۔

ایک عام قاری کی حیثیت سے میں نے مذکورہ شمارے میں شامل افسانے پڑھے۔ محترم جوگندر پال صاحب کے افسانچے کافی پسند آئے۔ بہت تھوڑے الفاظ میں بہت کچھ کہنے کے فن میں انکا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ جناب عبداللہ جاوید صاحب کا افسانہ ''برزخی'' آجکل کے حالات کے تناظر میں زبردست اہمیت کا حامل ہے جبکہ ڈاکٹریا طبی پیشہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں سے بیشتر اپنے پیشہ ورانہ و اخلاقی ذمہ داریوں کے تقاضے پورا کرنے کے

بجائے اپنے ذاتی مفادات کی خاطر مختلف مصلحتوں کا شکار ہو کے انسانیت کے اصولوں کو نظرانداز کرتے ہیں۔

محترمہ شہناز خانم عابدی نے اپنے افسانے ''خواب کا رشتہ'' میں بہت ہی خوبصورت انداز سے اُن رشتوں کی نشاندہی کی ہے جنکی تشریح روایتی سماجی یا پھر خون کے رشتوں کے ساتھ جوڑنے کی تابع نہیں ہوا کرتی ہیں۔ افسانہ نویس نے قارئین تک یہ پیغام پہنچانے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ ہر ایک مقدس رشتے کی بنیاد بے لوث اور صدق دلانہ محبت پر ہی مبنی ہوتی ہے جسکے لئے وہ داد و تحسین کی حقدار ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر بلند اقبال صاحب نے بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے فکر انگیز افسانے ''آٹو بائیوگرافی'' میں ایک انسان کو ڈھلتی عمر میں اپنے ہی روبرو کھڑا کر کے اسے خود اپنی تلاش کی جستجو میں ڈال دیا کہ وہ کیا ہے.....کہاں سے آیا ہے.......اسکا مقصدِ حیات کیا ہے وغیرہ وغیرہ۔ جناب حیدر قریشی صاحب کا افسانہ ''نیک بندوں کی بستی'' بھی بے حد عمدہ لگا کیونکہ اس قسم کی تخلیقات کو اُن کاوشوں کی کڑی سمجھ لینا چاہئے جو مذہب میں قدامت پسندی، کٹھورپن اور غیر منطقی عقائد و دلائل کو مسترد کرنے کے ساتھ ساتھ مذہب کے دائرے میں رہ کر بھی مثبت اور ترقی پسند رجحانات کو فروغ دینے کا حامل ہو۔ وقت کا تقاضا ہے کہ اس قسم کے انقلابی افسانے تحریر کر کے انسانی سوچ میں ایسی تبدیلی لائی جائے جس میں انسانی وجود و بقاء کی ترقی کا راز مضمر ہو۔ اس کیلئے قریشی صاحب مبارکباد کے حقدار ہیں۔ باقی افسانے و دیگر نگارشات بھی اچھے ہیں۔

طالب کشمیری (جموں، کشمیر)

سید ضمیر جعفری (اسلام آباد): چھوٹے بھائی! آپ نے تو خانپور سے اتنا عمدہ ادبی جریدہ نکال کر خانپور کو بڑا شہر بنا دیا۔ آفرین! میرے سامنے جدید کا وہ شمارہ ہے جس میں میرا مضمون بھی شامل ہے، سوسوائے میرے مضمون کے باقی تمام رسالہ موتیوں کی مالا ہے۔ اللہ تمہارے حوصلوں کو جوان رکھے۔

ڈاکٹر وزیر آغا (سرگودھا): آپ کا محبت نامہ ملا، ساتھ ہی جدید ادب کا تازہ شمارہ بھی، جسے پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ خوشی اس لیے بھی ہوئی کہ جدید ادب نے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی شخصیت دریافت کر لی ہے۔ اکثر رسائل سالہا سال کی محنت کے بعد اس مقام پر پہنچتے ہیں۔

ممتاز مفتی (اسلام آباد): مضامین آپ ہمیشہ اچھے حاصل کرتے ہیں اور ''ناموں'' والے حیرت ہے کہ کیسے حاصل کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (لاہور): خط ملا ساتھ ہی جدید ادب کا شمارہ بھی۔ خانپور جیسے دور افتادہ مقام سے ایسے معیاری جریدے کی اشاعت نے خوشگوار حیرت سے دوچار کر دیا۔

علامہ منظور احمد رحمت (ایڈیٹر ویکلی مدینہ بہاولپور): آپ نے جدید ادب کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ ٹھوس بھی ہیں اور صحت مند بھی۔ آپ قلم کی آبرو کے محافظ ہیں۔ ایسے لوگ خوش نصیب بھی ہوتے ہیں اور مرجع خلائق بھی۔ راستے کی دشواری، حریفوں کی ملامت گری، وسائل کی کمیابی اور غمِ روزگار کی خلش، یہ سب پُرخلوص انسانوں کے نصیبے میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ منافق اور شوریدہ سران نعمتوں کے جلال و جمال کو کیا جانیں!

(اکتیس سال پہلے **جدید ادب** خانپور کے شمارہ نمبر ۴ سال ۱۹۷۹ء میں مطبوعہ چند خطوط بنام حیدر قریشی)